ماہنامہ

شہاب

شہاب

جلد ۲ خورداد ۱۳۵۳ف م اپریل ۱۹۴۴ء نمبر ۷

(مرتبہ)

محمد عبدالرزاق بسمل

عوام سے سالانہ چندہ (للعہ)
گورنمنٹ سے (عے)

ہندوستاں ہمارا

جناب محمد عبدالرحمٰن خاں صاحب
ضمیر سابق صدر جامعہ عثمانیہ

زیر سما ہے جنت ہندوستاں ہمارا
سب سے قدیم تر ہے نام و نشاں ہمارا

تہذیب یاں سے پھیلی چاروں طرف جہاں میں
ہے زیر بار احساں سارا جہاں ہمارا

شعر و سخن کے جوہر ہر وقت یاں سے نکلے
حاوی تھا ہر زباں پر علم اللساں ہمارا

یونان و مصر و ایراں ہم سے سبق ہیں سیکھے
نظم و نسق میں روما اک ترجماں ہمارا

جاپان و چین نے ہم سے حاصل کیا تمدن
علم و ہنر ہے ان کا عکس رواں ہمارا

ہیئت کی سب سے پہلی منزل یہیں ہوئی طے
تھا ہندسہ کا بانی پہلا مکاں ہمارا

طب اور حساب سیکھا دنیا نے سب یہیں سے
اب تک بھی سارا عالم ہے مدح خواں ہمارا

شیر و شکر تھے ملکر فاتح کے ساتھ مفتوح
گویا کہ ایک ہی تھا سب خانداں ہمارا

ہم نے بھی کی حکومت ہندوستاں کے باہر
برتاؤ ایک ہی تھا سرّ و عیاں ہمارا

انسانیت کا آغاز اس ملک سے ہوا ہے
مسکیں کا اشک شو تھا پیر و جواں ہمارا

توحید مطلق انساں سیکھا عرب سے آخر
واقف تھا پھر بھی اس سے ویدک زماں ہمارا

دشمن سے جو رکھا ہے مغرب رہین منت
مشرق کا رہنما تھا یہ خاکداں ہمارا

زندوں پہ مہر و شفقت مردوں کی قدر و عظمت
گوتم کا فلسفہ تھا جادو بیاں ہمارا

دنیا کی ناثباتی انساں کی بے بساطی
تھا اعتقاد ان پر جوں جزو جاں ہمارا

بیگانہ و یگانہ دونوں کو ایک مانا
دشمن کو بھی یہ جانا ہے میہماں ہمارا

ظلم و ستم کو ہم نے ہر وقت پاپ سمجھا
رحم اور کرم کا گھر تھا جنت نشاں ہمارا

عالم فریفتہ تھا حسن و ادا پہ ہندی
مہر و وفا ہی مسلک تھا جادو بیاں ہمارا

ہندوستاں کی بیٹی تھی آبرو کی دیبی
قسمت نے رو دیا ہے کر امتحاں ہمارا

جب سے وطن بنایا عربی ہوں یا کہ عجمی!
کہتے ہیں صدق دل سے "ہندوستاں ہمارا"

یارب یہی دعا ہے سب کی ضمیر کے ساتھ
رکھ قائم اور دائم دارالاماں ہمارا!

"پسندیدہ اُردو علم ادب"

ہر ایک شئی ادنیٰ حیثیت سے ترقی کرتی ہے اس کی ترقی کے اسباب خارج میں پہلے ہی سے موجود ہوتے ہیں، لیکن اس شئی کی فطری قابلیت مقدم ہے جو خارجی اسباب کو کام میں لاتی ہے۔ ایک درخت کا بیج کچھ عرصہ بعد مناسب خوراک و رموافق حالات کے تحت وہ عظمت حاصل کرتا ہے کہ اس کی جڑ زمین میں ثابت اور شاخیں فضا میں پھیلی ہوئی ہوتی ہیں وہ مناسب خوراک فضا اور زمین سے حاصل کرتا ہے۔ یہ سب کچھ قانون ارتقا کے تحت ہوتا ہے، جو کائنات کی ہر ایک شئی پر نافذ ہے ہماری زبان اور ہر ایک زبان کی بولیوں پر بھی یہی قانون جاری ہے۔ اس موضوع پر تفصیلی بحث ہمارا مدعا نہیں۔ دیکھنا صرف اتنا ہے کہ اُردو زبان پر ابتدا سے اب تک اس کا کیا اثر ہوا اور آئندہ کیا کچھ توقعات ہیں۔

انتخاب طبعی } ترقی کے اسباب میں سے ایک انتخاب طبعی ہے، اردو کی پیدائش برج بھاشا اور فارسی کے میل جول سے ہوئی سنسکرت اور فارسی میں قرابت قریبہ ہے دونوں کا انتخاب نہایت موزوں تھا۔

خوش قسمتی سے فارسی جو برج بھاشا سے پیوند ہوئی اردو کی طرح عربی سے اپنا رشتہ پہلے ہی گانٹھ چکی تھی۔ اس لئے اگر اُردو کے تعلقات کو دیکھا جائے تو یہ ایشیا کی تین بڑی قوموں کی زبان کی آمیزش سے بنی۔ تینوں علمی زبانیں ہیں۔ اور سنسکرت اور عربی کو وہی امتیاز حاصل ہے جو یورپ میں یونانی اور لاطینی کو،

حکومت اور مذہب کا اثر } زبان کی ترقی کے اسباب میں سے حکومت اور مذہب بھی ہے، ایران میں یوں تو بہت بولیاں بولی جاتی تھیں، لیکن ان میں سے سات کو نمایاں امتیاز حاصل تھا، اور ان میں "ژند" آخر کار سب زبانوں پر چھا گئی۔ کیونکہ پارسیوں کی مقدس کتب "اوستا" وغیرہ اسی زبان میں تھیں جب ایرانی حکومت نے زرتشتی شریعت قبول کرلیا تو راج دھرم کا اثر عوام الناس پر بھی ہوا، اور آخر یہ علمی زبان بن گئی اسی طرح ہندوستان کے طول و عرض میں بہت بولیاں تھیں اور اب بعض مقامات پر بولی جاتی ہیں لیکن سنسکرت سب پر غالب آئی کیونکہ وید شاستر اسی زبان میں ہیں، اور حکومت وقت کی بھی یہی زبان تھی۔

جناب خواجہ محمد عباد اللہ صاحب
اختر بی۔ اے (امرت سری)

دول یورپ دنیا پر چھا گئے اور آخر قرعۂ
حکومت ہند انگریزوں کے نام پڑا تو انگریزی
الفاظ کا داخلہ بھی اردو میں شروع ہو گیا انگریزی
زبان کی کیفیت بھی اردو کی طرح ہے، اس میں الفاظ
یونانی اور لاطینی کثرت سے ہیں، سکول کالج کے
طلبا جب فارغ التحصیل ہو کر آتے ہیں تو ان کی
تقریر و تحریر میں انگریزی الفاظ اور محاورے
کثرت سے پائے جاتے ہیں، اس لئے یہ کہنا کچھ
بے جا نہ ہو گا کہ "اردو" کو بین الاقوامی زبان کی
حیثیت حاصل ہے۔ غور کرنا چاہئے کہ اُردو نے
چند صدیوں میں کیا کچھ اور کس طرح ترقی کی۔

قومی زبان} نفسیات کا یہ اہم مسئلہ ہے کہ کوئی خیال
دل میں بغیر حرف وصوت پیدا نہیں ہوتا، جو کچھ
انسان کے دل میں ہے وہی زبان پر آتا ہے جسے
لسان مذہب میں وحی، الہام، القاء کہتے ہیں۔
وہ واردات قلبی میں اگر تحت شعور ہوں تو یہ
محض فطری تحریک ہوتی ہے جیسے عام حیوانات
میں، کہ وہ جو کچھ کرتے ہیں فطری تحریکات کے
تحت کرتے ہیں، جیسے شہد کی مکھی چھتے محفوظ مقامات
پر بناتی ہے جسے آج تک انسان باہمہ علم و ہنر
بنانے سے قاصر ہے۔ پھولوں کی طرف رہنمائی
اور ان سے شہد نکالنا فطری قابلیت اور
فطری تحریک کے تحت ہے۔ انسان میں یہ فطری
تحریکات قلب میں خیالات کی صورت اختیار کرتی ہیں
اور کوئی خیال بے حرف وصوت نہیں ہوتا، اور
حرف وصوت قومی زبان ہی میں ہوتے ہیں۔ انسان
بولنے سے پہلے ہی خاموش قومی زبان دل میں دل
ہی استعمال کرتا ہے، کچھ سوچتا ہے تو اسی زبان میں،
یہی وجہ ہے کہ تمام انبیا اور رسل اور اوتار اور رشی
کو الہام قومی زبان ہی میں ہوتا رہا۔

کوئی جماعت قوم نہیں ہو سکتی جب تک اس کی
ایک واحد زبان نہ ہو، جس ملک میں بابل کی کیفیت ہو
اور ہر ایک شخص بھانت بھانت کی بولیاں بولتا
ہو وہ قومیت کے فائدہ سے محروم ہے، قومی زبان کا
مفہوم قومی دل ہے، جو شخص غیر قوم کی زبان میں خیال
کرتا ہے یا کسی امر کو غیر زبان میں سوچتا ہے اس کے
پہلو میں قومی دل نہیں ہوتا، اس کی زندگی غیر فطری ہے
بد قسمت ہندوستان کسی رنگ میں قومیت کا فائدہ نہیں
اٹھا سکتا۔ جب آریا ہندوستان میں داخل ہوئے
تو یہاں چند قومیں پہلے سے آباد تھیں۔ ٹھیک اسی
طرح جس طرح انگریزوں کی آمد پر ہندوستان کی کیفیت
تھی، آریا رفتہ رفتہ تمام ہندوستان پر چھا گئے اور
ہندوستان کو اپنا وطن قرار دیا، جب مسلمانوں کی
فتوحات کا سلسلہ شروع ہوا تو اسلام ایران کے
راستہ سے داخل ہوا یعنی بلحاظ زبان اور تہذیب و
تمدن ایرانی تھا، یہاں قومیت اور امتیاز خصوصی

یعنی زبان کا تصادم ہندوستانی زبانوں سے ہوا۔
اگرچہ اکبر جیسے روشن دماغ شہنشاہ نے انتہائی کوشش
کی دو بڑی قومیں شیر و شکر ہوجائیں یہ تو نہ ہوا
لیکن حکومت کے زیر اثر دونوں قومیں ایک دوسرے
کے نزدیک اور نزدیک تر ہوتی گئیں، ہندو اپنی
قومیت کو جو نسلی امتیاز پر قایم ہے نہ بھولے اور مسلمان
اپنے مذہبی خصوصیات کو چھوڑ نہیں سکتے تھے کیونکہ
ان کی قومیت کا اوڑھنا بچھونا یہی مذہب ہے۔ مسلمانوں
کی اکثریت ہندوستان میں غیر ہندو نہیں، لیکن چونکہ
اسلام ہندوستان کی پیدائش نہیں اسلئے ہندو قومیت
ہندوستان اس کی موجودگی برداشت نہیں کرسکتی
خیر وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے ہم اپنی وضع کیوں بدلیں۔
اس قصہ اور قضیہ کو چھوڑ کر ہم اردو زبان کی حالت
پر بحث کرتے ہیں، یہ تو ہندوستان کی پیداوار ہے
پھر کیا وجہ ہے کہ یہ ہندوستان کی واحد قومی زبان
نہیں، عرصہ ہوا مجھے ایک ہندو مدراسی سے مبادلہ
خیالات کا موقع ملا، میں مدراسی سے ناواقف اور
وہ اردو سے بے بہرہ۔ انگریزی ہی مبادلہ خیالات
کا ذریعہ رہی، میں نے دریافت کیا کہ آپ اردو سے
واقف نہیں اس نے بے تکلف کہا کہ یہ تو مسلمانی زبان
ہے۔ میں نے اسسے کہا کہ دنیا میں مجھے تو معلوم نہیں
کہ کوئی مسلمانی زبان بھی ہے عربی کی نسبت آپ ایسا
خیال فرما سکتے ہیں کیونکہ مسلمانوں کی مقدس کتاب قرآن
اسی زبان میں ہے۔ لیکن یہ بھی صحیح نہیں، کیونکہ قرآن
سے پیشتر بھی عرب کے طول و عرض میں عربی بولی جاتی
تھی، یہ بھی صحیح ہے کہ اردو مسلمانوں کے دور حکومت
میں پیدا ہوئی اور پھلی پھولی، لیکن ہے یہ ہندوستانی
زبان، کیونکہ ہندوستان کے باہر کسی ملک میں بولی
نہیں جاتی، اس جھگڑے کو بھی جانے دیجئے، ایک اور
حقیقت پر غور کیجئے وہ حضرات جو اردو میں تقریر و
تحریر کرسکتے ہیں اور کرتے ہیں ذرا ان کے دل و دماغ
کا جائزہ لیجئے "انڈین نیشنل کانگریس" اور "مسلم لیگ"
کے امتیازی ناموں سے ہندوستانی دلوں کو ٹٹولیے،
اول الذکر کا دعویٰ ہے کہ وہ واحد ہندوستانی قومیت کی
نمائندہ ہے اور موخر الذکر خالص اسلامی انجمن ہے
لیکن ان میں سے ایک بھی کسی قومی زبان میں اپنا نام
تجویز نہ کرسکی۔ ان کے اجلاس میں دھواں دھار
تقریریں انگریزی میں ہوتی ہیں، اس کی وجہ ایک یہ
بھی ہے کہ ہندوستان کے طول و عرض سے جو نمائندے
شامل ہوتے ہیں وہ ایک دوسرے کی زبان سمجھ نہیں سکتے
اس لئے انگریزی ہی مبادلہ خیالات کا ذریعہ ہے،
ان کے علاوہ ایک اور جماعت بھی ہے جو "ہندو مہا
سبھا" کے نام سے موسوم ہے، یہ خالص ہندو قومی
مجلس ہے، اس کے پہلو میں ہندو قومی دل ہے اسی لئے
زبان پر برج بھاشا کے الفاظ آگئے، اول الذکر دونوں
سیاسی جماعتوں کے سینے میں قومی دل نہیں، مجھے

معلوم نہیں کہ مہا سبھا کے اجلاس سالانہ میں مبادلۂ
خیالات کس زبان میں ہوتا ہے۔ غالباً یہ حضرات بھی
انگریزی ہی میں زیادہ تر تقریریں کرتے ہیں۔
"سالے کہ نکوست از بہارش پیدا"
سیاسیات سے قطع نظر عام حالات اور کاروباری
زندگی میں بھی یہی مشاہدہ ہوتا ہے کہ ہندوستانی دل
انگریزی کی نذر ہو چکا ہے، میرے اکثر دوست خط لکھتے
ہیں تو انگریزی میں، میں نے کئی ایک کو ملامت بھی
کی، اور جب کبھی وہ مجھے میری خاطر اردو میں خط لکھتے
ہیں تو نہایت بدخط املا غلط انشا غلط۔ خیر یہ تو برداشت
ہو سکتا ہے لیکن زبان تو اردو استعمال کرتے ہیں مگر
انگریزی ہوتی ہے، اسے بھی جانے دیجئے ان حضرات کے
جگر گردہ کو دیکھئے جو ادیب ہیں شاعر ہیں، جن کے
ہاتھوں میں بدقسمت اردو کی باگ ڈور ہے، زبان
شاعر بناتے ہیں، ولی دکنی سے لیکر امیر اور داغ
تک کتنے الفاظ متروک ہوئے اور کتنے صاف اور شستہ
ہوئے، شعرا کے کلام سے واضح ہو سکتا ہے، پروفیسر
براؤن نے فارسی علم ادب کی تاریخ (ہسٹری آف پرشیا
لٹریچر) لکھی تو ان شعرا کا تذکرہ ترک کر دیا جو ایرانی
نہ تھے اس لئے نہیں کہ وہ ایرانی شعرا سے تخیل اور
زباندانی میں کمتر پایہ کے تھے بلکہ اس لئے کہ ان کا
دل ایرانی نہ تھا۔ ان کے خیالات اور افکار غیر ایرانی تھے
ہمارے شعرا کے افکار ہندوستان میں رہے اور ہندی
ماحول میں پرورش پاتے، غیر ہندی ہیں، اردو میں
جیسا کہ ہم لکھ چکے ہیں جذب کی بے انتہا طاقت ہے۔
مناسب تو یہ ہے کہ جو اچھی چیز جہاں سے بھی ملے لے
لینی چاہیئے، نہ یہ کہ جو اپنی بہترین شئی ہے اسے ترک
کر کے مقابلتہ کمتر درجہ کی چیز پسند کی جائے، یہ ایک
حقیقت ہے کہ علم موسیقی میں کوئی اور ملک ہندوستان کا
مقابلہ، اور علم عروض میں کوئی عرب کی ہمسری کا دعویٰ
نہیں کر سکتا۔ فنون لطیفہ کی دونوں امتیازی خوبیوں
کو ہم چھوڑ رہے ہیں، اور ادنیٰ چیز کو شوق سے لے
رہے ہیں، اور یہ شعور نہیں کہ حکومت وقت کا خاموش
سیاسی اثر ہمارے دل و دماغ پر کارفرما ہے، بحر اور
قافیہ اور ردیف کی قید سے آزادی تو مل چکی، جو کچھ
لکھتے ہیں وہ شعر کی تعریف میں نہیں آتا، منظوم نثر
زیادہ سے زیادہ کہی جا سکتی ہے۔ حالانکہ حقیقی شعر
وہ ہے جو نثر میں ادا نہ ہو سکے، متقدمین نے کسی واقعہ
کی نگارش یا مظاہر فطرت کے تاثرات کے اظہار کے
لئے "مثنوی" کی طرح ڈالی تھی، اس کی جگہ اب غیر مقفی
نظم (بلینک ورس) نے لیلی، عموماً سننے میں آتا ہے کہ
قید قافیہ و ردیف نہ صرف دل و دماغ پر ناواجب بار ہے
بلکہ مفہوم جو بطن شاعر میں ہے مناسب الفاظ میں
واضح نہیں ہو سکتا۔ بات اصل میں یہ ہے کہ اس قسم کی
باتیں وہی لوگ بناتے ہیں جن کو اتنا بھی شعور نہیں کہ
وہ اپنی قومی زبان پر قادر نہیں ہیں۔ مجھے ایک دفعہ

دہلی کے ریڈیو اسٹیشن پر مشاعرہ میں شرکت کا شرف
حاصل ہوا - نوجوان شعرا کا مجمع تھا غیر طرحی نظمیں
پڑھی گئیں - جن میں موسیقی کی چاشنی بھی تھی ہر شاعر
میں غیر طرحی نظمیں گا کر پڑھنا آج کل کا "فیشن" ہو گیا
ہے - موسیقی کا جامہ غالباً اس لئے پہنایا جاتا ہے کہ
سامع کی توجہ کا زیادہ سے زیادہ جاذب ہو کر عیوب
شعر پر پردہ ڈالا جائے - موسیقی ایک فن ہے اور
اس میں کچھ شک نہیں کہ عروض اور اس میں چولی
دامن کا ساتھ ہے - اس مشاعرہ میں صرف ایک شاعر کے
سوا کوئی بھی اس فن لطیف سے واقف نہ تھا ایک تو
آواز یا "سروں" میں پختگی نہ تھی، دوسرے یہ بھی شعور
نہ تھا کہ شعر کے وزن کے مناسب کس "لے" کو استعمال
کرنا چاہیئے، چونکہ دونوں میں کچھ تناسب تھا اس لئے
توازن بحر اور "لے" قایم نہ رکھ سکے، تلفظ کی صحت شعر
میں معلوم ہوتی ہے اور ان شعرا کے طرز ادا میں بھی
غلط تھا - "قیاس" کی جگہ "قایاس" اور "خیال" کی جگہ
"خایال" - غرض نہ میں نظم سے اور نہ موسیقی سے لطف
اندوز ہو سکا، اور "پسندیدہ اردو علم ادب" کی تربت
پر فاتحہ پڑھا اور چلا آیا -

بہت بڑی خرابی "پسندیدہ اردو علم ادب"
میں وہ پیدا ہو گئی ہے جس کی طرف "شہاب" کے
صفحات پر حضرت "عطارد" بار بار توجہ دلا رہے
ہیں - لیکن "گفتہ گفتہ او شدہ بسیار گو" بات یہی ہے
کہ نوجوان شعرا کوشش نہیں کرتے کہ اپنی قومی زبان
پر قدرت حاصل کریں - کوئی نظام قاعدہ اور قانون
کی پابندی کے بغیر قایم نہیں رہ سکتا - ایک دفعہ قیصر
روم نے ایک تقریر کے دوران میں ایک لفظ غلط
استعمال کیا "سسرو" نے وہیں ٹوکا، ایک خوشامدی
امیر نے کہا کہ کلام الملوک ملوک الکلام جواب دیا کہ
قیصر کی حکومت ہماری زبان پر نہیں ہو سکتی حضرت
عطارد کی تنقید ناگوار خاطر شعرا تو ضرور ہو گی مگر ؎

" دارو ئے تلخ است دفع مرض
فرخندہ بخت آنکہ بسمع رضا شنید "

ایک دفعہ ملکہ وکٹوریہ آنجہانی نے دار الامرا میں تقریر
پڑھی - اس میں ایک لفظ "ایمی لیوریشن" بمعنی ترقی
استعمال کیا - دو امرا میں وہیں اس لفظ پر دبی زبان
میں بحث شروع ہو گئی - ایک نے کہا کہ اس لفظ کا
استعمال اس موقع ومحل پر غلط ہے - سوچنا چاہیئے کہ
تنقید سے کوئی بچ نہیں سکتا اور تنقید کی غرض یہ ہے کہ
زبان حشو و زوائد سے پاک ہو کر ایسی شستہ ہو کہ
اس کا حسن جاذب سمع ہو اور سقم و قبیحہ رفع ہو،
ایسا نہ ہو کہ غلطیاں رواج پا جائیں - آج متقدمین
کے کلام کو سنداً پیش کیا جاتا ہے، اس کی وجہ یہی
ہے کہ وہ زبان سے خوب واقف تھے اور زبان کے
قواعد وضوابط کا احترام کرتے تھے -

" ویں ہمہ گفتیم باقی فکر کن "

تاریخی لطائف
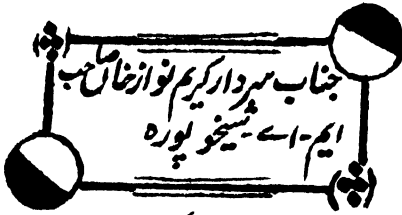
مرزا داغ سیاہ فام تھے- ایک دفعہ حیدر آباد میں کسی تھیٹر میں تشریف لے گئے کسی شوخ ایکٹر نے داغ کو یہ غزل سنائی جس کا مقطع

ع "جسے داغ کہتے ہیں اے بتو اسی روسیاہ کا نام ہے" اور مرزا داغ کی طرف اشارہ کیا- مرزا صاحب بہت شرمندہ ہوئے اور دوستوں نے قہقہوں پر دھر لیا-

۲- حضرت سوزاں سہارنپوری محلہ "میر کے کوٹ" سہارنپور کے رہنے والے تھے- ایک روز فکر سخن میں مستغرق تھے کہ کسی نے دروازہ پر دستک دی، پوچھا کون ہے- جواب ملا "محمد یوسف" غصہ میں فی البدیہہ فرمایا۔

میر کا کوٹ ہے یہ مصر کا بازار نہیں لاکھ یوسف ہوں تو یاں کوئی خریدار نہیں

۳- ایک دفعہ سید زاہد حسین زاہد سہارنپوری حضرت اکبر الہ آبادی سے جب وہ سہارنپور میں بطور جج متعین تھے ملنے گئے- بعد ملاقات چپراسی نے انعام طلب کیا تو یہ کہکر کہ ہم فریق مقدمہ نہیں جان چھڑائی- دوبارا ملنے گئے تو چپراسی نے پھر انعام چاہا- زاہد صاحب نے انعام نہ دیا تو چپراسی نے بہت دیر تک اطلاع نہ کی- جب اطلاع کی اور زاہد صاحب ملنے گئے تو کہا۔

آتے جاتے ٹانگ لیتا ہے تمہارا اردلی اپنا کتا باندھیے ہم باز آئے بھیک سے

اکبر نے اظہار ندامت کیا اور چپراسی کو جرمانہ کیا-

۴- حکیم بدرالدین سے کوئی شاعر ناراض ہوگئے اور حکیم صاحب کی ہجو یوں لکھی۔

ملک الموت رفت پیش خدا گفت سبحانا ربی الاعلیٰ
بدر الدین حکیم یونانی من کشم یک و او کشد صدرا
یا مرا عزل کن ازیں خدمت یا ورا کار دیگرے فرما

۵- شیخ سعدی رحمۃ اللہ کے پاس ایک بدلہ سنج خادمہ تھی- ایک روز کسی مہمان نے جس کی آنکھ میں چھٹہ تھا دروازہ پر دستک دی- خادمہ نے شیخ صاحب سے آکر کہا کہ شیخ عبداللہ صاحب ملنے آئے ہیں

سعدی نے کہا بکفت تام عبد اللہ ہوتا ہے عبد اللہ نہیں۔ خادمہ نے کہا جناب اُس کی عین پر نقطہ ہے۔

۶۔ شہزادہ شہریار نور جہاں بیگم کی بیٹی لاڈلی بیگم جو شیر افگن سے تھی کا شوہر تھا جہانگیر کی وفات کے وقت شاہجہاں دار السلطنت سے دور تھا۔ نور جہاں بیگم نے موقع غنیمت جان کر شہریار کو تخت نشین کرا دیا۔ اب شاہجہاں متفکر تھا کہ آیا دکن سے جا کر آگرہ پہنچ کر شہریار کو پہلے تخت سے اتارے یا پہلے دیگر دور افتادہ صوبوں کو فتح کر کے اور جمعیت حاصل کر کے پھر دار السلطنت کا رخ کرے۔ اسی شش و پنج میں اُس نے لسان الغیب دیوان حافظ سے فال دیکھی تو یہ اشعار نکلے۔

چرا نہ در پئے عزم دیار خود باشم　　چرا نہ خاک کفِ پائے یارِ خود باشم

غم غریبی و غربت چو بر نمی تابم　　بشہر خود روم و شہریار خود باشم

۷۔ خان بہادر نواب غلام حسین قمر ایم۔ ایل۔ سی۔ تعلقدار گنیش پور ضلع بستی نے گلاب نامی طوائف گورکھپور سے عقد کر لیا۔ گلاب کے سارنگی برداران نے نواب صاحب پر عدالت گورکھپور میں ۴۹۱ تعزیرات ہند اغوا کا مقدمہ دائر کرایا۔ اس مقدمہ نے بہت طول کھینچا اور حکام گورکھپور نواب صاحب سے ناراض ہو گئے وصل بلگرامی نے دیوان حافظ سے فال دیکھی تو یہ شعر نکلا۔

در کار گلاب و گل حکم ازلی ایں بود　　کاں شاہد بازاری ویں پردہ نشیں باشد

چنانچہ مقدمہ خارج ہوا۔ نواب صاحب کا عقد ثابت ہو گیا اور گلاب جان پردہ نشین ہو گئی۔

۸۔ نادر شاہ نے عراق فتح کرنے کے بعد بغداد پر اور تبریز پر حملہ کا ارادہ کیا اور دیوان خواجہ حافظ سے فال دیکھی۔ تو یہ شعر نکلا۔

عراق فارس گرفتی بہ شعر خود حافظ　　بیا کہ نوبت بغداد و وقت تبریز است

۹۔ زیب النساء بیگم بنت عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ کا چندن ہار گم ہو گیا۔ شام کا وقت تھا۔ فال دیکھنے کے لئے شمع طلب ہوئی ایک خادمہ شمع لے کر حاضر ہوئی۔ فال میں ایک شعر نکلا جس کا مصرع اب ضرب المثل ہو چکا ہے۔

"چہ دلاور است دزدے کہ بکف چراغ دارد"

جو خادمہ شمع لئے کھڑی تھی اُس سے ہار برآمد ہوا۔

۱۰۔ راقم الحروف نے ملازمت کا امتحان دیا تھا اور صبح کو نتیجہ برآمد ہونا تھا۔ میں وہ شام ملتان سے لاہور تک گاڑی میں سفر کر رہا تھا۔ شام کو سات بجے کے قریب ملتان سے روانہ ہو کر صبح سات بجے کے قریب گاڑی لاہور

پہنچتی ہے۔ رات بھر گاڑی میں متفکر تھا کہ دیکھیں کیا نتیجہ برآمد ہوتا ہے۔ علامہ اقبال مرشدنا کی کتاب بانگ درا میرے پاس تھی۔ فال دیکھی تو یہ مصرع نکلا۔

شام غم لیکن خبر دیتی ہے صبح عید کی

صبح کو لاہور کے اسٹیشن پر ہی اطلاع ملی کہ مجھے پنجاب میں دوسرے نمبر پر منتخب کیا گیا۔

۱۱۔ ۲ ستمبر ۱۹۳۹ء کا دن دنیا کی تاریخ میں کبھی نہ بھلایا جائے گا۔ اس روز برطانیہ نے اعلان جنگ کیا اور صحیح معنوں میں جنگ حاضرہ کی رسمی افتتاح ہوئی میں اس روز راجہ اللہ داد خان صاحب ریونیو اسسٹنٹ گورداسپور کے ہمراہ کنجر مقام پر ڈاک بنگلہ میں بیٹھا تھا کہ ہمیں ٹیلیفون کے ذریعہ اطلاع ملی۔ میرے پاس مرشدنا علامہ اقبال قدس سرہ العزیز کی کتاب بال جبریل تھی۔ فال دیکھی تو یہ اشعار نکلے۔

افق میں مغربی شفق پر یہ جو ئے خوں ہے یہ جوئے خوں ہے ۔ طلوع فردا کا منتظر رہ کہ دوش و امروز ہے فسانہ
وہ فکر گستاخ جس نے عریاں کیا ہے فطرت کی طاقتوں کو ۔ اسی کی بیتاب بجلیوں سے خطر میں ہے اس کا آشیانہ
ہوائیں ان کی فضائیں ان کی سمندر ان کے جہاز ان کے ۔ گرہ بھنور کی کھلے تو کیونکر بھنور ہے تقدیر کا بہانہ
جہان نو ہو رہا ہے پیدا وہ عالم پیر مر رہا ہے ۔ جسے فرنگی مقامروں نے بنا دیا تھا قمار خانہ

۱۲۔ مرشدنا علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے جس روز وفات پائی اس روز رات کو بہت زیادہ تکلیف تھی۔ خدام اور نیازمندان نے چاہا کہ علامہ صاحب کو مارفین کا انجکشن دیدیا جائے تاکہ تکلیف کا احساس نہ ہو۔ چنانچہ میرے عزیز دوست میاں محمد شفیع جو علامہ مرحوم کے پرائیویٹ سکرٹری کے فرائض انجام دیتے تھے اور آج کل پنجاب کے روزنامہ انگریزی اخبار سول اینڈ ملٹری گزٹ کے ادارہ میں ہیں نے عرض کی کہ حضور اگر اجازت بخشیں تو مارفین کا انجکشن دیدیا جائے۔ علامہ صاحب نے سر ہلاکر انکار فرمادیا۔ جب تکلیف بڑھنے لگی تو شفیع صاحب نے پھر مارفین کے انجکشن کی اجازت مانگی۔ علامہ مرحوم نے انکار فرمادیا جب تکلیف بہت زیادہ بڑھ گئی تو تیسری بار اجازت چاہی۔ علامہ مرحوم غصہ سے بیتاب ہوکر اٹھ بیٹھے اور فرمایا کہ میں بزدل نہیں کہ موت سے گھبراؤں۔ میں موت کو آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنا چاہتا ہوں اور بخوشی اپنی جان جان آفریں کے سپرد کرنا چاہتا ہوں۔ مارفین کے انجکشن سے میں بے حس اور بیہوش ہوجاؤں گا اور اس صورت میں دم نکل جائے گا۔ یہ بزدلی کی موت ہے۔ مجھے موت کی آنکھوں میں

آنکھیں ڈالنے دو میں نفس کرجان دینا چاہتا ہوں۔ بیہوش ہوکر نہیں۔ سبحان اللہ۔

نشان مرد مومن با تو گویم　　چو مرگ آید تبسم بر لب اوست

۱۴۔ کہتے ہیں کہ ایک روز میاں سر فضل حسین ایک مجمع میں تقریر فرما رہے تھے اور مولانا محمد علی سامعین سے تھے۔ میاں صاحب نے دوران تقریر میں فرمایا کہ جو شخص یہ ثابت کردے کہ مولانا محمد علی کسی دیگر لیڈر کی نسبت ملک کی کم خدمت کی ہے تو میں اپنے پاؤں اُس کے سر پر رکھنے کو تیار ہوں۔ یہ فقرہ محض بوکھلاہٹ کے باعث اُن کے منہ سے نکل گیا اور دلچسپ بدحواسی کا نمونہ بن گیا۔ مولانا محمد علی نے باآواز بلند طنزاً کہا کہ میاں صاحب آپ کا بجا نا فرماتے ہیں۔ میاں صاحب کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ اور شرمندہ ہوئے۔

غزل

جناب بہزاد لکھنوی

تمنا ہے دل میں لبوں پر دعا ہے　　کہیں پر ہے کشتی کہیں ناخدا ہے

محبت ہی اول محبت ہی آخر　　یہی ابتدا ہے یہی انتہا ہے

فسانے میں نام ان کا آنے نہ پائے　　زمانہ بڑے غور سے سُن رہا ہے

یہ آنسو نہیں ہیں یہ الفاظ دل ہیں　　بیان غم عاشقی بے صدا ہے

جو ساقی نہیں ہے تو کچھ بھی نہیں ہے　　وگرنہ وہی میں وہی میکدا ہے

میری جستجو حاصل جستجو ہے　　نہ ان کا پتہ ہے نہ میرا پتا ہے

رموز محبت نہ سمجھا زمانہ　　جہاں میں جھکا ہوں وہیں نقش پا ہے

محبت میں گم ہیں محبت کے مارے　　محبت کو اب تک ترا آسرا ہے

میں بہزاد قائل نہیں ہوں فغاں کا
میرا رنگ سارے جہاں سے جدا ہے

سرشار بھیدی

جناب مرزا سرفراز علی صاحب بی۔ اے۔ ایچ۔ ڈپ۔ ایڈ (ڈبلن)

عزیز اقارب انھیں لڑکپن ہی سے سرشار جانی پکارتے ہیں اور احباب "بھیدی صاحب"۔ آپ نے بھی سرشار بھائی کی وضع کا ایک آدمی دیکھا ہوگا جنھیں اپنے نقصان سے زیادہ دوستوں کے فائدہ کا رنج ہوتا ہے ہندوستان کے ہر خاندان میں ایک آدھ سرشار جانی کا ہونا ضروری ہے، میانہ قد، بھرا بھرا بدن، اُبھرے ہوئے رخسار، گالوں میں دو پکی پکی گلوریاں دبی ہوئی۔ ناک ہونٹوں سے آگے جیسے جرمن وضع کا برآمدہ۔ لوگ مُنھ سے بولتے ہیں۔ بعض ناک میں بھی بول لیتے ہیں لیکن ناک سے بولنا بھائی صاحب کی خاص ایجاد ہے سن اِن کا چالیس بیالیس کے لگ بھگ ہوگا، مگر اسے درازیٔ عمر کا چرچا سمجھ کر بگڑ بیٹھتے ہیں میرے خیال میں تو سرشار بھائی ابھی نابالغ ہی ہیں۔

سرشار بھائی کو قوم اور ملک کی بھلائی کا بڑا خیال رہتا ہے۔ کئی مرتبہ سمندر پار پہنچ کر وطن کے لئے پروانہ آزادی لانے کا ارادہ کیا۔ سوٹ سلوائے، نکٹائی باندھنے کی مشق کرتے رہے، تاریخ ہند اور انگلستان کا گہرا مطالعہ کیا، جدید دستور ہند پر سر سے پاؤں تک روشنائی دوڑائی۔ مگر کوئی بندۂ خدا اِن کا لوہا ماننے کو تیار نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ زمانے کی ناقدری کا دردناک الفاظ میں شکوہ کرتے ہیں۔ اِن کے مشوروں کے بغیر ملک کا تعلیمی نصاب ہمیشہ غیر مکمل رہا۔ اِس ناروا سلوک پر تو انھیں بہت طیش آتا ہے۔ بڑے آدمیوں کو ان کے غیاب میں بے نقط سناتے مگر کبھی کبھار سامنا ہو جائے تو شعائرِ اسلامی کے پیشِ نظر جھک کر کورنش، آداب اور تسلیمات بجا لاتے ہیں۔

نشریات سے انھیں خاص لگاؤ ہے۔ نشر کرنے کا طریقہ بھی انوکھا پایا ہے۔ اکثر گھریلو واقعات کو نہایت دلکش انداز میں ایجاد بندہ کے ساتھ پیش فرماتے ہیں۔ اِس بہانے کرۂ ارض کی تمام تر سیاسی تحریکوں، معاشی ترقیات اور صنعتی انقلاب پر سیر حاصل تبصرہ ہو جاتا ہے۔ دوسروں کی خانگی زندگی سے متعلق باتیں کرید کر نکالنے میں مشتاق ہیں۔ مگر سمجھدار آدمی بہت جلد انھیں بھانپ جاتا ہے۔

یاروں کی بعض حرکات واقعاً ان کے خلاف

طبع ہوتی ہیں۔ مثلاً اُن کے نزدیک یہ نہایت ناجائز ہے کہ اِن کے دوست یا عزیز ہونے کے باوجود لوگ موٹرنشیں ہوں، گھر میں ریڈیو سٹ رکھیں۔ گھر آباد کرلیں، قیمتی سگریٹ اور سگار استعمال کریں۔ یہ فضول خرچی اُن کے حساس دل میں درد پیدا کردیتی ہے اور وہ ہندوستانی قوم کی آئندہ ترقی سے مایوس ہو جاتے ہیں۔ ہر ترقی کرنے والے عزیز کا بہت دور تک تعاقب کرتے ہیں اور جب وہ پہنچ سے باہر ہو جاتا ہے تو کسی نئے شکار کی دُھن سر پر سوار ہو جاتی ہے۔ زبانِ غیر میں اپنے مطلب کو ڈھال لینا کوئی بھائی سرشار ہی سے سیکھے۔

تیرہ تیزی کا مہینہ اِن کے نزدیک نہایت مبارک و مسعود ہے ماہ صفر المظفر کی تیرہ تاریخ بھائی صاحب کی سالگرہ منائی جاتی ہے اور ہر شخص ان کی صحت و عافیت کا متمنی ہوتا ہے۔

سرشار بھائی جب امتحان میں فیل ہوئے تو ہم بھی پُرسے کو گئے تھے۔ دلاسے تشفی سے دل کی ڈھارس بندھائی۔ ممتحن کو گالیاں دیں۔ پرچوں کی مذمت کی۔ لیکن کسی طرح اِن بیچاروں کا دل نہ سنبھلتا تھا انہیں فقط اپنی ناکامی کا رنج ہوتا تو زیادہ فکر کی بات نہ تھی مصیبت تنہا نہیں آتی۔ امتحان میں لوگ فیل بھی ہوتے ہیں اور کامیاب بھی سرشار بھائی کے لئے اپنی ناکامی سے بڑھ کر سارے محلے والوں کی کامیابی سانحہ عظیم تھی۔ اُدھر بھابی ہر سال مڈل کے امتحان میں ناکام ہونے کا تہیہ کئے بیٹھی تھیں۔

بارے اِن دونوں کا نام کامیاب امیدواروں کی فہرست میں آہی گیا۔ مٹھائیاں تقسیم ہوئیں۔ کئی دن جشن رہے، عزیز اقارب نے دعوتیں دیں۔ بیوی میاں کو پھول پہنائے گئے۔ ہم بھی خوش تھے...... لیکن...... دو روز بعد یہ بات پایۂ تحقیق کو پہنچی کہ بھابی نہیں اُن کی ہم نام خاتون کامیاب ہوئی تھیں۔ بہرحال اکثر لوگ بھابی کو مڈل پاس مانتے ہیں۔ اور سرشار بھائی بھی حدود بلدیہ میں اِسی حد تک تعلیم نسواں کے قائل ہیں۔ آپ مانیں یا نہ مانیں بھائی صاحب تو سچ مچ بی۔ اے ہو گئے۔ بیاچلر آف آرٹس! —— اُن کے دیوان خانہ میں سب سے نمایاں فریم اُسی سند کا ہے۔

بی۔ اے ہونے کے بعد سرشار جانی کا دماغ یورپ کا پاس پورٹ بن گیا ہے، بھابی اس پر ہر روز نئی مہر لگاتی ہیں۔ بیوی کے اصرار اور اپنے شوق سے مجبور ہو کر اِس بندۂ خدا نے اسکالر شپ کمیٹی کے اتنے چکر کاٹے ہیں کہ اِن کی سیکل ہراج کا ہارمونیم بن گئی ہے۔ غضب تو یہ ہے کہ محلے والوں کو یوروپین اسکالرشپ مل گیا اور محروم

رہ گئے تو بیچارے سرشار بھائی، شرائط تو انھیں سولھوں آنے قبول تھیں۔ دس سال رہین گے مگر کامیابی کی امید سے نراس نہ ہوں گے، داڑھی مونچ کا صفایا منظور، سر منڈھوانے کی عادت کو ترک کر دینے پر آمادہ۔ اپنے ایک دوست کے ذریعہ خاص بخارا سے دو سوٹ سلوا کر منگائے۔ تنگ مہری کی پتلون، چسپیدہ کوٹ، ترکی ٹوپی، وضعدار عینک' چال چلن، رفتار گفتار، ہر چیز انگریزی سانچے میں ڈھلنے کو تیار۔ سچ ہے تقدیر کے آگے کسی کا بس نہیں چلتا۔ گلڈ ہال کو ایک معزز مہمان کے استقبال سے محروم ہی رہنا پڑا اور کیا عجب ہے کہ ان کے یورپ جانے سے موجودہ جنگ کا خاتمہ ہو جاتا اور یہ بیچ بچاؤ کر دیتے۔ میری دانست میں محلے والوں کا ٹوکا اور نظر بد ان کے لئے مضر ثابت ہوئی۔ گرما کی چلچلاتی دھوپ میں یہ بانکا ٹھکا نوجوان سوٹ بوٹ سے آراستہ اسکالرشپ کمیٹی کے دفتر روانہ ہوتا تھا تو زمین اور آسمان مارے حسد کے جل اٹھتے تھے۔

سرشار بھائی یورپ کی آب و ہوا پر دل و جان سے فریفتہ ہیں اور حیدرآباد میں بیٹھے ہوئے رات دن لندن کی ہوا کھایا کرتے ہیں۔ ایک بات ان میں عجیب دیکھی، یورپ کی ہر چیز انھیں پسند ہے لیکن وہاں جانے یا وہاں سے واپس آنے والے احباب ان کی نظروں میں کانٹے کی طرح کھٹکتے رہتے ہیں البتہ انھوں نے ان بدقسمتوں سے کبھی کبھار وہاں کے پرائیوٹ البم دکھانے کی خواہش کی ہے۔ میں اسے محبت کی معراج سمجھتا ہوں، یہ صنف لطیف کا بڑا احترام کرتے ہیں۔ بھابی کے تذکرہ میں یہ جملہ بیساختہ اُن کی زبان پر آجاتا ہے۔

"ما ئی والف ازا ے جنٹل من آئی لو ہم"

یورپ جانے والوں سے متعلق تو اُن کا فیصلہ اٹل ہے کہ یہ بیوقوف ہوتے ہیں، اُن کے اِس نظریے کی رُو سے مجھے یقین ہے کہ بھائی سرشار ضرور ایک مرتبہ یورپ کا سفر کریں گے۔ .... میں تناسخ ارواح کا قائل ہوں۔

قانون مقدس

آسمان اور زمین میں کیا ہے
کیوں درخشندہ یہ ستارے ہیں

چاند سورج میں نور کس کا ہے
الغرض جتنے یہ نظارے ہیں

علم سارا ہے اِن کا قرآں میں
پر بصیرت نہیں مسلماں میں

زاہد حیدری

سبد گل

۱- ہر ذرہ پہ فضل خدا ہوتا ہے
اک چشم زدن میں کیا سے کیا ہوتا ہے
اصنام دبی زباں سے یہ کہتے ہیں
وہ چاہے تو پتھر بھی خدا ہوتا ہے
(امجد حیدرآبادی)
محمد بیگ

۲- خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے
(اقبال)
در دشت جنوں من جبریل زبوں صیدے
یزداں بہ کمند آور اے ہمت مردانہ
محمد معین الدین علی

۳- آنکس کہ شراب میخورد میگذرد
و آنکس کہ کباب میخورد میگذرد
شد مدکہ بہ کاسہ گدائی نالاں زاں
تر کردہ بہ آب میخورد میگذرد
محمد لیاقت علی خاں صدیقی

حضرات اور خواتین سے ہم نے درخواست کی تھی کہ اپنے پسند کے دو شعر لکھ بھیجیں چنانچہ ایسا کافی ذخیرہ فراہم ہو چکا ہے شہاب کا ایک صفحہ اس شے وقف کیا جاتا ہے جس سے مذاق شعریت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں
ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں
(غالب)
رگوں میں دوڑنے پھرنے کے ہم نہیں قائل
جب آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے
(غالب)
جہاں بانو ایم۔اے

اڑالی قمریوں نے طوطیوں نے عندلیبوں نے
چمن والوں نے مل کر لوٹ لی طرز فغاں میری
(اقبال)
ٹپک اے شمع آنسو بن کے پروانہ کی آنکھوں سے
سراپا درد ہوں حسرت بھری ہے داستاں میری
(اقبال)
خورشید جہاں بیگم

رباعیات عمر خیام

جناب محشر

2

Before the phantom of False Morning died,
Methought a Voice within the Tavern Cried,
"When all the Temple is prepared within,
Why nods the drowsy Worshipper Outside?"

(۲)

آئی یہ صدا ہنگام سحر میخانہ کا اپنے کھلتے ہی در!
اے مست خراب دخت عنب آوارہ و رسوا خستہ جگر!
اٹھ جاگ کہ ساغر پُر کر لیں کیوں سوتا ہے خواب غفلت میں
ڈر ہے نہ کہیں ٹوٹ جائے ترا پر جام حیات لیے رقص شرر

3

And, as the Cock crew, those who stood before
The Tavern shouted — "Open then the Door!
You know how little while we have to stay,
And, once departed, may return no more."

(۳)

دی مرغ سحر نے بانگ اٹھی دہرا اور مل کے صدا رندوں نے ادھر
کچھ دیر کے مہماں ہیں ساقی کھلتا نہیں کیوں میخانہ کا در
یہ دور نشاط و بزم طرب رہ جائیں گے پیچھے ٹھاٹ یہ سب
اب کوچ ہے اپنا سوئے عدم ہم باندھ چکے ہیں رخت سفر

4

Iram indeed is gone with all his Rose,
And Jamshyd's Sev'n-ring'd Cup where no one knows;
But still a Ruby kindles in the Vine,
And many Garden by the Water blows.

(۴)

دارا و سکندر و جام جم، عبرت کے ہیں یہ سب افسانے
نمرود رہا باقی نہ ارم، ویران ہیں ان کے کاشانے
لیکن گل و بلبل اب بھی ہیں وارفتہ الفت دیوانے
لبریز مئے گلگوں ہیں ابھی اے رندان جہاں کے پیمانے

عملی زندگی

اگر تم کسی کو اپنا گرویدہ بنانا چاہتے ہو تو اس پر یہ ثابت کرو کہ تم اُس کی عزت اُس کی کسی خاص قابلیت کی وجہ سے کرتے ہو۔ اگر تم کسی کی کوئی خاص کمزوری دور کرنا چاہتے ہو تو اس کمزوری کو اُس کی خصوصیت امتیازی بنا دو۔

اگر تمہیں ایک لاپروا اور بے اعتبار آدمی سے تعلق رکھنا کسی نہ کسی وجہ سے ضروری ہے تو بہتر ہے کہ اُس سے ایسا برتو کہ وہ کم از کم تمہاری حد تک بھروسہ والا آدمی بن جائے۔

اگر کسی سے شروع ہی میں کہہ دو کہ تم بالکل بیوقوف ہو، تمہارے سمجھ ہی میں یہ بات نہیں آسکتی، خدا نے تم کو اس کام کے لئے پیدا ہی نہیں کیا وغیرہ وغیرہ تو نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان کا دل بجھ جاتا ہے اور ایک قسم کی افسردگی طبیعت پر چھا جاتی ہے جو محنت اور ترقی کرنے سے روکتی ہے اُس کے برخلاف اگر تعریف کیجائے اور دل بڑھایا جائے تو انسان جی لگا کر محنت کرتا ہے اور اگر صلاحیت نہ بھی ہو تو کچھ نہ کچھ ضرور سیکھ لیتا ہے۔

CULBERTSON. کو دنیا کا مشہور ترین برج کا کھلاڑی ہے اور اُس کی کتاب ہر برج کا شوقین کھیلنے والا پڑھتا ہے لیکن اس کو کبھی یہ خیال پیدا نہیں ہوا تھا کہ وہ برج کے کھیل کو پیشہ کی طرح اختیار کر سکتا ہے۔ اتفاقاً اس کی ملاقات ایک حسین اور نوعمر جوسیفن ڈلفن سے ہوئی۔ وہ اُس پر عاشق ہو گیا اور دونوں کی شادی ہو گئی۔ جوسیفن نے کلبرٹسن کو یقین دلایا کہ وہ نہ صرف دنیا کا بہترین برج کا کھلاڑی بن سکتا ہے بلکہ اس کھیل کو پیشہ کی طرح اختیار کر کے وہ ہزاروں روپیہ کما سکتا ہے اگر جوسیفن کے ساتھ کلبرٹسن کی شادی نہ ہوتی تو شاید کلبرٹسن کا نام آج دنیائے برج میں یوں زبان زد خاص و عام نہ ہوتا۔

جناب سید نور الحسن صاحب بی، اے

جو کام تم کسی سے کرانا چاہتے ہو اُسی کام کے لینے سے پہلے اُس شخص کو یہ یاد کرا دو کہ وہی اُس کام کا اہل ہے اور دوسرا نہیں۔ اگر وہ کام اُس سے نہیں لینا چاہتے ہو تو یہ بتاؤ کہ یہ کام اُس کے شایان شان نہیں۔ وہ اس سے کہیں زیادہ اہم کاموں کے لئے موزوں ہے۔ شریر سے شریر آدمی

کو اگر جماعت کا مانیٹر بنا دیا جائے اور سب لڑکوں
کے سامنے اس سے یہ کہا جائے کہ جماعت کے ضبط کا
تم کو ذمہ دار بنایا جاتا ہے۔ سوائے تمہارے اس کام کو
کوئی اچھی طرح نہیں کر سکتا۔ آج سے تم جماعت کے
ضبط کے ذمہ دار ہو۔ پھر دیکھئے خود شرارت کرنا
تو درکنار کسی کو جماعت میں چوں کرنے کا یارا نہیں
رہے گا۔

اگر بڑا آدمی چھوٹے آدمی سے مدد کرنے کو کہے تو
چھوٹے آدمی کو بڑی خوشی ہوتی ہے وہ یہ سمجھتا ہے کہ
وہ بھی اس قابل ہے کہ لوگ اس سے رہنمائی چاہیں
فرض کیجئے کہ آپ موٹر میں سفر کر رہے ہیں اور راستہ
بھول جائیں۔ اب اگر راستہ چلتے ہوئے غریب کسان
سے کہو کہ بھائی کیا تم ہماری مدد کر سکتے ہو اور یہ
بتا سکتے ہو کہ فلاں مقام کو کس راستہ سے جانا چاہیئے
تو دیکھو کہ وہ کس طرح حتی الامکان اپنی پوری قابلیت
خرچ کر کے تم کو راستہ بتانے کی کوشش کرے گا۔ اس
طرح اگر کسی کو خط میں لکھا جائے کہ مجھے فلاں فلاں
مشکل کا سامنا ہے آپ کی قابلیت اور تجربے ہی سے
توقع ہے کہ میری مشکل آسان ہو سکے اگر زیادہ زحمت نہ ہو تو
راہ نجات بتائیے ممنون ہوں گا۔ گمان غالب ہے کہ
جواب بہت جلد ملے گا اور وہ شخص تمہارا دوست
ہو جائے گا کیونکہ تم نے اس کی قابلیت اور تجربہ کو
مان لیا۔ اور کھلم کھلا اس بات کو تسلیم کر لیا کہ تم جیسا
آدمی بھی اس کی امداد کا متمنی ہے۔

تمہارا دشمن سے دشمن کیوں نہ ہو اگر تم اس سے
مدد کی خواہش کرو اور اس کے وقار، قابلیت، ذکاوت
اور تجربے کو تسلیم کر کے لجاجت سے ملتجی ہو کہ وہ تمہارے
آڑے وقت میں کام آئے اور تمہاری مشکل آسان
کرے تو وہ پسیج جاتا ہے اس کو تم سے ایک طرح کی
دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے اور وہ حتی المقدور کوشش
کرتا ہے کہ تمہاری مدد کرے۔

غزل

جناب جالب چغتائی (مراد آبادی)

وہ بھی ہمیں بہار بداماں نہ کر سکے
شام خزاں کو صبح گلستاں نہ کر سکے

اشکوں کو اپنے زینت عنواں کر سکے
جی کھول کر ہم ان کو پریشاں کر سکے

ہستی عشق رو کش جاناں نہ کر سکے
ذرہ حریف مہر درخشاں نہ کر سکے

ہم تشنہ کام ہی رہے صحن چمن میں بھی
نظارۂ بہار گلستاں نہ کر سکے

کیا آئی ہو امید کہ جو میرے واسطے
دو اشک بھی تو زینت داماں نہ کر سکے

تمہید عرض حال ہی پہ وہ تو چل دیئے
ان سے بیان حال پریشاں کر سکے

بیچارگی کو اس کی نہ تاب سبب پوچھئے
قدموں پہ زندگی بھی جو قرباں نہ کر سکے

عرب کا شاعر (خاکہ)

(۱)

منظر (بردہ فروش کا مکان۔ ملک کے امراء بیٹھے ہیں۔ ملازم خوبصورت کنیزوں اور غلاموں کو پیش کر رہے ہیں)

ملازم۔ حضور یہ ایک صاحب جمال کنیز ہے۔ جو حسن و خوبصورتی کے علاوہ موسیقی میں کافی مہارت رکھتی ہے۔

امیر۔ خط و خال تو اچھے ہیں قیمت کیا ہے؟

بردہ فروش۔ چار ہزار کیونکہ اس کی تعلیم میں بہت کچھ صرفہ ہوا ہے۔ جب کہیں یہ بدر کامل بن کر ضیا پاش ہے۔ جس کے نغموں سے فضا کانپ اٹھتی ہے۔ طیور اپنی نوا سنجی بھول جاتے ہیں۔

امیر۔ چلئے میں نے خرید لیا۔

ملازم۔ یہ ایک حبشی غلام ہے جو تیر اندازی اور شہسواری کے فن میں اپنی نظیر نہیں رکھتا۔

دوسرا۔ مجھے ایسے ہی شخص کی ضرورت تھی معلوم تو بتائیے؟

بردہ فروش۔ تین ہزار۔ حضور واقف ہیں کہ اس فن کی تعلیم دینے میں کتنی مشکلات پیش آتی ہیں۔

امیر۔ میرے یہاں بھیجدو۔

(دور سے گھوڑوں کے ہنہنانے کی آوازیں آتی ہیں۔)

بردہ فروش۔ (ملازم سے) ذرا دیکھنا کہ کون آرہا ہے۔

ملازم۔ (واپس آکر کہتا ہے) قصر خلافت سے کوئی خاتون تشریف لا رہی ہیں

بردہ فروش۔ استقبال کے لئے باہر جاتا ہے اہلاً و سہلاً۔

(ایک شیریں آواز آتی ہے)

میں امیر المومنین کے صاحبزادی کی معتمد ہوں علیہ مرتبت چند کنیزوں اور غلاموں کو خرید فرما کر آزاد کرنا چاہتی ہیں۔

بردہ فروش۔ جزاک اللہ۔ غلام تعمیل کیلئے حاضر ہے۔ حضور رونق افروز ہوں۔

(ملازمین غلاموں۔ کنیزوں کو پیش کرتے ہیں)

ملازم۔ علیہ مرتبت اس صف کی جانب نظر توجہ منعطف کیجئے۔

(نازنین اٹھتی ہے اور انتخاب کرتی ہے)

نازنین۔ ہاں۔ یہ ایک۔ دو۔ تین۔ چار۔ پانچ

کنیزیں ہوئیں اور یہ پانچ غلام۔

بردہ فروش۔ انتخاب نہایت موزوں ہے

نازنین۔ انہیں۔اسی وقت آزاد کردو۔ تمہیں منھ مانگے قیمت مل جائیگی۔

بردہ فروش۔ (غلاموں سے) آج سے تم سب آزاد ہیں۔خلیفۃ المسلمین کے ترقی دولت اور عمر اقبال کی دعا دو کہ صاحبزادی نے تمہیں آزادی دلائی ہے۔

غلام۔ زندہ باد خلیفۃ المسلمین۔پائندہ باد۔ قرۃ العین خلافت۔

(اس کام سے فارغ ہو کر خاتون جانا چاہتی تھی کہ ایک تباہ حال بوڑھا آتا ہے اور نہایت کانپتی ہوئی آواز میں کہتا ہے)

پیرمرد۔ فدائے شوم۔میں لب گور انسان ہوں۔ اتنی طاقت نہیں کہ اس وسیع کائنات میں کوئی کار نمایاں کر سکوں۔ البتہ کچھ دن جو زندگی کے باقی ہیں انہیں آزادی کے ساتھ کاٹنا چاہتا ہوں۔حضور اس ضعیف کو بھی آزاد فرمائیں تو دولت حسن و اقبال کا دعاگو رہوں گا۔

نازنین۔ (سر سے پیر تک بوڑھے کو دیکھتی ہے۔اور بردہ فروش سے کہتی ہے)

واقعی حالت زار ہے یقیناً یہ رحم کے قابل ہے۔مگر زبان کتنی فصیح ہے۔ اچھا تو اس کو بھی آزاد کردو۔

بردہ فروش۔ آج سے تم بھی آزاد ہیں۔خاتون محترم کو دعائیں دو جنھوں نے تمھیں آزادی دلائی ہے۔

بوڑھا۔صد وسی سال سلامت رہیں۔یہ احسان عظیم تا زیست فراموش نہ ہوگا۔

مگر۔ ۔ ۔ ۔ مگر۔ ۔ ۔ (رک جاتا ہے)

نازنین۔ ہاں کہو یہ مگر مگر کہہ کر کیوں خاموش ہو گئے۔

پیرمرد۔ غلام اتنی اجازت چاہتا ہے کہ اس احسان کے بدلہ میں ان پھول سے ہاتھوں کو چوم لوں۔

نازنین۔ تمھیں اس کی اجازت ہے۔

پیرمرد۔(نہایت اشتیاق سے ہاتھوں پر بوسہ دیتا ہے) تو غلام کو اجازت ہے؟ جانے کی۔

بردہ فروش۔ہنستا ہے۔

نازنین۔یہ تم ہنستے کیوں ہو؟

بردہ فروش۔حضور نے پہچانا بھی کہ یہ کون ہے؟

نازنین۔ میں کیا جانوں تم ہی بتاؤ۔

بردہ فروش۔ یہ ملک کا مشہور شاعر علیجہ ہے۔ جس کا نام شاید آپ نے بھی سنا ہوگا۔

نازنین۔ مجھے تو اس کے اشعار بھی یاد ہیں پھر یہ غلام کیسے بن گیا؟

بردہ فروش۔ تھا تو آزاد ہی مگر حضور کے نازک ہاتھ چومنے کی تمنا میں یہ خود میرا غلام بن گیا

نازنین۔ تم نے نہایت گستاخی کی پہلے ہی سے کیوں نہ بتا دیا۔

بردہ فروش۔ کیا عرض کروں۔

(نازنین غصہ کی حالت میں اوٹھ جاتی ہے)

(۲)

قصر خلافت

(سریلے نغموں کی ہلکی صدائیں اور چہل پہل کی آوازیں آتی ہیں)

(کنیزانِ محل ہمودب ملکہ خلیفۃ المسلمین رونق افزائے تخت ہو رہی ہیں۔

ملکہ۔ ریحانہ کہاں ہے یہاں دکھائی نہیں دیتی۔

کنیز۔ خلیہ حضرت۔ وہ اپنے کمرہ میں ہے۔

ملکہ۔ بلا لاؤ۔

ریحانہ آتی ہے۔

ملکہ۔ خیر باشد یہ رونا کیسا؟

کنیز۔ (خلیفۃ المسلمین تشریف لا رہے ہیں۔

سب مودب کھڑے ہو جاتے ہیں۔ خلیفہ داخل ہوتا ہے پہلوں کی جانب نگاہ کرتا ہے ریحانہ کو دیکھکر)

خلیفہ۔ ہیں یہ روتی کیوں ہے؟

ریحانہ۔ اپنی نصیبوں پر۔ اپنی رسوائیوں پہ

خلیفہ۔ آخر بات کیا ہے؟

ریحانہ۔ امیر المومنین طلحہ نے رسوائیوں میں کوئی کسر اوٹھا نہیں رکھی۔

اپنے حسن و عشق کا مجھے تختۂ مشق بنا رکھا ہے

"جس سے جہاں ملے ہم یہ تذکرہ سُنا ہے"

خلیفہ۔ اوہو یہ جرات۔ یہ گستاخی۔ شاہی محل کی نازنینوں کے ساتھ۔ (باہر نکل آتا ہے)

خلیفہ۔ کوئی حاضر ہے۔

کئی آوازیں۔ حضور عالی۔

خلیفہ۔ طلحہ کو اسی وقت ہمارے حضور میں پیش کیا جائے۔

(چوبدار چلے جاتے ہیں اور کشاں کشاں طلحہ کو لے آتے ہیں)

خلیفہ۔ کہاں ہے طلحہ۔

ملازمین یہ حاضر ہے۔

خلیفہ۔ کیوں جی۔

یاد ہیں وہ ساعتیں جب میں حریم ناز میں
داستان دل اوسے اکثر سنا جاتا تھا میں

یہ شعر تمہارا ہے؟

طلحہ۔ حضور۔

خلیفہ۔ تمھیں اس سے ملنا کب نصیب ہوا تھا؟

طلحہ۔ میں نے تو یہ تمنا ظاہر کی تھی۔

یہ وقت تو ان ہے جلوہ فرمائی سے کچھ پہلے
شکیبائی کو ذر دیدہ نظر بیمل جا کرے

خلیفہ۔۔۔ ہے

وہ نرم ہے بادشاہ کی عشق ہی بیکار ہے
موت ہی آئے الہٰی زندگی دشوار ہے

یہ شعر بھی تو تمہارا ہی ہے نا؟

طلحہ - کیا عرض کروں۔

خلیفہ - لیجاؤ ہمارے سامنے سے شرع نے تہمت لگانے والے کے لئے جتنے درّے مقرر کئے ہیں اس کو لگائے جائیں۔

(کوڑوں کی آوازیں اور کراہنے کی آواز آتی ہے)

طلحہ - (آہ آہ کرتا ہوا نکلتا ہے - ریحانہ طلحہ کی بے چینی سے متاثر ہوتی ہے)

ریحانہ - اے ہے تم کراہتے کیوں ہو۔

طلحہ - سہ

مرحبا صد مرحبا اے ساکن قصر شہی!
تیرے باعث بادشاہ نے مار ہی ڈالا مجھے

(ریحانہ بے اختیار روتی ہوئی محل میں واپس جاتی ہے - خلیفہ ملکہ سے پوچھتا ہے۔)

خلیفہ - یہ اب کیوں رو رہی ہے۔

ملکہ - طلحہ پر جو کوڑے پڑے ہیں اوس کی اذیت سے یہ بھی بے تاب ہے۔

خلیفہ - عجیب سادہ مزاج ہے اچھا ہم اوس کو انعام دے کر خوش کر دیں گے - اب مت رونا۔
ہم حکم دیتے ہیں کہ فوراً اوس شاعر کو خزانہ شاہی سے پچاس ہزار درہم دیئے جائیں

(روپیوں کی آواز)

طلحہ - یہ الطاف شاہانہ کس صلہ کے پاداش میں ہے۔

ملازم - ریحانہ کی عنایت ہے۔

طلحہ - مجھے ایسی عنایت کی ضرورت نہیں اس کو تم سب لیلو۔

(تمام روپیہ لٹوا دیتا ہے - آواز سن کر خلیفہ باہر نکل آتا ہے)

خلیفہ - یہ شور و غل کیسا تھا۔

خدام - حضور نے جو انعام طلحہ کو عطا فرمایا تھا اوس نے وہ سب قصر خلافت پر نچھاور کر دیا۔

خلیفہ - کہاں ہے طلحہ۔

ملازم - حاضر ہے۔

خلیفہ - تم نے ہمارا عطا کردہ انعام کیوں تقسیم کر دیا۔

طلحہ - امیر المومنین - غلام جس نازنین کا فریفتہ ہے اوس کو حصول دولت کا ذریعہ بنانا نہیں چاہتا۔

خلیفہ - اس جواب سے ہم نہایت خوش ہوئے اچھا اونہیں اور پچاس ہزار درہم دئے جائیں۔ مگر ہاں اب اس کو پھر لٹا نہ دینا۔

طلحہ - دولت زیادہ۔

—— (۳) ——

(جشن سالگرہ کا موقع ہے - امراء وغیرہ نے تحائف بھجوائے ہیں - خلیفہ ایک ایک کا معائنہ کر کے اون کی داد دیتا ہے)

خلیفہ - مگر یہاں یہ چینی کا مرتبان کس نے بھجوایا ہے

وزیر - حضور اس کو طلحہ نے پیش کیا ہے -

خلیفہ - ذرا لانا -

وزیر - حضور یہ رہا -

خلیفہ - (ہاتھ میں مرتبان لے کر - اس پر کیا لکھا ہے)

" میرا جی دنیا کی ایک چیز میں الجھا ہوا ہے جس تمنا کو اللہ اور خلیفہ ہی پورا کر سکتا ہے میں اس کے ملنے سے بالکل مایوس ہو چکا ہوں لیکن پھر بھی یہ دیکھ کے کہ آپ دنیا و مافیہا کو حقیر جانتے ہیں میرے دل میں اس کی ہوس پیدا ہو جاتی ہے)

خلیفہ - (کچھ سوچ کر) کہتا تو بالکل سچ ہے ریحانہ کا وہی مستحق ہے -

خلیفہ محل میں واپس جاتا ہے -

کہاں ہے ملکہ !

کنیز - حجلۂ شاہانہ میں -

(کنیزیں دوڑتی ہیں - آواز)

ملکہ - کیوں یاد فرمایا مجھے -

خلیفہ - میں نے تصفیہ کر لیا ہے کہ ریحانہ طلحہ کو دیدی جائے -

ملکہ - مرضیٔ مبارک -

خلیفہ - ریحانہ کو بلا لو -

ریحانہ - کنیز حاضر ہے -

خلیفہ - کیا تمھیں ہمارے ارادہ کی اطلاع ہے ؟

ریحانہ - امیر المؤمنین آقا ہیں مختار ہیں - مگر کنیز اس قدر گوش گذار کرنا ضروری سمجھتی ہے کہ خلافت کی ایسی معزز خدمات ادا کرنے کے بعد لونڈی کی قسمت میں یہی لکھا ہے کہ ایک کاسۂ فروش کے سپرد کر دی جائے تو سر تسلیم خم ہے -

خلیفہ - ہم سمجھ گئے - جاؤ طلحہ سے کہدو کہ ریحانہ تمھیں نہیں مل سکتی البتہ اس کا مرتبان اشرفیوں سے بھر دیا جائے -

(ریحانہ باہر جاتی ہے)

خزانچی - امیر المؤمنین کا حکم تو یہی ہے کہ تمھارا مرتبان اشرفیوں سے بھر دیا جائے -

طلحہ - تمھیں مغالطہ ہوا ہے بلکہ ارشاد عالی تو یہ ہے کہ جواہرات سے پُر کر دیا جائے -

خزانچی - حکم شاہانہ تو ایسا نہیں ہے -

(ریحانہ آگے بڑھ کر) طلحہ تمھارا عشق دیکھ لیا اگر حقیقت میں تمھیں مجھ سے محبت ہوتی تو زر اور جواہرات کا امتیاز نہ ہوتا - اگر کچھ بھی سمجھ ہے تو آئندہ بھولے سے محبت کا نام لے کر محبت جیسے پاک جذبہ کو بدنام نہ کرنا -

طلحہ - آہ - آہ -

رخصت ہوتا ہے -

رباعیات

جناب مولوی میر اشرف علی صاحب اشرف
مفتی بلدہ و صدارت العالیہ سرکار عالی

عشاق میں قیس ہی انوکھا نکلا
بے چین ہوا تو سوئے صحرا نکلا
چھوٹا سب کچھ مگر نہ چھوٹی لیلیٰ
دیوانہ بکار خویش دانا نکلا

سینہ ہے کہ صدمات کا گنجینہ ہے
ظاہر ہے کہ ہے زہر مگر پینا ہے
جینے کے لئے مرتے ہیں انسان تمام
لیکن مجھے مرنے کے لئے جینا ہے

تقدیر کہیں کچھ، کہیں کچھ، ہوتی ہے
یہ جاگتی ہے کہیں، کہیں سوتی ہے
اشرف ہنستے ہیں کھل کھلا کر غنچے
شبنم ہے کہ رات بھر روتی ہے

امید نہیں رہی تو جھگڑے چھوٹے
دنیا کے تعلقات سارے چھوٹے
اچھا ہی ہوا کہ کوئی حامی نہ رہا
اللہ سے لو لگی جو کس بل ٹوٹے

مانا ہے ملک نے ذی لیاقت ہم کو
حاصل ہے ازل سے یہ سعادت ہم کو
مخلوق الٰہی میں ہیں اشرف ہم لوگ
اللہ میاں سے ہے خلافت ہم کو

استفسار؟

ایک عنایت فرمانے ذیل کا شعر سنا کر بیان کیا کہ محض تخلص کے تبدیل کر دینے سے ایک شعر صائب کا اور دوسرا بیدل کا ہو جاتا ہے یہ دونوں شعر ان دونوں کے دیوانوں میں دیکھے ہیں۔ ؎

حرص قانع نیست بیدل ورنہ اسباب جہاں　　آں چمن در کار باشد اکثرے در کار نیست

اسی طرح۔ سُنتے ہیں کہ مومن نے کیا عشق بتاں ترک　　اس بات سے تو خوش نہ ہوا ہو گا خدا بھی

بجائے مومن کے اکبر الہ آبادی کا شعر بھی بن جاتا ہے۔ چونکہ یہ اشعار ہمارے نظر سے نہیں گذرے اسلئے جناب حضرت عطار د سے اس کی نسبت استفسار کیا تھا جس کا حسب ذیل جواب ملا ہے

حرص قانع نیست بیدل ورنہ اسباب جہاں　　آں چمن در کار شد اکثرے در کار نیست

اگر صائب کے دیوان میں بھی بجنسہٖ یہ مقطع درج ہے تو اس کو سرقہ کہنے میں تامل ہوتا۔ اوّل تو مجھے یہ شعر ہی صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ دوسرا اگر صحیح نہیں تو اسی مضمون کا ایک شعر مجھے بھی یاد ہے مگر معلوم نہیں کس کا ہے۔

در قضائے تنگ دنیا حاجت بسیار نیست　　انچہ ما در کار داریم اکثرش در کار نیست

یہ شعر ان دونوں مقطعوں سے بہتر ہے۔ یہی حال مومن اور اکبر الہ آبادی کے اشعار کا ہے۔

مولانا جامی کا شعر ہے۔ ؎

میل خم ابروئے توام پشت دوتا کرد　　در شہر چو ماہ نوم انگشت نما کرد

شیخ علی حزیں کہتے ہیں ؎

بار غم عشق تو مرا پشت دوتا کرد　　در شہر چو ماہ نوم انگشت نما کرد

امیر خسرو ؎

سرو گفتم کہ بہ بالائے تو مانَد لیکن　　نتوانم کہ ازیں شرم ببالا نگرم

مولانا جامی فرماتے ہیں ؎

سرو گفتم قد ترا وز شرم!　　سر ببالا نمی توانم کرد

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کوئی شعر کسی شاعر کو پسند آیا اور وہی مضمون اس نے دوسرے الفاظ میں ادا

کیا جائے تو وہ سرقہ نہیں، ماخوذ اور ماخوذ منہ کے فرق و مراتب کا خیال کیا جاتا ہے اگر ماخوذ، ماخوذ منہ سے بہتر ہو تو اوسی کو افضل سمجھیں گے اگر پست ہو تو مذموم

کاتبوں کی غلطی یا تدوین کرنے والوں کی سہو نظری سے اکثر ایسا ہوا ہے کہ ایک دو شعر نہیں بلکہ غزلیں طبع ہوئی ہیں۔ حافظ کا شعر ہے

نہ متاع وصل تو یابد ریاض رضوان آب زتاب ہجر تو دارد شرار دوزخ تاب

یہ پوری غزل سلمان ساوجی کے دیوان میں موجود ہے۔

ارادت خان واضح کا شعر ہے

براہ او چہ دریا بازیم نے دینی نہ دنیائے دلے دارم وا ندو ہے سرے دارم و سودائے

آزاد بلگرامی خزانہ عامرہ میں لکھتے ہیں ابو طالب کلیم کے دیوان میں بجنسہ یہ شعر اون کی نظر سے گذرا ہے۔

حافظ کا ایک مشہور مقطع ہے

شنیدہ ام کہ سگاں را قلادہ می بندی چرا بہ گردن حافظ نمی نہی رسنی

مولانا آزاد بلگرامی سرو آزاد میں لکھتے ہیں دیوان حافظ کے بعض دیوانوں میں لفظ حافظ کے جگہ عاشق واقع ہوا ہے اور مقطع یہ ہے۔

مزاج دہر تبہ شد دریں بلا حافظ کجا است فکر کلیمی و رائے برہمنے

میرے پاس دیوان حافظ ہے جو حکیم ابن وصال شیرازی کی کتابت کا عکس لے کر طبع کیا گیا ہے اوس میں یہ شعر نہیں ہے۔ اور مقطع میں بجائے لفظ "برہمنے" کے "اہرمنے" لکھا ہے۔

یہ اشعار ملاحظہ ہوں۔ شیخ سعدیؒ کا شعر ہے

با وفا خود نہ بود در عالم یا مگر کس دریں زمانہ نکرد

اسی مضمون کو شیفتہ نے یوں ادا کیا ہے۔

یوں وفا اوڑھ گئی زمانہ سے کبھی گویا جہاں میں تھی ہی نہیں

شیفتہ نے سعدی کے فارسی شعر کو اردو میں نظم کیا ہے۔ داغ صاحب کہتے ہیں

اڑ گئی یوں وفا زمانہ سے کبھی گویا کسی میں تھی ہی نہیں

غرض سرقہ اور توارد کی طویل بحث ہے۔ استادان فن پر جب تک کوئی صحیح اور واضح ثبوت نہ ہو

سرقہ کا الزام نہیں لگایا جا سکتا۔ بعض دفعہ معمولی مضامین اور تشبیہات کی وجہ سے توارد ہو جانا ممکن ہے ایسے صدہا شعر استادوں کے مل سکتے ہیں۔ بعض دفعہ کتابت میں یا تدوین میں الحاق ہو جاتا ہے۔ جو اشعار آپ نے لکھے ہیں وہ یقیناً غلطی سے ان دیوانوں میں طبع ہوئے ہوں۔ صائب کا دیوان میرے پاس نہیں ہے۔ بیدل کے دیوان میں یہ شعر نہیں ملا۔ واللہ اعلم حقیقت حال۔

غزل

(جناب مسلم)

شہنشاہِ ما چوں صلائے کرم زد — گدا با خراباتیاں جامِ جم زد

فدا باد بروئے جہانِ تمنا — بہ تیغِ عرب غلغلہ در عجم زد

خنک آں دو چشمِ فسوں سازِ ساقی — چنیں آتشِ تیز در چشمِ نم زد

تبسم کناں آمد و پرسشے کرد — ز گوئی کہ بر دفترِ غم قلم زد

مگر از درت رفت مایوس مسلم
وگرنہ چرا بابِ دیرو حرم زد

عجیب واقعہ

جہاں دو چار احباب جمع ہوں ایک محفل بن جاتی ہے اور بعض اوقات ایسی محفل اور بھی دلچسپ ہو جاتی ہے جبکہ حلقہ احباب میں تعلیم یافتہ اور سمجھدار ہوں تو مختلف موضوعات بحث کا مرکز بن جاتے ہیں گپ سے لے کر روحانیات پر اس کا سلسلہ ختم ہوتا ہے۔

حال ہی میں ایک ایسی محفل میں نشستند و گفتند و برخواستند کا اتفاق ہوا جس میں ایک تعلیم یافتہ دراز قد وجیہہ صورت فوجی نوجوان سوٹ بوٹ میں ملفوف نماز روزہ کے پابند جاذب نظر تھے جنکی گفتگو میں انگریزی الفاظ کا ذخیرہ زیادہ اور اردو کا سرمایہ آٹے میں نمک کی طرح تھا۔ پھر لطف یہ کہ الفاظ انگریزی ہو یا اردو وہ اس طرح ادا کرتے تھے کہ جس طرح کسی مشاعرہ میں شاعر شعر پڑھ دیتا اور سامعین ردیف وقافیہ کی تکمیل کیا کرتے ہیں اور شعر مکمل ہو جاتا ہے مثال کے طور پر اگر او نہیں جناب' کہنا ہوتا تو وہ محض "جنا" کہکر سلسلہ کلام جاری رکھیں گے اور سننے والا سمجھ جائیگا کہ اس وقت آپ جناب کہنا چاہتے ہیں۔ یہ کوئی تصنع نہیں کہ اس میں کوئی خاص فیشن مضمر ہو بلکہ فطرۃ ہی ایسی واقع ہوئی ہے اور افتاد طبیعت ہی ایسی تھی اپنے فوجی کارنامے اور مختلف واقعات سوسائٹی اور سماج کے بیان کر رہے تھے اثناء کلام میں میری زبان سے یہ شعر نکل گیا ؎

بہ مئی سجادہ رنگیں کن گرت پیر مغاں گوید
کہ سالک بیخبر نہ بود ز راہ و رسم منزلہا

سُن کر کہنے لگے کہ اس شعر کی نسبت ایک محیر العقول واقعہ سناتا ہوں جس کو میرے ایک دوست جو اس وقت موجود ہیں جن کا تعلق تعلیمات سے ہے اپنی آپ بیتی سنائی ہے۔

کہنے لگے کہ میرے مدرس دوست ایک روز شام کے وقت اپنے مختصر سے مکان میں جس میں ایک کمرہ اور دالان تھا بیٹھے ہوئے تھے کہ اچانک ایک مادر زاد برہنہ شخص آگیا اور یہ گھبرا گئے کہ اس ہیئت کذائی میں آخر یہ کون ہوں گے چنانچہ ڈرتے ڈرتے سوال کیا کہ آپ کیا چاہتے ہیں اور آنے کی غرض کیا ہے چنانچہ اون بزرگ نے اوس کے جواب میں کہا کہ میں نماز پڑھنا چاہتا ہوں جا نماز لادے، اوٹھوں نے جا نماز لادی اور ایک تہبند بھی دیا۔ لیکن اون بزرگ نے تہبند تو پھینک دیا اور اُسی عریاں حالت میں نماز مغرب ادا کی۔ جب اوس سے فرصت پائی تو وہ یوں ہی خاموش بیٹھے رہے جب رات زیادہ ہو گئی تو کہنے لگے کہ وہ درآئین

بسر کرنا چاہتے ہیں انہیں کچھ پریشانی ہوئی کیونکہ
اون کے پاس صندوق میں کچھ مختصر سی رقم تھی
اندیشہ یہ ہوا کہ نہ جانے کس قماش کے ہوں کہیں
رقم خورد برد نہ ہو جائے۔ بڑی دیر غور و فکر کے
بعد اونہیں شب میں قیام کرنے کی اجازت دیدی
اور رات تمام یہ احتیاطاً بیدار رہے۔ خدا خدا کرکے
جب صبح ہوئی تو اون بزرگ نے اونہیں دیوان
حافظ کا ایک قلمی نسخہ دے کر تاکید کی کہ اس کو نہایت
احتیاط سے رکھنا کہ یہ ایک نایاب شئی ہے اتنا کہہ کر
وہ فوراً چلتے بنے۔ اونھوں نے باہر نکل کر اِدھر اُدھر
اون بزرگ کو ڈھونڈھا۔ لیکن پتہ نہ چلا یہ واپس
آکر اسی سوچ میں پڑ گئے کہ یہ کون بزرگ تھے دیوان
حافظ کے دینے کا مقصد کیا تھا۔ لیکن کوئی صحیح رائے
قایم نہ کر سکے ایسی حالت میں دیوان حافظ کی ورق
گردانی شروع کی تو پہلے اسی شعر پر نظر پڑی۔

"بہ مئی سجادہ رنگیں کن گرت پیرِ مغاں گوید"

اس شعر کے نیچے حافظ علیہ الرحمہ نے یہ شعر کس
موقع اور محل پر کہا تھا اوس کی وضاحت کیگئی تھی
غرض ہر شعر کے نیچے کوئی نہ کوئی قصہ شعر لکھنے کی نسبت
لکھا تھا۔ چنانچہ موجودہ شعر کی حسب ذیل توضیح
بیان کی گئی تھی۔ کہتے ہیں کہ قدیم ایران میں ایک
لڑکا اور لڑکی کا عقد ہوا اوس زمانہ میں ماہ عسل
گزارنے کے لئے کوئی دریائی مقام تجویز کیا جاتا تھا
چنانچہ یہ دولہا دولہن دریا کے کنارے ٹہل رہے
تھے کہ اتفاقاً دریا کے کنارے پانی میں ڈوب گئے۔
عزیز و اقارب نے بہت کچھ تلاش کی مگر نعش کا پتہ
تک نہ چلا اور بزم شادی محفل ماتم بنگئی رو پیٹ کر
سب واپس آگئے۔

اوسی زمانہ میں ایک بزرگ تھے جن کے پاس
معتقدین کا آٹھ پہر مجمع رہتا اور اون سے خیر و برکت
حاصل کیا کرتا تھا۔ چنانچہ ایک روز ایک حسین و جمیل
لڑکی نے بزرگ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ وہ
چند ایسے لوگوں میں پھنس گئی ہے جو اوس کو پیشہ ور
معصیت پر آمادہ کر رہے ہیں اور وہ ارتکاب معصیت سے
سخت پریشان ہے خدا را دستگیری فرمائیے۔ چنانچہ
اون بزرگ نے اوس لڑکی کو ایک دعا بتائی کہ اس کا
ورد جاری رکھے وہ معصیت سے محفوظ رہے گی وہ اجازت
لے کر چلی گئی۔ اسی طرح سے اون بزرگ کی خدمت میں
ایک نوجوان شکیل لڑکا بھی آیا کرتا تھا اور طالب
تھا کہ اپنے عزیز و اقارب سے ملنے کے لئے دعا فرمائیں
کئی دنوں تک وہ لڑکا حاضر خدمت ہوتا رہا ایک
دن جب کہ وہ پھر حاضر ہوا تو اون بزرگ نے ارشاد
کیا فلاں جگہ جا جہاں ایک لڑکی رہتی ہے اوس سے
مواصلت حاصل کر۔ بزرگ کی زبان سے یہ پیام سن کر
کانپ اوٹھا اور گڑگڑانے لگا کہ آپ ایسا ارشاد
کیوں ہو رہا ہے وہ جتنی عاجزی کرتا بزرگ کا یہی

جواب تا وقتیکہ تو قربت حاصل نہ کریگا کبھی اپنے بچھڑوں
سے مل نہیں سکتا۔ جب جاتا یہی حکم ہوتا ایک روز
مجبور ہوکر اور عزیزوں سے ملنے کی تمنا میں بے تاب
اوس لڑکی کے گھر پہنچا تو اوس کو سکتہ سا ہوگیا
کہ درحقیقت وہی لڑکی اوس کی جائز بی بی ہے
جو دریا میں اوس کے ساتھ ڈوب گئی تھی جب اس
واقعہ کی اطلاع حافظ کو ہوئی تو آپ نے "۔
بہ مئی سجادہ رنگیں کن" والا شعر موزوں کیا۔
چنانچہ میرے فوجی دوست نے ایک دو شعر کے
نسبت ایسے ہی واقعات سُنائے اور جب میرا اشتیاق
بڑھا کہ اون مدرس صاحب سے میرا تعارف کرائیں۔
تو وعدہ کرلیا ہے کہ ضرور تعارف کرائینگے مگر وہ
دیوان حافظ کا نسخہ اون کے پاس رہا نہیں کیونکہ
اون کے ایک حکیم دوست اون سے مستعار لے گئے تھے
جو آج تک باوجود تقاضہ کے واپس نہیں کیا اور ہمیشہ
یہی کہتے آئے ہیں کہ واپس کردیا گیا ہے۔ چنانچہ اون
مدرس صاحب کا بیان ہے کہ یہ نسخہ تلف ہونے کے کچھ
عرصہ بعد وہ حیدرآباد آئے ایک روز نماز جمعہ کے
لئے مکہ مسجد گئے تھے نمازیوں کے انبوہ میں ایک صاحب
قریب آکر اون مدرس صاحب سے کہا کہ ہم نے تجھے ایک
لاجواب چیز دی تھی لیکن تو نے ناقدری سے وہ تلف
کردی" یہ سن کر وہ متحیر ہوئے دیکھا تو یہ صاحب وہی
برہنہ بزرگ تھے جنھوں نے دیوان حافظ کا نسخہ
دیا تھا دیکھتے دیکھتے وہ بزرگ مجمع میں شامل ہوگئے
کئی گھنٹوں تک تلاش و جستجو کی مگر پتہ نہ چلا۔ اور
مدرس آج تک اپنی بدنصیبی کا ماتم کررہے ہیں۔
اس کی نسبت ہم نہیں کہہ سکتے کہ کہاں تک صحیح
البتہ ؎

خاصانِ خدا خدا نہ باشند
لیکن ز خدا جُدا نہ باشند

سُنتے آئے ہیں۔ اگر اون مدرس صاحب سے ہماری ملاقات
ہو تو اور تفصیلی واقعات دریافت کرکے آئندہ
اس کی نسبت کچھ لکھ سکیں گے۔

غزل

(جناب محمد مظفر الدین صاحب بلیغ)

وہ محبت، وہ التفات گئی — وہ زمانہ، وہ پہلی بات گئی
وہ بھی دن تھے کہ مہرباں تھے آپ — اب وہ طرزِ نوازشات گئی
شب وعدہ یہ زاریاں کب تک — سو رہو دیکھو آدھی رات گئی
عشق میں جان گئی، یہ خوب ہوا — فکرِ ہستی بے ثبات گئی
آئیں گے، اب وہ آتے ہی ہونگے — بس اسی ضمن میں ساری رات گئی

نہ ہوئی یاد حق بلیغ کبھی!
عمر اپنی تو واہیات گئی!

غزل

جناب نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیز

ان کی نگہ سے جب نگہِ بے اثر ملی
دل کی خبر ملی نہ جگر کی خبر ملی

جاں دادگانِ عشق کا دشوار تھا سراغ
یہ راہ پیچدار نہ ملنی مگر ملی

وابستہ سبب ہے کرم ہو کہ ہو ستم
طرزِ عمل سے اپنی یہ مجھ کو خبر ملی

پیمانِ ترکِ ہوش پہ ساقی کے ہاتھ سے
پیمانہ کیا ملا سندِ معتبر ملی

کیونکر ادا ہو شکر و سپاسِ عطاءِ عشق
داغِ غمِ فراق ملا چشمِ تر ملی

دنیا کے گرم و سرد کا خوگر ہوں اس قدر
آرام جانتا ہوں اذیت اگر ملی

چشمانِ تر نے فیض کا دریا بہادیا
اشکوں کا تار کیا بندھا سلک گہر ملی

مجھ ناتواں پہ نالۂ شب کا تھا اتہام
مشکل سے آج رخصتِ آہِ سحر ملی

دنیا کی حرص و آز سے اکتا گیا تھا دل
آخر عزیز فرصتِ زادِ سفر ملی

بہ سرپرستی

محترمہ بیگم نواب مہدی یار جنگ بہادر صدر المہام تعلیمات

شہاب

ناہید

٢

ناہید

نمبر	خورداد ۱۳۵۳ ف مئی ۱۹۴۴ء	جلد

۱۔ پریشانیاں۔ سعیدہ مظہر کی ہیں جن میں دنیا کی بحثیں چھڑ گئیں اور پھر وہی "دل میں کسی کے راہ جا رہا ہوں میں"

۲۔ اپریل فول۔ جمیل النسا نے بروقت لکھا کیونکہ مہینہ بھی تو اپریل ہی کا ہے۔

۳۔ لاٹری۔ ساجدہ زینت کا رمین نگارش ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ لاٹری ہمارے لئے نہایت دلفریب فریب ہے۔

۴۔ مصور کا راز۔ جمیلہ بیگم کا فسانہ ہے دلچسپ۔ آپ ہی بتائیے کہ سرخی کا راز کیا تھا اور کیوں دوسرے مصور حیران رہتے تھے۔

۵۔ صنف نازک۔ عورتیں بلیاں ہر ایک ہی سلسلہ کی کڑیاں ہیں اور آئندہ بھی رہیں گی۔

۶۔ مقولے۔ رحیم النساء نے بھجوائے ہیں یاد کر لیجئے کار آمد ثابت ہوں گے۔

۷۔ اچار۔ مسز اے فخر الدین نے بھجوایا ہے غالباً اس سے آپ کو دھوکا ہوگا کہ ہمارے کھانے کے لئے نہیں بلکہ اشاعت اور آپ سب کو تیار کرنے کے واسطے۔ اگر اچار آجاتا تو ہم اس کی نسبت کہہ سکتے کہ کیسا ہے؟ آپ تیار کیجئے اور ہمیں بھی بھجوائیے وعدہ کرتے ہیں کہ ناہید میں اس کے ذائقہ کا ضرور اعلان کریں گے۔

" ب "

پریشانیاں!!

سعید ظہیر ایم اے

(ابتدائی)

مسلسل بولے گئی اور میں مسلسل سوچے چلی گئی!

اس کیلئے پوچھنا جتنا آسان ہے میرے لئے سوچنا اتنا ہی آسان ہے، بولنا مجھے نہیں آتا۔ اور نہ اس بولنے کے مرض پر میرا دل نہ جانے کتنی ہزار بار کھول کھول کر رہ گیا ہے۔ اور میں باوجود ہزاروں کوششوں کے بھی بول نہ سکی۔ بات یہ ہے نہ معلوم کیوں مجھ سے جب کبھی بھی کسی سے بات کرنے کا موقع ہوتا ہے تو میری زبان بند ہو جاتی ہے کسی نے کچھ دیا، مزاج پوچھا۔ میرا کوئی کام کر دیا۔ اور میں؟

—— میں زبان بند! شکریہ میرے لبوں پر ہی سرد ہو کر رہ جاتا ہے، میں سوچتی ہوں کیا کہتا ہو گا وہ شخص کیسی عجیب لڑکی ہے نہ اس سے تشکر کے دو لفظ نکلے نہ چھوٹے منہ اس نے کوئی بات کی، تہذیب کا کوئی نشان نہیں۔

اس میں اور میں سوچتی ہوں میں ایسے ہی خیالوں کے لائق ہوں۔

دوستوں میں جب کوئی قہقہہ لگاتا ہے تو مسکرا دیتی ہوں، کیسی عجیب بات؟ آخر مجھ میں زندگی کیوں نہیں؟ کیوں میں بھی قہقہے نہیں لگاتی؟ کیوں قدرت نے میرے لبوں میں مہر لگا دی ہے؟ یہ کس گناہ کی پاداش ہے؟ خدا ہی اس راز کو سمجھ سکتا ہے

اوائل موسم گرما کی ایک گرم سہ پہر کمرے کے دروازے بند کرکے میں اور میری دو دوست بیٹھی دنیا کے حالات پر تبصرہ کر رہی تھیں۔ امتحان میں ڈیڑھ مہینہ رہ گیا تھا۔ اور ہم آپ بیتی سے زیادہ پر بیتی میں مصروف تھیں۔ گھوم گھام کر دنیا میں اب کوئی موضوع پر پہنچ سکتے ہیں تو وہ جنگ عظیم اور بے حسی ہے میری ایک دوست کا خیال تھا کہ جنگ بہت بری ہے اور دوسری کا خیال تھا کہ اچھا ہی ہوا جنگ ہو گئی ورنہ اس زندگی کی یکسانی سے جی الجھنے لگا تھا اور اس نے اپنے علمیت کے زعم اور اپنے بیان کے ثبوت میں ٹینی سن TEM YSOH. کا یہ شعر پڑھا۔

THEOLC ORDER CHAWG
OFLYIELDWIG FOLACE
TO HEW.
ANDCOOFWLFILS HIMS
ELFINMAWY WAYS.

زمانہ ایک ہی رنگت پہ جو نہیں قائم
کچھ اس میں مرضیٔ مشیت کو دخل ہے شاید

اور میں بیٹھی ان کے مباحثہ کو سُنا کی تازہ ویکلی میرے ہاتھ میں تھا اور آدھے صفحہ پر روم کے سارے شہر کا منظر تھا۔ اور نیچے کی طرف بمباری کرتے ہوئے طیارے اور شعلوں کی آغوش میں لپٹے ہوئے شہر تھے۔ اوپر کی تصویر میں زندگی اتنی خاموش پرسکون نظر آ رہی تھی کہ محسوس ہوتا تھا شائد کسی کو نیند آ گئی ہے یا مست۔ سرشار ہے نچلی تصویروں میں، درد، کرب، اذیت

اور بے چینی چھائی ہوئی تھی۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ موت
کے آتشیں آغوش میں ایک بے بس زندگی مچل رہی ہے
جسے ابھی بہت دنوں کیلئے زندہ رہنا تھا۔

میں سوچنے لگی میری دوستوں خنداں اور لرزاں
میں کتنا فرق ہے؟ خنداں کو جنگ پسند نہیں اس لئے
کہ اس کے اپنے ہونٹوں کی ہنسی کے گم ہو جانے کا اندیشہ
ہے اور لرزاں اسی خیال سے لرزاں ہے کہ اگر یہ جنگ
نہ ہوتی تو نہ جانے اور کیا ہو جاتا ہے، جو کچھ ہوتا ہے
اچھا ہی ہوتا ہے۔ مشیت ایزدی کبھی غلطی نہیں کرتی
اور میں سوچ رہی تھی کہ کاش اتنا ہوتا کہ زندگی کو
جس طرح ہم بنانا چاہتے ہیں بنا سکتے؟ زیادہ بڑی دنیا
کی ہمیں خواہش نہیں۔ چھوٹی سی اتنی دنیا درکار ہے
جس میں صرف ہم ہی ہم ہوں۔ وہ دنیا سکون اور شانتی
کا مندر ہو اور صرف اپنی "ہو"۔

لرزاں برابر بولے چلی جا رہی تھی۔ اسے بولنے
میں خدا جانے کیا مزہ آتا ہے گھڑی بھر کو اس کی زبان
نہیں رکتی اور یہ بھی نہیں کہ وہ کچھ سوچتی نہیں وہ
سوچتی ضرور ہے مگر جتنا بولتی ہے اتنا ہی سوچتی کم ہے
اور میں اس کے برعکس ہوں۔

لرزاں کہنے لگی، یہ دنیا کتنی خراب ہے اور اس میں
آج کل کتنی برائیاں پھیل رہی ہیں۔ سانپ کے زہر کی
طرح! اس کا تریاق ہمیں کہاں ملے گا؟ آخری کون سا
مقام ہے جہاں امن اور شانتی مل سکتی ہے۔ جہاں ہمارا
یہ بے چین دل ہے جہاں ہماری یہ بے کیف زندگی، جہاں ہماری
یہ افسردہ خاطری، سکون اور کیف سے معمور ہو سکتی ہے؟
رات کو نیند نہیں آتی۔ دن کو بھی نہیں لگتا ہے، کام کرنے
کو دل نہیں چاہتا۔ ہم آخر کیا کریں؟ تم ہی بتاؤ سلمیٰ
آخر ہم کیا کریں؟ آج کل صحت بیٹھے رہی ہے، اور تمام جسم میں
جیسے ہزاروں کانٹے چبھائے جا رہے ہیں، آخر ہم کیا کریں
آج کل موت کس قدر یاد آتی ہے، کاش اسے ہم پر رحم آتا

ایک دم سے میں چونک پڑی، موت؟ سچ کہتی
ہوں، لرزاں مجھے مرنے کی سب سے بڑی خواہش ہو رہی
تھی۔ مگر صبح میں نے آخر دیکھ ہی لی!

خنداں ہنسنے لگی، اسے ہنسی کے سوائے اور کیا
کام آتا ہے، شاید یہ اس کے سن کا تقاضا ہے، وہ ہم دونوں
سے کافی چھوٹی ہے۔ کہنے لگی تو سلمیٰ خودکشی کر لو، در
اصل تم کو مرنے کی خواہش نہیں دنیا کے افکار آت
سے تم ڈرتی ہو اور محض دنیاوی مصیبتوں سے ڈر کر مرنے
کی آرزو کرنا سب سے بڑی بزدلی ہے۔

مجھے اس کی تنقید بری لگی۔ گو دل نے کہا سچ
ہے۔ لیکن میں چپ رہی اور اس نے جواب نہ پاکر
مایوسی کا اظہار نہ کیا۔ اسے میری عادت کی کافی عادت
لرزاں پھر سے حرف بار ہوئی، کہنے لگی یہاں کے
ماحول سے دم بڑا گھٹتا ہے، آؤ چلو سلمیٰ ہم اپنی دنیا
آپ الگ آباد کریں، ایک آئیڈیل (IDEAL)
درس گاہ حیات بنائیں گے اور اسے دنیا کی آلائشوں

پاک رکھیں گے۔ اُف! میں سوچتی ہوں آخر ہم بھی تو انسان
ہیں ہمیں ایسی باتیں کیوں نہیں آئیں؟ ہمارا دماغ ان
باتوں تک کیوں نہ پہنچا؟" اور ــــ باتوں باتوں میں
ہم جنسیات تک پہنچ گئے۔

لرزاں کہنے لگی، ماحول کے تصور سے جنسیات کا
غلط تصور بچوں کے دماغ میں بیٹھ جاتا ہے اور وہ بڑے
ہو کر اپنی "کھوج کی قوت" کا آزادانہ استعمال کرتے ہیں
انہیں روکو تو یہ عادت اور بڑھ جاتی ہے۔

خنداں ہنسنے لگی: سب فطرتی طریقے پر جنسیات سے
واقف ہیں۔ سست دماغ کچھ نہیں کرتے تیز فطرت ہر
بات میں آگے ہو جاتا ہے۔ تمہارا زمانہ دماغی بیداری کا
نہ تھا۔ اب دماغ بہت ترقی کر رہا ہے آگے بچے ماں کے
پیٹ سے یہ احساس لئے پیدا ہوں گے........

مجھے ہنسی آگئی ــــ اور اب شائد تم ان میں
یہ احساس پیدا کرتی ہو؟

بھئی مجھے نہیں معلوم، مجھے لمبی چوڑی تقریریں
کرنی نہیں آتیں، تم جانو اور تمہاری عقل، بابا اتنی موٹی
عقل ہے اتنی سی بات بھی اس بڑے دماغ میں نہیں سماتی
ــــ اور دیکھتے دیکھتے اس کا غصہ ہنسی میں بدل
گیا۔

لرزاں کو غصہ آچکا تھا، اس کے گال اور سرخ
ہو گئے تھے۔ ہونٹوں پر سرخی غضب کی آگئی تھی میں نے
سب کچھ بھول کر گنگنانا شروع کیا۔ ــہ

ہونٹوں سے لہو سا جاری   آنکھوں کے پپوٹے بھاری!

اور دیکھتے دیکھتے لرزاں اور خنداں پھر سے ترنم
میں کھو گئیں نہ انہیں دنیا کا خیال رہا نہ جنگ کا نہ ہی
جنسیات کا۔ اور میں نے اس گرم دوپہر کو ایک ٹھنڈک
اور سکون سے بھر دیا اور پھر ــــ ندیم کی اس نظم کے
بعد اقبال کی تیز تیز نظم ــہ

صورت نہ پرستم من   بت خانہ شکستم من

اور پھر جگر کی غزل ــہ

"دل میں کسی کے راہ کئے جا رہا ہوں میں"

فرمائش پر فرمائش ہونے لگی اور موسیقی کے دھاروں میں
ساری پریشانیاں گم ہونے لگیں۔ کمرہ ہنسی سے گونج رہا تھا
مسرت سے مہک رہا تھا اور آنکھوں کی تیز تیز روشنیوں سے
جگ مگ جگ مگ کر رہا تھا دنیا اور اس کی فکر کے بندھنوں
سے آزاد ہم اپنی ایک الگ دنیا میں کھوئے ہوئے تھے کہ

ٹننن ٹننن ٹن ٹن ٹن ٹن !!!

کی بے ہنگم آواز نے جیسے سر پر ہتھوڑے چلا دیئے۔
چھٹی کی گھنٹی بج رہی تھی اور ہم پھر سے پریشانیوں کی دنیا
میں گھسیٹ کر لائے گئے تھے۔ خنداں حسب معمول ہنسی
ہنس کر وداع ہو رہی تھی۔ لرزاں لندن پر بمباری اور
بنگال کے قحط کا ذکر کر رہی تھی اور میں حسب معمول خاموش
سوچ رہی تھی زندگی کیا ہے کتنی عجیب پریشانیوں کا عنوان

ــہ زندگی کیا ہے عناصر میں ظہور ترتیب
موت کیا ہے انہیں اجزا کا پریشاں ہونا

اپریل فول

اس نے کاغذ کو تہہ کر کے لفافہ میں رکھ لیا۔ اس کے چہرہ پر خوشیاں ناچ رہی تھیں۔ آنکھوں سے مسرتیں ٹپکی پڑتی تھیں، رگوں میں مسرت سے لبریز خون موجیں مار رہا تھا دل کی ہر دھڑکن کے ساتھ شادمانی کی ایک لہر اٹھتی تھی۔ ہونٹوں پر تبسم لہرا رہا تھا غرض وہ بہت خوش تھی کیونکہ اس کا چار سال کا بچھڑا ہوا رتن آج اس سے ملے گا جو اس کے ارمانوں کی کھیتی کشت آرزو اور تمناؤں کی جان تھا وہ خوشیوں کے بے پناہ ساگر میں بہی جا رہی تھی آج اس کے زندگی کے باغ میں بہار آئی ہوئی تھی مسرت اور خوشیوں کے ملے جلے سیلاب کو اس کا ننھا سا برابر دل سہار نہ سکتا تھا۔ وہ اٹھی نمبر ملا کر ریسیور ہاتھ میں لیا "ہلو..... ہاں میں ہوں مس شانتا... ...... تھوڑی دیر کیلئے تم یہاں ہو جاؤ... لیکن کب آؤ گی..... چار بجے..... لیکن مجھے چار بجے کہیں جانا ہے..... یہ تو تمہارے آنے پر بتایا جائیگا ...... دس منٹ سے..... تھینک یو..... گڈ بائی"..... اس نے ریسیور رکھ دیا اور کمرے میں ٹہلنے لگی وہ خوشیوں کے اتھاہ ساگر میں ڈوب ڈوب کر ابھر رہی تھی وہ اپنے دل میں سیکڑوں ارمانوں کو کروٹیں بدلتے محسوس کر رہی تھی وہ سوچ رہی تھی۔

..... "انہیں خوب ستاؤں گی چار سال تک انھوں نے جو مجھے ستایا" وہ روٹھ جائے گی وہ منائے گا..... تمام مسرتیں اس کی زبان سے نغمہ بن کر نکلنے لگیں وہ گا رہی تھی ؏

میرے جیون کی بگیا میں آئی بہار

وہ عالم بیخودی میں گائے جا رہی تھی ...... پیچھے سے کسی نے اس کی آنکھوں پر ہاتھ رکھ دیا وہ چونک پڑی..... "اوہ آگئیں تم....." کہتے ہوئے رادھا کے گلے میں باہیں ڈال دیں "آج بڑی خوش ہو" رادھا نے ہنستے ہوئے کہا۔ لیکن خوشیوں کے امنڈتے ہوئے سیلاب نے اس کو کچھ کہنے نہ دیا ... بغیر ارادی طور پر اس کے ہاتھ خط کی طرف بڑھے ...... اور دوسرے لمحہ میں خط رادھا کے ہاتھ میں تھا..... "رتن بابو کا خط..." "ارادہ" نے تحیر آمیز لہجہ میں کہا اور خط پڑھنے لگی:—

ڈیر مس شانتا! نمستے!

میں کل ہی کشمیر سے آیا ہوں اور

جمیل النساء بیگم

وکٹوریا ہوٹل نمبر (۴) میں مقیم ہوں ..... پتاجی بھی ساتھ ہیں امید کرتا ہوں کہ پچھلے واقعات کا خیال چھوڑ کر آج شام چار بجے مجھ سے

آملوگی... چند ضروری باتیں کہنی ہیں ـــــ مفصل حالات ملاقات پر۔

دیدار کا طالب

تمہارا رتن

"تو پھر لاؤ مٹھائی" رادھا نے خط میز پر رکھتے ہوئے کہا "سیٹھ موہن داس ضرور بیاہ کے متعلق کہنے آئے ہوں گے۔ کیا اچھا ہو اگر چاچا جی تمہاری سگائی رتن بابو سے کر دیں"۔

"تمھیں کیوں کر معلوم ہوا" شانتا نے ناخن سے میز کریدتے ہوئے پوچھا۔ "کمار بابو کو تم جانتی ہی ہو نا ـــــ کہہ رہے تھے کہ سیٹھ صاحب چاچا جی سے بیاہ کے متعلق کہنے آنے والے ہیں" رادھا بولی ـــــ

رادھا سے یہ سُن کر اس کی خوشیوں کی کوئی انتہا نہ رہی آنچل سنبھالتے ہوئے بولی :-

"تم بھی میرے ساتھ چلو ـــــ تنہا جاتے ڈر لگ رہا ہے...." شانتا نے یہ کہنے کو تو کہہ دیا لیکن گھبرا رہی تھی کہ کہیں یہ سچ مچ اس کے ساتھ نہ ہو جائے کیونکہ وہ تنہا جانا چاہتی تھی۔

"گھبراؤ نہیں میں دونوں کی خلوت میں دخل انداز ہونا نہیں چاہتی" رادھا نے تاڑتے ہوئے کہا۔

"توبہ تم تو بڑی شکی ہو اگر ایسا خیال ہوتا تو میں تمھیں چلنے کیلئے کہتی ہی کیوں" شانتا نے جھینپتے ہوئے جواب دیا "اچھا اب اجازت دو"۔ رادھا کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا "اچھا خدا حافظ" رادھا چلی گئی وہ اٹھی لباس تبدیل کیا بال بنانے میں صناعی دکھلائی۔ چہرے پر کریم مل رہی تھی کہ آیا کی آواز آئی وہ جلدی جلدی بیاگ سنبھالتے ہوئے کار میں جا بیٹھی...

..... کار اپنی پوری رفتار کے ساتھ وکٹوریا ہوٹل کا راستہ طے کر رہی تھی۔ اور اس کا دماغ موٹر سے کہیں زیادہ تیز رفتاری سے کام کر رہا تھا۔ کار وکٹوریہ ہوٹل میں جا کر رکی شانتا اپنی پوری رعنائیوں کے ساتھ کار سے اتر کر سیڑھیاں چڑھنے لگی........

"کیا کمرہ نمبر (۲۸) میں رتن بابو ہیں" اس نے ہوٹل کے ملازم سے دریافت کیا۔ ملازم نے کوئی جواب دئے بغیر ایک رقعہ اپنی خاکی قمیص کے جیب سے نکال کر شانتا کے ہاتھ میں دیدیا۔ اس نے حیرت سے ملازم کو دیکھتے ہوئے لفافہ لے لیا۔ اس کے چہرے کے زیر و بم کی جھلکیوں سے یاس و امید جھانک رہی تھی۔ لفافہ چاک کیا لکھا تھا۔

FIRST. APRIL FooL.

وہ ابھی کچھ سوچنے بھی نہ پائی تھی کہ پیچھے سے قہقہوں کی لطیف آوازیں گونجیں۔ جوں ہی اس نے مڑ کر دیکھا رادھا اور پریا کھڑے ہیں۔ اب اسے معلوم ہوا کہ یہ سارا کیا دھرا انہی کا ہے اسے خوب غصہ آیا۔ اس کی خوشیوں کو کچلنے والوں پر۔ رادھا کتنی بھولی بن کر آئی تھی ـــــ چاہتی تھی کہ خوب ڈانٹ دے۔ لیکن غصہ کرنا تہذیب کے خلاف تھا اور سوسائٹی میں سُبکی کا باعث

—— بہ مشکل آتش غضب کو روکا۔ مگر باوجود کوشش کے ان کے ساتھ وہ قہقہہ نہ لگا سکی صرف ایک تلخ تبسم اس کے لرزتے ہوئے لبوں تک آسکا۔

مقولے

۱۔ دنیا ایک ضخیم کتاب ہے جو لوگ گھر سے باہر قدم نہیں نکالتے وہ اس کتاب کے صرف ایک صفحہ پر ہی اکتفا کر لیتے ہیں۔ (آگسٹائن)

۲۔ صبح کا ایک گھنٹہ کھونا سارا دن ضائع کرنے کے مساوی ہے۔

۳۔ دیانت دار اور راست باز تاجر کے لئے گاہکوں کا کال نہیں ہوتا۔

۱۔ کم فاصلے کے سفروں کے سوا مستقبل میں بڑے درجوں کے مسافروں کے سفر ہوائی راستوں کے ذریعہ طے پایا کریں گے۔ (انتھونی فوکر)

۱۔ ہر موقع ایک برائی سے تغافل سو برائیوں کو دینا ہے۔ (بیکن)

۲۔ جس شخص کی زندگی ہمیشہ اس کے وطن کی چار دیواریوں ہی میں مقید گزاری ہے سمجھو کہ وہ تعصبات کا خزانہ ہے۔

۳۔ بیوپار میں [illegible] جہاں سونا کمانے کی امید رکھو وہاں [illegible] کوڑیاں قبول کرنے سے بھی کبھی نہ ہچکچاؤ۔

۱۔ خلق اور مروت کے برتاؤ سے زیادہ قیمتی کوئی شئی نہیں۔ (سروینٹس)

شہاب اور ناہید کے

۱۔ معاونین براہ کرم کوئی پرچہ اندرون ۵ تاریخ نہ ملے تو مکرر طلب کر لیں کیونکہ جب کبھی پرچہ نہ ملنے کی شکایت ہوتی ہے تو ہمیں رنج ہوتا ہے کہ باوجود احتیاط کے پھر بھی پرچہ نہ ملا۔ اس میں کچھ تو آپ کے ملازمین اور کچھ ڈاک خانہ کی سہو ہو سکتی ہے۔ اس لئے وقت پر آپ مطلع کریں تو ہم سررشتہ ڈاک سے اس کی نسبت درخواست کریں گے جب آپ خاموشی اختیار کر لیں اور تین تین مہینوں کے بعد لکھیں کہ فلاں مہینہ کا پرچہ نہیں ملا تو فرمائیے کہ دفتر کہاں سے آپ کی فرمائش کی تکمیل کر سکیگا۔

۲۔ تبدیل پتہ سے بھی وقتاً فوقتاً مطلع کیجئے ورنہ آئندہ پرچہ نہ ملنے کی شکایت سے ہم اپنے آپ کو معذور پائیں گے۔ کیونکہ دفتر سے پرچہ نہایت احتیاط سے بھجوایا جاتا ہے۔

۳۔ [illegible] میں [illegible] خط [illegible] لکھے جائیں ورنہ غلطی کا احتمال ہے۔

لاٹری

زینت ساجدہ

بچپن میں انّا سے سن رکھا تھا کہ ویرانوں میں بعض چڑیلیں اور بھتنے ایسے بھی بستے ہیں جو معصوم بچوں کا کلیجہ نکال کھاتے ہیں اور خون پی لیتے ہیں، اس نے تو شاید یونہی ڈرانے کے لئے یہ بات کہہ دی ہوگی تاکہ میں اور بھائیوں کے ساتھ اِدھر اُدھر پہاڑ کے دامن میں اور کھنڈروں میں پھیرے نہ لگاؤں۔ لیکن اب سوچتی ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس نے انجانی ہی میں بہت بڑی بات کہہ دی تھی۔ اگر میں ویرانوں کا لفظ نکال دوں اور اس جگہ آبادی کا لفظ لگاؤں تو شاید یہ کہنا ہم پر بالکل صادق آجائے۔ تہذیب حاضر نے معصوم انسانوں کیلئے کئی ایسے خوفناک بھتنے بنائے ہیں جو چپکے چپکے سے ان سے انسانیت چوس لیتے ہیں۔ پھر بھی ہم انہیں بھتنے نہیں کہتے۔ یہی تو کمال ہے ہمارا۔

انہی چیزوں میں جو ان بھتنوں کی قایم مقام ہیں۔ ایک لاٹری بھی ہے۔ دیکھنے میں تو اس میں سرتا سر فائدہ ہی فائدہ ہے۔ ایک روپیہ کا ٹکٹ خرید و تو شاید ہزار نکل آئیں قسمت والوں نے تو لاکھوں پائے ہیں۔ لیکن لفظ ”قسمت“ کو کچھ اس طرح بگاڑ گیا ہے کہ بس۔ جواری بھی قسمت پر بھروسہ رکھتا ہے۔ وہ داؤ لگاتے وقت خدا کی مدد چاہتا ہے۔ شرابی خدا کی قسم کھاتا ہے اور قسمت کو روتا ہے۔ گویا ہر جائز و ناجائز کام میں قسمت کا دخل ضرور ہے اور اسی طرح یہ چھپر پھاڑ دولت کے منتظر ”لاٹری“ کے ٹکٹ کو بھی قسمت کا پروانہ سمجھتے ہیں اور اس طرح اپنے گاڑھے پسینہ کی کمائی صرف مفت کی دولت کی خواہش میں کھو بیٹھتے ہیں۔ اکثر تو ایسا ہوتا ہے کہ اپنی گرہ کا بھی کھو بیٹھتے ہیں۔ لیکن وقت خواہ خوش قسمتی کہئے یا بدقسمتی کہ یہ مفت کی دولت ہاتھ آجاتی ہے۔ پھر تو بس ایسی چاٹ لگ جاتی ہے کہ یہ سرتا پا لاٹری کا ٹکٹ بن جاتے ہیں۔ اور اس وقت تک عقل نہیں آتی جب تک کہ یہ پانے کی امید میں سب کچھ کھو نہیں بیٹھتے۔ ایسے واقعات تو آئے دن سننے میں آتے ہی رہتے ہیں کہ فلاں نے گھڑ دوڑ کے پیچھے اپنی لٹیا ڈبوئی۔ فلاں نے سٹہ میں سب بازی ہاری۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ہمارے گھر کے قریب ہی ایک خاندان آکے بس گیا۔ سارے گھر والے سیدھے شریف قسم کے انسان تھے۔ لیکن تھے نہایت مفلوک الحال۔ ہم سب اسکول اور کالج کو جا چکتے تو گھر میں سوائے امّی کے اور کوئی نہیں رہ جاتا۔ تو وہ پاس پڑوس کی عورتوں کو دل بہلانے کے لئے بلا لیتی ہیں اور پھر دنیا بھر کے قصے ہوتے رہتے ہیں۔ اس گھر کی بھی ایک بڑھیا آنے جانے لگی

بیچاری وقت سے پہلے زمانے کے ہاتھوں بوڑھی ہو چلی
تھیں۔ وہ گھر کا کام کاج بھی کرتیں۔ اور امی کا دل بھی
بہل جاتا۔ لیکن ان کے چہرے سے ایسے لگتا کہ وہ بھی ضرور
کبھی نہ کبھی ہزاروں کی مالک رہ چکی ہیں۔ اور باتیں وہ
اتنے دلچسپ کرتیں کہ جی بالکل نہ چاہتا کہ ان کی باتیں
کبھی ختم بھی ہوں۔ جب ہم سبھوں نے بہت اصرار کیا
تو سنایا کہ وہ جاگیردار کی بیٹی اور جاگیردار کی بہو تھیں،
خوشحالی کا زمانہ بھی دیکھا ہے۔ لیکن قسمت کو یہ رنگ بھی
دکھانا تھا۔ جب ان کے میاں کے ہاتھ جاگیر آئی تو انھوں
نے سب جوئے اور شراب کے بھینٹ چڑھا دی۔ گھڑ دوڑ
کا تو بس خبط تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کوڑیوں کے محتاج ہو گئے
جوانی کی بے راہ روی نے صحت بگاڑ دی۔ خدا نے بچے
بھی بہت دے رکھے ہیں اور بری طرح گزر کر رہی ہے
لیکن بیٹیوں کی شادی کرنی ہے جس کا غم مارے ڈالتا
ہے۔ کہ کیا کریں۔ ہم سب کو ان کا قصہ سن کر بہت ہی افسوس ہوا
امی کو تو بےحد رنج ہوا۔ انھوں نے ان کی مدد کرنے کی
حامی بھر لی۔ اپنے ملنے والوں میں تذکرہ کیا غرض کسی
طرح ان بیچاری کی بچیوں کے لئے پیام ٹھیک کیا۔ اور
شادی کے سامان کے لئے دوسو روپئے بھی کسی طرح
امی نے اپنے پاس سے دیئے اور ہم سب بےحد خوش تھے
کہ اس طرح ایک شریف خاندان کی شرافت رہ جائیگی
لیکن اُف کیا بتاؤں اس دن ہم سب کا کیا حال ہوا جب
دوسرے یا تیسرے ہی روز وہ بڑھیا چیختی روتی ہمارے
گھر آئی اور بہت زاری سے رونے لگی۔ ہم نے واقعہ دریافت
کیا تو معلوم ہوا کہ اس نے دوسو روپئے بھی کر اپنے
شوہر کو دئے تھے کہ شادی کا سامان کر لے۔ لیکن اس نے
اس سے کسی لاٹری کا ٹکٹ خریدا ہے۔ ہم سب حیران کہ
اللہ یہ معاملہ کیا ہے۔ بھائی میاں نے جاکر دریافت
حال کیا تو معلوم ہوا کہ اس لاٹری میں پچیس ۲۵ ہزار کا انعام
ہے اور اس نے قسمت پر بھروسہ کر کے ٹکٹ لے لئے کہ
اگر انعام مل جائے تو بچیوں کی شادی اچھی طرح ہو جائے
اور پھر بقیہ عمر بھی چین کی بنسی بجے۔ ہماری سمجھ میں نہ
آیا کہ کیا کریں۔ اس بیوقوفی پر ہنسیں کہ روئیں۔ اب
کیا ہوتا۔ پیام وغیرہ تو ٹوٹ گیا۔ اور جب ایک ادعا
نتیجہ نکلا تو یہ اپنے گرہ کا بھی کھو بیٹھے تھے۔ کہاں کا
کدھر کی دولت۔ جب بھائی میاں نے ان صاحب کو
ملامت کی تو کہنے لگے "میاں انھیں ہاتھوں سے ہزاروں
لٹا چکا ہوں۔ ان دوسو کی کیا حیثیت زندہ رہا تو آپ کا
قرض دے دوں گا۔" ہم سب کو بےحد رنج ہوا۔ اور پھر ہم
نے کبھی ان کی بھلائی کی کوشش نہ کی۔ وہاں تو ہر چیز
کہ "در کان نمک رفت نمک شد"۔ والا معاملہ تھا۔
پھر نہ جانے وہ سب کہاں چلے گئے۔ اور ان کے گھر والوں
کا کیا حشر ہوا۔ ایسے کمبخت اپنے ساتھ دوسروں کو
بھی لے ڈوبتے ہیں۔

کبھی معلوم ہوتا ہے کہ کسی نے لاٹری میں انعام
پایا۔ اور چونکہ مفت کی دولت ہاتھ آئی۔ اس لئے

خوب دادِ عیش دینے لگے - پھر تو ایسا دولت کا چسکا پڑا کہ عمر بھر کو رذالت کے غلام بن گئے - کبھی ایسا ہوا کسی کنگلے کو انعام ملا اور اوس نے توازن دماغ کھو دیا اور جانے کتنے ایسے ہیں جو آس آس ہی میں سب کچھ کھو دیتے ہیں -

یہ لاٹری شاید روزِ ازل بھی موجود تھی کسی کی قسمت میں رونا ملا کسی کو ہنسنا - یہ لاٹری سرمایہ داری کی ایک کڑی ہے جو روپیہ لوٹنے والوں کو دن دھاڑے روپیہ لوٹنے کا موقع دیتی ہے - اور سادہ لوح جاہل اس کا شکار ہو جاتے ہیں -

یہ دنیا ہے - یہ انسان اپنے لئے آپ ہی ہتھکڑیاں بنواتے ہیں اور پہن کر خوش ہوتے ہیں کہ یہ زیور ہے -

اور شائد یہ میرے قسمت کی لاٹری تھی جو خدائے تعالیٰ نے مجھے دنیا کے اس مکر و فریب بھرے دَور میں جنم دیا - لیکن دنیا میں کب یہ چیزیں نہیں ہیں اور پھر اپنا سراپا بھی تو ایک مکر و فریب ہے اس کے سوا اور ہو بھی کیا سکتی ہے ؛

مرد ......

جب کوئی مرد یہ کہے کہ اُس نے عورتوں سے بالکل قطع تعلق کر لیا ہے تو اس کا مطلب عموماً یہ ہوتا ہے کہ اس نے کسی ایک عورت سے تعلقات توڑ دیئے ہیں بعض مرد اتنے کمینے ہیں کہ وہ محض شادی کر لینے کا وعدہ کر کے خود کو اس بات کا حقدار سمجھنے لگتے ہیں کہ غیر معمولی گہرے تعلقات قایم کر لیں -

سگائی پھر توڑ دی جا سکتی ہے ـــ بعد میں !

ہر ایک مرد سے جس قدر ممکن ہو سکے حاصل کرو - ـــ پھر بھی تم کو نسبتاً کم ہی وصول ہوگا -

مرد کتے کی طرح ہے اگر تم اس کا پیچھا کرو تو وہ بھاگ نکلے گا ، اگر تم خاموش رہ کر اس سے گریز کرو تو وہ تمہارے قدموں پر آ گرے گا -

لیکن مرد نہایت کار آمد ہیں ، وہ تم کو لذیذ کھانے کھلاتے ہیں ، اعلیٰ تماشے دکھاتے ہیں اور تمہارا وقت نہایت اچھی طرح بتاتے ہیں ، اور اگر معاوضہ کے طور پر وہ بہت کچھ کی توقع کریں تو ـــــــ

کیا تم یہ امید کر سکتی ہو ایک عمدہ لباس دام دیئے بغیر خرید لو ؟

میں اس نتیجہ پر پہنچ چکی ہوں کہ اس دنیا میں کسی ایک نیک آدمی کی محبت سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں -

لیکن یہ نایاب ہے !

جس قدر تیزی سے مرد اپنا دل کھو بیٹھتے ہیں اس سے بڑھ کر تیزی صرف ایک ہی امر میں واقع ہو سکتی ہے -

اپنا دل واپس پانے کا امر -

کسی سرخ بالوں والے مرد کا اعتبار نہ کرو -

درحقیقت کبھی بھی کسی مرد کا اعتبار نہ کرو -

مصور کا راز

اگلے وقتوں میں ایک چابکدست ماہر فن مصور تھا ——— اس کی بوقلموں کی سحر کاریاں ہمیشہ اس کے ہمعصر مصوروں کو حیرت میں ڈال دیتیں اس لئے کہ وہ تصویروں پر جب رنگ آمیزی کرتا تو اس میں غیر معمولی چمک دمک اور ملکوتی شان نمایاں ہوتی خصوصیت سے ارغوانی رنگ کی آمیزش جہاں ہوتی وہاں حقیقی سرخ خون کی کشش نظر آتی۔ یہی اس کا طغرائے امتیاز تھا۔ وہ تصویروں کے خم کھائے ہوئے سرخ ہونٹوں پر ایک ایسی دل آویز مسکراہٹ پیدا کر دیتا۔ گویا مسرت قربان ہو رہی ہے اس کی تقلید میں دوسرے مصوروں نے بھی بھڑکیلی اور شوخ رنگت کا انتخاب لازمی کر رکھا تھا۔ مگر اس فطرتی مصور کے ہاں خون آشام سرخ کو سب سے زیادہ فوقیت حاصل تھی اس کی نقاشی کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ سرخ اور چمکیلی ہوتی ——— ایک خاص چمک اور روغن۔ اس کے تصویروں کی مانگ بھی زیادہ تھی۔ نقادانِ فن جب اس کی کوئی نئی تصویر پر اظہار رائے کرنا چاہتے تو ان کی آنکھوں میں ایک چمک پیدا ہو جاتی وہ اس رنگین فضا میں کھو جاتے اور تیز قدم ٹہلنے لگتے۔ فن کارانہ حیثیت سے وہ تنقید کرنا چاہتے تھے۔ مگر اس کی رنگینیوں میں کھو کر رہ جاتے حسن کی فراوانی ہر ایک کو دعوت نظارہ دیتی۔ کہتے تو یہی کہ آدم ہم تو بس اسی مصور کی تصویر کو پسند کرتے ہیں۔ واللہ یہ چمک کسی اور تصویر میں نہیں۔

اب دوسرے مصوروں کو یہ سودا سوار ہوا کہ آخر یہ چمکدار رنگ کہاں سے اڑا لاتا ہے۔ کئی مصوروں نے ہمت کر کے خود اس سے دریافت کیا تو وہ ایک پر معنی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا کہ یہ میں نہیں بتا سکتا اور سر جھکا کر کام میں مصروف ہو گیا۔ وہ لوگوں کی تعریف میں اپنی آرزو کی تکمیل ہوتے دیکھکر خوشی سے پھولا نہ سماتا ایک ہمعصر نے دور دراز چین کا سفر کیا۔ کیونکہ چین کی مصوری ازمنۂ قدیم میں بے مثال مانی جا چکی تھی چنانچہ وہ چین سے رنگ و روغن خرید لایا تاکہ اپنی تصویروں کو مصور مذکور کی تصویروں سے زیادہ چمکدار اور حیات آفرین ثابت کر دکھائے۔ مگر صد حیف کہ اس کی رنگ آمیزی بھی اس کے آگے ماند رہی۔ اس کی حسین دوشیزہ طلوع آفتاب کے حسین پس منظر میں ایک رقصاں شعلہ نظر آتی تھی۔ برعکس اس کے چینی رنگ رنگینی شفق کو تمام و کمال آشکارا کرنے سے قاصر تھا۔ کئی مصوروں نے قدیمی نسخوں

جمیلہ بیگم (کلکتہ)

رنگ تیار کرایا۔ اور اس پر صرفِ کثیر کے بعد آزمائش
کی لیکن یہ بھی پھیکی رہی۔

مصور رنگین تصاویر بناتا رہا ــــ نئی نئی تصویریں
ــــ اس میں ارغوانی رنگ کچھ ایسی چمک دمک اور تیزی
سے نمایاں ہوتی گئی۔ گویا شفق کی تمام شہابی رنگینیوں
کا خزانہ اس نے چرالیا تھا۔

باکمال مصور کی شرمندہ احسان تصویریں اپنی
تمام رعنائیوں کے ساتھ جلوہ افروز ہوتی۔ ہر شخص بالخصوص
تمام مصور جب کبھی آرٹ کی نمائش میں اس کی کوئی تصویر
دیکھ لیتے تو رشک سے مرجاتے نہ معلوم اس کا پُرزور
تخیل حسن کی ان دل آویزوں تک کیونکر پہنچ جاتا۔ وہ
مرقع حسن و جمال پیش کرنے میں ید طولیٰ رکھتا تھا۔ اس قدر
کامیابی کے باوجود مصور دن بدن دُبلا اور زرد نظر
آنے لگا۔ حالانکہ فطرت کی رعنائیوں کا شیدائی اپنی حسن
کاریوں سے اور بھی شاداں اور فرحاں نظر آتا ــــ
البتہ اس کو اپنی اس پُراسرار رنگ آمیزی پر ناز تھا۔
وہ ایک عالمگیر شہرت کا مالک ہوچکا تھا۔ اس کے باوجود
اپنے نگارخانہ اور آرٹ گیلری سے باہر بہت کم ہی نکلتا۔

کبھی ایسا ہوتا کہ وہ کسی حسین پس منظر کی دلکش
رنگ آمیزی میں مصروف ہوتا۔ اور نیچے باغ کے کسی
پرانے پیڑ سے بدنصیب بلبل کی نوحہ خوانی کی دل دوز
صدائیں آنے لگتیں وہ اپنا موقلم وہیں پھینک کر دریچہ
سے جھانکنے میں مصروف ہوجاتا۔ آہ پیاری بلبل! کبھی
آفتاب کے خونیں شفق سے وہ متاثر ہو کر دیر تک
کھڑا افق میں غروب ہونے والے آفتاب کا آخری منظر
سمندر کی پانیوں پر دیکھا کرتا۔

آخر کار ایک دن ــــ آہ ایک دن
مصور اپنے ایک حسین نامکمل شاہکار کے آگے مردہ
پایا گیا۔ افسوس اس کی خاموش تمنائیں! اس کی آرزوئیں
اس کے ساتھ مدفون ہوگئیں۔ اس کی شوخ رنگ آمیزی
کا راز بھی اس کے ساتھ ہی گیا۔ لیکن تصویر کشی کے
عاشق اُس کے نھنے سے نگارخانہ کے کونے کونے اور
چپّے چپّے کو رنگتوں کی تلاش میں چھان مارا۔ مگر وہاں
وہ سب کچھ موجود تھا جو ان کے پاس بھی تھا کوئی خاص
اور شوخ رنگ یا رنگوں کا نسخہ ان کی متجسس نگاہوں
نے نہیں نکالا۔ آخر مایوس ہو کر سب خاموش ہو رہے۔

جب مصور کے بیجان جسد خاکی کو آخری غسل
دلانے کے لئے غسال نے برہنہ کیا تو اس کی بائیں چھاتی
پر عین دل کے پاس ایک گہرا زخم نظر آیا ــــ
یہ بہت ہی کہنہ زخم تھا ــــ شائد تمام عمر اس کی چھاتی
پر یہ زخم رستا رہا ہوگا۔ کیونکہ اس کے چاروں طرف
جلد سخت اور کنارے بالکل سیاہ اور گہرے ہوچکے تھے
ــــ لیکن موت! ہاں موت جو ہر چیز پر مہر ثبت
کر ڈالتی ہے۔ اس کہنہ زخم کے دونوں کناروں کو باہم
کھینچ کر ملا چکی تھی اور کبھی کا یہ عمیق زخم اب بند ہوچکا
تھا ــــ

اس کی آخری آرام گاہ ایک ویران جگہ تھی جہاں سرہانے گلاب کے پیڑ پر بلبل نوحہ خوانی کرتی۔ لوگ پس مردن بھی از راہ تجسس یہی کہتے رہے کہ نہ معلوم وہ ایسا شوخ ارغوانی رنگ کہاں سے لاتا تھا۔

مدتیں گذر گئیں اس جانہار مصور کو لوگ بھول بسر بھی گئے ــــــ لیکن اس کی نقاشی کے حسین کارنامے دوامی شہرت حاصل کرتے رہے ؛

(۳)

صنف نازک

عورت ایک روحانیت ہے قابل لمس نورانیت ہے۔ صاحب نطق ایک روشنی ہے جسے ہم چھو سکتے ہیں۔ ایک نکہت و رنگینی ہے جس سے ہم گفتگو کر سکتے ہیں۔ ایک حلاوت ہے جو ہاتھوں سے چکھی جاتی ہے۔ ایک موسیقی ہے جو آنکھوں سے سنی جاتی ہے۔

عورت داستان شوق تمنائے رنگین ہے مگر آہ کس قدر بے مزہ ہو جاتی ہے کس قدر پھیکی پڑ جاتی ہے۔ جب یہ دیکھ لے جب یہ سمجھ لے کہ اس کا کوئی پڑھنے والا نہیں اس کا کوئی سننے والا نہیں۔

عورت ایک تصویر نشاط ہے جس کا حسن رقم نمایاں اُس وقت ہوتا ہے جب کہ وہ آئینہ سے ہم آغوش ہو جائے۔

عورت ایک شمع دل افروز ہے جس سے شباب کی تاریکیاں منور ہو جاتی ہیں۔ محبت کے اندھیرے کافور ہو جاتے ہیں۔

عورت بادۂ ہفتاد سالہ کا سرور ہے۔ مگر جب ہی جبکہ کوئی ذوق۔ کوئی دماغ اس کا متلاشی اور قدردان ہو۔ ورنہ سرکۂ تلخ۔ آب شور۔ اور فالوڈہ منجمد ہے۔

عورت نکہت دلاویز ہے۔ جو اپنی شمیم روح پرور سے ہمارے دماغ کو معطر کرتی ہے۔

عورت ایک پھول ہے جس کو اپنے خوشبو اور رنگینی سے ہمارے دل کو پُر انبساط بنانے کے لئے قدرت نے پیدا کیا ہے۔

عورت ایک نورانی تسلی کا پیغام ہے جب کہ ہمارے دل محنت و مشقت سے کسلمند ہو جاتے ہیں تو وہ ہمیں ہماری کھوئی ہوئی طاقت واپس دلانے کا مژدہ سناتی ہے۔

عورت کی یہ فطرت ہے کہ وہ جس سے محبت کرے بے انتہا اپنی محبت کا ثبوت دیگی۔ اور جب کوئی معاملہ حسن و عشق میں اُسے دھوکا دیگا تو وہ سخت انتقام پر آمادہ ہو جائے گی۔

عورت کے سوانح عمری کی محبت ایک مکمل تاریخ ہے۔

عورت دیباچۂ حسن عشق ہے اور اخلاق محبت کا متن جس کی شرح مشکل ہے یا وہ شرح جو متن کی جویا اور معنی کی متلاشی ہو

عورتیں ملتیں

اگر مرد عورت سے کہے کہ تم جوان ہو تو اس کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ جاتی ہے - اور اگر عورت مرد سے یہ کہے کہ تم ابھی کمسن ہو تو اس گفتگو سے مرد کی ذلت ہے -

عورتیں اپنے چاہنے والوں کو بہت کم سرفراز کرتی ہیں -

عورتیں اپنے چاہنے والوں کے طریقوں کو بدلتی رہتی ہیں - مرد کٹ پتلیوں کی طرح اون کے اشاروں پر کام کرتے ہیں -

عورت کا اندازہ مرد کی ظاہری حالت پر مبنی ہوتا ہے - اور اس کی رائے صائب نہیں ہوتی -

عورت جو چاہتی ہے اکثر اس کے خلاف عمل پیدا ہوتی ہے - یہی وجہ ہے کہ بعض اوقات اونہیں اچھا شوہر مل جاتا ہے -

مرد نہیں بلکہ عورتیں بندر کی اولاد سے ہیں کیونکہ عورت میں تقلید کرنے کا مادہ مکمل ہوتا ہے -

عورت کے دل کا بھید کوئی فلسفی بھی آشکار نہیں کر سکتا -

عورت اپنی تعریف سن کر بہت خوش ہوتی ہے -

عورت عورت کے ساتھ اس قدر جلد دوست نہیں ہوتی جیسا کہ عام طور پر مرد میں دیکھا گیا ہے - بات یہ ہے کہ عورت بہت سی چیزوں کو پوشیدہ رکھنا چاہتی ہے -

عورت کی خوشی کا اندازہ اس کے خوبصورت ناچ کے کپڑوں سے کیا جاتا ہے -

عام طور پر عورتیں محبت آمیز خطوط نہیں لکھا کرتیں - بلکہ جواب میں ایک مختصر سی تحریر شکریہ کی روانہ کرتی ہیں - بلکہ آپ کو اس میں نامہ بر کو کچھ دینا پڑتا ہے -

اگر عورت کی بھلائی کیلئے نصیحت کریں تو اس کو تم سے نفرت ہوتی ہے - سچی بات تو یہ ہے کہ وہ راہ راست پر رہنا نہیں چاہتی -

حتی المقدور عورت مرد کو اپنی ذات پر شبہ کرنے کا بہت کم موقع دیتی ہے - لیکن اس سے کوئی برائی سرزد ہو جائے تو بیچاری مجبور ہے -

بیوی پر تم شبہ کرو وہ یقیناً تم کو دھوکا دیگی اور اگر بیوی پر شبہ کرنا چھوڑ دو تو وہ تم پر شبہ کرنے لگے گی -

عورتوں کی بھول بھی بڑی معنی خیز ہوتی ہے

3838
REGD. M. NO.
رجسٹرڈ نمبر آصفیہ

آم کا اچار

وزن	کیری عمدہ پختی	مرچ سرخ پکنی
	یکصد	۲ سیر
زیرہ سفید	رائی	میتھی
پاؤ سیر	یک سیر	آدھا پاؤ
ہلدی پسی ہوئی	نمک	میٹھا تیل عمدہ
چھٹانک	یک سیر	۳ سیر
لہسن	ادرک	کالی مرچ
پاؤ سیر	آدھا پاؤ	چھٹانک

چھٹانک

ترکیب اچار

شب میں کیریوں بھیگنے رکھدیں اور صبح کو یا تو بگھارے بینگن کی طرح پھل کاٹ لیں یا ٹکڑے کرلیں اور ایک کپڑے سے تمام پانی خشک کرلیں۔ اگر پانی کی ذرہ بھی نمی رہی تو اچار خراب ہوجاتا ہے۔ بعدہٗ رائی اور زیرے کو توے پر بادامی رنگ پر بھون کر پیس لیں اور بقیہ تمام مسالوں کو بھی پیس لیں۔ ادرک کو دھوکر اس کی باریک چکتیاں کاٹ لیں نمک کو بھی پیس لیں اور آدھا مسالہ ثابت رکھدیں اور ایک دیگچے میں تیل ڈال کر چولھے پر چڑھادیں اور اس میں ذرا سا زیرہ ڈال دیں اور تھوڑی میتھی اور کلنجی بھی شریک کردیں اور سب کو سرخ کرلیں جب سب سرخ ہوجائیں تو چولھے سے آنچ نکال دیں اور پسا ہوا لہسن تیل میں ڈال کر چمچہ چلایا لہسن لال ہوجائے اور خوشبو آنے لگے تو اس وقت ہلدی ڈالدیں مرچ اور بقیہ مسالہ ڈال کر خوب ملادیں اور ایک شیشہ سرکہ ڈالدیں اور اتار لیں جب مسالہ ٹھنڈا ہوجائے تو کیری کے ٹکڑوں میں یہ مسالہ ملاکر کسی گھڑے یا مرتبان میں بھر دیں اور دوسرے روز گھڑا یا مرتبان کو ہلائیں اور ایک ہفتہ کے بعد اس کو دھوپ دیدیں اور گھڑے کا منہ بند کرکے رکھدیں اور ٹکڑوں میں مسالہ لگاتے وقت چھیلے ہوئے لہسن کی پوتیاں اور کالی مرچیں ثابت ڈال دیں۔

مسنر اے فخرالدین

اکثر لوگ سرکہ نہیں استعمال کرتے لیکن سرکہ ڈالنے سے پھپوندی یعنی پھونچ جلدی نہیں آتا اور اچار جلد استعمال میں لانے کے قابل ہوجاتا ہے اگر اچار کو یکسال تک رکھنا ہو تو سرکہ نہیں ڈالنا چاہئیے تھوڑا سا اچار الگ مرتبان میں نکال کر سرکہ ڈال کر کھاسکتے ہیں تین روز کے بعد ذائقہ دیکھکر اگر نمک کم ہو تو اندازاً اور نمک لے سکتے ہیں۔

محمودیہ مشین پریس چارمینار میں چھپ کر دفتر شہاب بیر پور حیدرآباد سے شائع ہوا۔

ماہنامہ

شہاب

شہاب

جلد ۱۲ شہریور ۱۳۵۳ ف مطابق ماہ جولائی ۱۹۴۴ء نمبر ۱

(مرتبہ)

محمد عبدالرزاق بسمل

عوام سے سالانہ چندہ للعہ ؟ گورنمنٹ سے عہ

بہادر اعظم

زندگی کا ارتقاء موت ہے۔ اور پھر وہ موت جو ملک و ملت کیلئے ہو یقیناً حیات جاوید کا مرتبہ رکھتی ہے۔

حیدرآباد کا مورخ جب تاریخ لکھنے پر آمادہ ہوگا تو محمد بہادر خان کی موت کو نمایاں الفاظ میں قلمبند کرے گا کیونکہ وہ زندہ رہا تو ملک کے لئے۔ اور مرا تو مالک کے لئے۔ جس کی زبان پر تا زندگی "وطن میرا وطن میرا" نغمہ تھا۔ وہ قدم قدم پر ملک و مالک کے لئے سینہ سپر بنا رہا، اگرچہ زمانہ اس کو مٹنے کی کوشش کرتا رہا لیکن اوس کا یہ نغمہ بلند سے بلند تر ہوتا گیا۔

وہ اپنے پہلو میں ایک ایسا دل رکھتا تھا جس میں ملک کی تڑپ۔ اور مالک کی وفاداری کا سچا جذبہ بیقرار و بیچین رہا۔ وہ اپنے وطن، اور اپنے مالک کو اس وسیع کائنات میں بلند ترین مقام پر دیکھنے کا آرزومند تھا۔

وہ محمد بہادر خان سے حقیقی معنوں میں بہادر یار جنگ بہادر بنا اور اپنے بہادرانہ کارناموں سے ملک کے افراد کو دائمی زندگی کا سبق دیتا گیا کہ موت اٹل ہے۔ لیکن مرنے سے پہلے عارضی اعزازات اور مال و منال کو ملک و مالک پر قربان کر کے ایسا نقش چھوڑ جاؤ کہ تمہارے پیچھے دنیا تمھیں کبھی فراموش نہ کر سکے اور جب تمہارا نام آئے تو گردنیں تعظیم کے لئے خود بخود جُھک جائیں۔

بہادر سپاہی

تیرے کارنامے ناقابل فراموش۔ تیری وطن پرستی سبق آموز تیری وفاداری لائق صد تقلید

ہرن مینار

تازہ خواہی داشتن گر داغہائے سینہ را
گاہ گاہے باز خواں ایں قصہ پارینہ را

ہماری ساری مصیبت اسی میں ہے کہ جو کچھ ہماری آنکھوں کے سامنے ہے ہم اس پر تفکر او رتدبر نہیں کرتے اور جو کچھ ہماری آنکھوں سے اوجھل ہے اوس کی تحقیق اور تدقیق میں اپنا وقت اور قوت ضائع کرتے ہیں۔

میں آج متواتر چار ماہ سے شیخوپورہ کے لوگوں سے "ہرن مینار" کی تاریخ دریافت کر رہا ہوں مگر میری تمام دریافت اور جستجو کا ماحصل یہ ہے کہ ایک ہرن کی یادگار میں جہانگیر نے یہ مینار تعمیر کیا تھا یہ وہ جواب تھا جو مجھے سب سے پہلے ملاقاتی نے بتلایا اور مسلسل چار ماہ کی تحقیق کے بعد میرے علم میں اس نادرۂ روزگار عمارت کی تاریخی اہمیت کی بابت کچھ بھی اضافہ نہ ہو سکا۔ ہمارے علمی جمود اور تحقیقی فقدان پر جس قدر ماتم کیا جائے کم ہے۔ ہم ابتک ایک ایسی عمارت کی تاریخ کا کھوج نہیں لگا سکے جو ہر روز ہم دیکھتے ہیں اور جس کا موجودہ ادبار اپنے اندر چشم بینا کے لئے بصیرت کے ایک خزانہ کا حامل ہے۔

قوموں کے عروج اور زوال اور ایاب و ذہاب کی تاریخ کو اگر الٹ کر دیکھا جائے تو کتب اور سفار کی یہ ورق گردانی ہمیں صرف ایک نتیجہ پر پہنچاتی ہے اور وہ یہ کہ جس ملک اور قوم نے اپنی تاریخی عظمت کو بھلا دیا وہ قوم کبھی سربلند ہونے کی اہل نہیں اور جس قوم نے اپنی تاریخ کو یاد رکھا تو "احساس زیاں" نے ان کے خون کی حدت کو پھر بھڑکا دیا اور گری ہوئی اقوام پھر تاریخ کے صفحات پر ابھر آئیں۔ متاع کارواں کے لٹ جانے کا مآل اتنا خطرناک نہیں جتنا احساس زیاں کے مفقود ہونے کا انجام ہے مگر ہماری حالت تو

وائے ناکامی متاع کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساس زیاں جاتا رہا

کے مصداق ہے۔

جناب سردار کریم نواز خان صاحب ایم، اے، شیخوپورہ

میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ آئندہ بالالتزام شیخوپورہ کے ضلع کے آثار قدیمہ کے متعلق تاریخ کی روشنی میں مضامین لکھا کروں تاکہ ہم دنیا کی تاریخ نہ سہی کم از کم اپنے مولد اور مسکن کی تاریخ سے تو آشنا رہیں۔

موجودہ شیخوپورہ کا اصل تاریخی نام جہانگیر آباد ہے یہ گاؤں جہانگیر نے عہد شہزادگی میں اپنے نام پر آباد کرایا۔ کیونکہ ان دنوں یہاں پر گھنا جنگل تھا۔ اور شکار بہت زیادہ دستیاب ہوتا تھا اسلئے عالم شہزادگی میں جہانگیر اکثر یہاں شکار کھیلنے کے لئے آیا کرتا اور اسی تعلق سے اپنے نام پر یہ گاؤں آباد کیا۔ اس کا نام شیخوپورہ کیوں ہوا۔ ... ؟ تاریخ اس معاملہ میں خاموش ہے۔ قیاس غالب ہے کہ شہنشاہ اکبر کے ہاں اولاد نہ ہوتی تھی۔ بابا شیخ سلیم چشتی کی دعاؤں کے تاثیر سے جہانگیر تولد ہوئے اس لئے شہزادگی کے ایام میں جہانگیر شہزادہ سلیم کے نام سے موسوم تھا اور بچپن میں شہنشاہ اکبر ہمیشہ انہیں شیخو بابا کے نام سے پکارا کرتے ممکن ہے کہ اسی نام کے لگاؤ سے جہانگیر آباد بھی دو ناموں سے مشہور ہو گیا ہو۔ شیخوپورہ اور جہانگیر آباد۔ مگر یہ سب قیاس ہے علمی تحقیق نہیں۔

جہانگیر کو "مانس راج" ایک ہرن سے بہت انس تھا یہ ہرن جہانگیر کے سریر آرائے سلطنت ہونے کے دوسرے سال یہاں مر گیا۔ اور اس کی یاد میں ہرن مینار تعمیر کیا گیا۔ مینار کے نیچے "مانس راج" کو دفن کیا گیا اور اوپر یہ مینار تیار ہوا۔ مینار کے اوپر "مانس راج" کے پتھر کا بت نصب کیا گیا جو زمانہ کے انقلاب کے ہاتھوں محفوظ نہ رہ سکا۔ ہرن کی قبر کے اوپر فارسی زبان میں یہ الفاظ کندہ کر کے لگوائے گئے تھے

دریں فضائے دلکش آہوئے بدام
جہاندار خدا آگاہ نورالدین جہانگیر
بادشاہ آمدہ در عرصئ یک ماہ از وحشت
صحرایت بر آمدہ سر آمدۂ آہو ان
خاصہ گشت "

ترجمہ:۔ اس دلکش فضا میں خدا سے ڈرنے والے بادشاہ نورالدین جہانگیر نے ایک ہرن پکڑا۔ جو ایک ماہ کے اندر اپنی جنگلی عادات کو چھوڑ کر سدھ گیا اور شاہی ہرنوں کا سردار بن گیا"

یہ کتبہ اب محفوظ نہیں مگر تاریخی کتب میں اس کتبہ کا ذکر مذکور ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ہرن جہانگیر نے اسی مقام پر پکڑا تھا۔ اور پھر کچھ عرصہ کے بعد جہانگیر آباد میں ہی مر گیا۔ یہ کتبہ ملا محمد حسین کاشمیری کے ہاتھ کا کندہ کیا ہوا تھا جو عہد جہانگیری میں فن خطاطی کا ماہر تھا۔ "مانس راج" کی یاد کے احترام میں جہانگیر نے حکم دیا تھا کہ اس علاقہ میں کوئی ہندو یا مسلمان ہرن کا شکار نہ کھیلے۔

۱۵ سنہ جلوس میں کشمیر سے واپس آتے ہوئے جہانگیر نے یہاں چند روز قیام کیا اور پھر لاہور میں داخل ہوا۔ اس واقعہ کا ذکر جہانگیر نے اپنی خود نوشت سوانح "تزک جہانگیری" میں ان الفاظ میں کیا ہے۔

ماہ الہٰی کی ۲۵ تاریخ کو جہانگیر آباد میں شاہی کیمپ ہوا جب میں شہزادہ تھا تو یہ جگہ میری شکارگاہ تھی۔ میں نے اپنے نام پر ایک چھوٹا سا گاؤں یہاں آباد کیا۔ اور یہاں ایک مختصر عمارت تعمیر کرائی (مراد قلعہ شیخوپورہ) جس کا انتظام میں نے اپنے کروال (بمراد کاردار) سکندر خان موہن کے سپرد کیا۔ سریر آرائے سلطنت ہونے کے بعد میں نے اسے پرگنہ میں تبدیل کر دیا اور یہ پرگنہ بطور جاگیر سکندر کو عطا کر دیا۔ پھر میں نے یہاں ایک تعمیر کا حکم دیا جو ایک تالاب اور بارہ دری پر مشتمل تھی۔ سکندر کی وفات کے بعد یہ جاگیر میں نے ارادت خاں کو مرحمت فرمائی۔ عمارات کا انتظام بھی اس کے سپرد رہا۔ اس زمانہ میں عمارت کی تعمیر مکمل ہو گئی تالاب وسیع اور خوشنما ہے۔ اس کے عین وسط میں بارہ دری ہے جو بہت ہی دل خوش کن اور خوشنما ہے۔ اس ساری عمارت پر ایک لاکھ پچاس ہزار خرچ آیا۔ یہ شکارگاہ صحیح معنوں میں بادشاہوں کے شکار کھیلنے کے لائق ہے۔ ہم جمعہ اور سنیچر کا روز یہاں پر رہے اور ہر قسم کا شکار کھیلا۔ قاسم خاں گورنر لاہور کو یہاں شرف باریابی بخشا گیا۔ اس نے ۵۰ سونے کی مہریں نذر کیں۔ یہاں سے ایک منزل پر مومن عشقباز کا باغ ہے جو دریائے لاہور کے کنارے واقع ہے شاہی کیمپ یہاں پر نصب کیا گیا۔ اس باغ میں نہایت خوبصورت سرو کے درخت اور آموں کے درخت ہیں۔ ۵ محرم جو الہٰی مہینہ کی ۹ تاریخ ۱۰۳۱ سنہ ہجری ہے۔ ما بدولت ہاتھی پر سوار ہوئے اور باغ مومن سے چلے اور شہر کو جاتے ہوئے راستہ میں قربانی کے طور پر روپیہ نچھاور کیا۔ تین ساعت اور دو گھنٹے بعد طلوع آفتاب نیک ساعت کو ہم محل میں لوگوں کی مبارک باد اور پرجوش خوش آمدید کے ساتھ داخل ہوئے اور اس حصہ میں رہائش کی جو نامور خاں کے زیر اہتمام نیا تعمیر کیا گیا تھا۔"

اس حصہ عمارت کی تعمیر میں جہانگیر نے اپنی توزک میں ذکر کیا ہے۔

بے تکلف منازل دلکشا و نشیمن ہائے روح افزا در غائت لطافت و نزہت ہمہ منقش و مصور بعمل استادان نادرہ کار آراستگی یافتہ باغہائے سبز خورم با نواع و اقسام گل

دریا چین نظر فریب گشتہ ؎

ز فرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامن دل میکشد کہ جا اینجا ست

بالجملہ مبلغ ہفت لاکھ روپیہ کہ بست وسہ ہزار تومان رائج ایران باشد صرف ایں عمارت شدہ"

پھر تاریخ موسومہ عمل صالح مصنفہ ملا محمد صالح لاہوری ہرن مینار کا تذکرہ ان الفاظ میں موجود ہے۔

ترجمہ :- پھر ۱۲ تاریخ کے بعد شہنشاہ عالم شاہجہاں نے تین روز جہانگیر آباد موسومہ ہرن مینار میں قیام کیا اور بہت سے ہرن شکار کئے کیونکہ یہاں ہرن بکثرت ملتے ہیں۔ جہاں پناہ اس تفریح سے بہت مسرور ہوئے کیونکہ شکار بکثرت مل گیا۔ عالم پناہ کے خیال کے مطابق جنت مکانی (جہانگیر) کی تعمیر کردہ عمارت کچھ ایسی نہ تھی جیسی کہ یہاں ہونی چاہیئے۔ اسلئے حکم ہوا کہ ایک نئی عمارت جو نہایت ہی دلفریب اور دلکش ہو تعمیر کیجائے ایک سال کے اندر تعمیر مکمل ہوگئی اور ۸۰۰۰۰ روپیہ صرف ہوا۔ ۲۴ تاریخ کو شاہی کیمپ نے راوی کی طرف کوچ کیا۔ شہنشاہ کی مراجعت کشمیر پر وزیر خاں نے ایک سفری سونے کا تخت جس کی قیمت کا تخمینہ ۵۰،۰۰۰ ہے ۵۰۰ عراقی گھوڑے اور دیگر تحائف جن کی مالیت دو لاکھ ہے پیش کئے عالم پناہ میاں میر صاحب اور شیخ بلاول صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے"

"بہتر ہو نہیں سکتا"

شگفتہ ہو گل تر اس سے بہتر ہو نہیں سکتا
اگر ہو ہاتھ میں زر اس سے بہتر ہو نہیں سکتا

جمال شاہد وحدت کا جلوہ ہر اک ذرے میں
یہ حسن اور اس کا زیور اس سے بہتر ہو نہیں سکتا

اگر منظور نظارہ ہے آ میری آنکھوں میں
جہاں بین اور منظر اس سے بہتر ہو نہیں سکتا

یگانہ پرورش پاتا ہے آغوش یتیمی میں
اگر ایسا ہو گوہر اس سے بہتر ہو نہیں سکتا

رہے آباد سنگ و خشت سے بتخانہ کعبہ
علاج شورش سر اس سے بہتر ہو نہیں سکتا

بھلی ہے یا بری قسمت سے بیش و کم نہیں ہوتا
مقدر تیرا اختر اس سے بہتر ہو نہیں سکتا

خواجہ عباد اللہ صاحب اختر بی۔اے

قطب شاہی دَور کے مدارس پر ایک نظر

ایک دوسرے مضمون میں بہمنی سلطنت کے مدارس کا تذکرہ کر دیا گیا ہے اب قطب شاہی مدارس کی صراحت کیجاتی ہے۔

سلطنت قطب شاہی کی بنیاد بہمنی سلطنت کی شکست کے بعد سنہ ۹۱۶ھ میں قایم ہوئی، اور سنہ ۱۰۹۸ھ میں عالمگیر خلد آشیانی نے اس کو مغلیہ قلمرو میں شامل کر لیا۔ اس طرح تقریباً دوسو سال تک قطب شاہی سلطنت کا علم گولکنڈہ اور دکن کے وسیع حصہ پر لہراتا رہا۔ آٹھ بادشاہ یکے بعد دیگرے گولکنڈہ کے تخت کے مالک بنے ان میں سے اکثر ذی علم اور علم دوست تھے ان کے زمانہ میں علم و ہنر کو بڑی ترقی ہوئی۔

سلطان ابراہیم اس خاندان کا چوتھا بادشاہ تھا، وہ نہ صرف خود صاحب علم و فضل تھا بلکہ علوم و فنون سے اس کو خاص دلچسپی تھی اس کے دربار میں بڑے بڑے علماء وقت جمع ہو گئے تھے، اور گولکنڈہ مرکز علم و فن بن چکا تھا سلطان کو شعر و سخن سے خاص دلچسپی تھی فارسی اور دکھنی کے ساتھ تلنگی شاعری کا بھی قدردان تھا سفر و حضر میں اس کے ساتھ ہر وقت اہل علم و فضل ہوا کرتے تھے اس کے زمانہ کے بعض علماء یہ ہیں۔ امیر شاہ محمد آنجو، امیر عماد الدین محمود شیرازی، جالینوس زماں قاسم بیگ شیرازی، حسین قلی مرزا جو علم منطق اور حکمت میں سرآمد روزگار تھا۔ شاہ تقی وغیرہ جو عربی اور فارسی کے قابل افراد تھے۔ ملا خیالی اور مرزا وجہی دکھنی زبان کے شعرا تھے۔ ملا ریڈی تلنگی اور سنسکرت کا مشہور شاعر تھا۔

تاریخوں سے اس امر کا ثبوت ملتا ہے کہ سلطان ابراہیم کو نہ صرف علوم و فنون سے دلچسپی اور شغف تھا بلکہ اس امر کا بھی پتہ چلتا ہے کہ
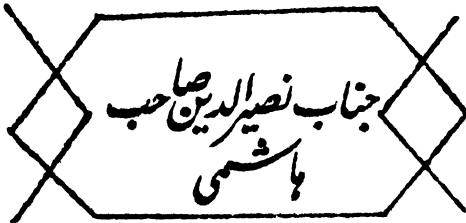
سلطان کے زمانہ میں کثرت سے مدارس تعمیر ہوئے اور تعلیم کا خاص انتظام و اہتمام تھا، اس کے متعلق تاریخوں سے جو ثبوت ملتا ہے ان کا مختصر اقتباس حسب ذیل ہے۔

مصنف تاریخ قطب شاہی لکھتا ہے:-

"دراں مجلس شعرائے فصیح زبان وندمان ملیح بیان از ابر طبع در درآب دار نظم ونثر نثار کردہ از خوان نوال واحسان آن بادشاہ نوجوان بہرہ مند میگردند ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ صـ ۹۳

در سفر وحضر ہموارہ اہل فضل وہنر در خدمتش مے بودند ودر مجلس ہمایوں بمباحثہ علوم دینی پر رفتہ در تحقیق مسائل یعنی شرائطا اہتمام بجائے می آوردند ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

مساجد ومدارس ودینیہ وعمارات رفیعہ کہ بمین اہتمام آں حضرت اتمام یافتہ" صـ ۱۳۰ (انڈیا آفس)

مصنف تاریخ ظفرہ کہتا ہے ۔

"ہمچنیں در عہد آں شہریار معدلت آثار باغ ابراہیم شاہی پہلوئے قلعہ کہ حالا بہ بارہ دری مشہور است ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

وکتوہ بدویل وکالا چبوترہ گلکنڈہ ومساجد و مدارس وعمارات عالیمقام وحمام صورت اتمام و زمینت انصرام یافت" (صـ ۳ مطبوعہ گورکھپور)

مصنف حدیقہ العالم کہتا ہے ۔

" بہ یمن اہتمام آنحضرت تعمیر عمارات رفیع قلعہ دار السلطنت گولکنڈہ ومساجد ومدارس و لنگر ودوازدہ امام ۔ ۔ ۔ ۔ صورت اتمام یافت"

(صـ ۲۰۰ مطبوعہ حیدرآباد)

ان اقتباسات سے واضح ہے کہ سلطان ابراہیم کے زمانہ میں عام طور سے علم کی ترقی ہوئی اور مدارس بھی تعمیر ہوئے تھے ۔

سلطان ابراہیم کے بعد سلطان محمد قلی قطب شاہ اس کا جانشیں ہوا، اس کے زمانہ میں جس طرح علم وہنر خصوصاً فنون لطیفہ کی جو ترقی ہوئی وہ تاریخ دکن کا ایک تابناک واقعہ ہے، سلطان کو بچپن ہی سے فنون لطیفہ کا شوق تھا جس کی وجہ سے آگے چل کر جب وہ مالک تخت وتاج تھا تو اس نے دل کھول کر اپنے ذوق وشوق کی تکمیل کی، شاعری، مصوری، موسیقی اور تعمیر سے جو شغف اور دلچسپی اس کو رہی اس کی وجہ سے ان فنون کی بڑی ترقی ہوئی خود سلطان فارسی، دکھنی اور تلنگی کا زبردست شاعر تھا ۔ ان زبانوں کے نامور اور باکمال شعرا اس کے عہد میں موجود تھے اس کے دربار میں بیسیوں شعرا کو رسوخ حاصل تھا، ان میں سے وجہی، غواصی اور احمد وغیرہ دکھنی زبان کے نامور شعرا تھے ۔ سلطان کو موسیقی سے جو دلچسپی تھی اس کی وجہ سے گولکنڈہ میں اس زمانہ میں موسیقی کے بڑے بڑے استاد جمع ہو گئے تھے ۔ اور دور دور سے ماہرین فن موسیقی طلب کئے جاتے تھے ۔ سلطان کو مصوری سے جو محبت تھی اس کا اندازہ سلطانی قصر وایوان کے نقش ونگار اور

مصوری سے ہوسکتا ہے جن کا تذکرہ تاریخوں
میں بصراحت موجود ہے۔ تعمیر کے شوق کے لئے
اس کے عہد کے کئی قصر و ایوان تھے جن میں سے
بعض آج بھی موجود ہیں۔

ایسے قابل اور علم دوست سلطان کے
زمانہ میں علم کی ترویج اور اشاعت تعلیم کے
بارے میں کیا کچھ نہ ہوا ہوگا وہ ظاہر ہے اس کے
زمانہ میں جو نامور اور باکمال علماء گولکنڈہ
اور حیدرآباد میں تھے ان کی فہرست طویل ہے
ان میں سے چند یہ ہیں۔ علامہ میر محمد مومن
استرآبادی، قاضی محمد سمنانی، مہرک معین الدین
سبزواری۔ مرزا محمد امین سیستان وغیرہم ان میں
سے ہر ایک صاحب علم و فضل ہی نہیں بلکہ صاحب
تصنیف بھی تھا۔ اونہوں نے مختلف علوم و فنون
میں جو کتابیں لکھی ہیں وہ آج تک موجود ہیں۔
سلطان محمد قلی کے زمانہ میں اس کے پیش
رو سلطان ابراہیم کی طرح کثرت سے مدارس
تعمیر ہوئے ہیں۔ چنانچہ مورخین دکن نے اس
خصوص میں جو صراحت کی ہے ان کا مختصر اقتباس
قابل ملاحظہ ہے۔

مصنف تاریخ قطب شاہی لکھتا ہے۔
"مسجد جامع و مدرسہ و خانقاہ، دارالشفاء
و حمامات متعدد و دیگر مساجد و مدارس کہ مین
اہتمام شہریار مغفور با تمام رسید"
(مخطوطات [illegible] انڈیا آفس)

مصنف تاریخ طغرہ صراحت کرتا ہے۔
"ہفتاد لک ہون کہ سصت ہزار تومان باشد
در ارتفاع و احداث عمارات و مسجد جامع و مدرسہ
یعنی چار مینار و خانقاہ و دارالشفاء و حمامات
متعدد و دیگر مساجد و مدارس و قصر و باغ وغیرہ
بہ صرف آمدہ۔۔۔ ص۲۱ مطبوعہ گورکھپور)

تاریخ حدیقۃ العالم میں مذکور ہے۔
"چہار مینار نہایت مستحکم و مرتفع و در آں
چہار مینار حجرہ ہا جہت سکونت طلبہ علم و در وسط
آں حوضی با فوارہ بزرگ و در برابر ہر طاقی را
بازارے طویل و عریض ساختند و ماورائے
آں بہ تعمیر دارالشفائے و حمامے قریب بآں
پرداختند و در مدرسہ علماء و طلبا افادہ و استفادہ
و در دارالشفاء اطبا با جمع مایحتاج الیشاں برائے
معالجہ بیماراں مقرر شدند" ص ۳۶۷

اس صراحت سے واضح ہوتا ہے کہ سلطان
کے زمانہ میں بھی کئی مدارس تعمیر ہوئے۔ اور
چار مینار در اصل ایک کالج کی حیثیت رکھتا تھا
جہاں اعلیٰ تعلیم ہوتی تھی۔ جامع مسجد میں طلبہ کے
رہنے کے لئے کمرے موجود تھے۔ جامع مسجد کا حلقہ
درس عرصہ دراز تک گرم رہا۔ چنانچہ عہد آصفی

میں اس نے مدرسہ شجاعیہ کے نام سے شہرت
حاصل کی تھی۔

سلطان محمد قلی کے جانشیں سلطان محمد
قطب شاہ کا نام مکہ مسجد کے تہجد گزار بانی کی حیثیت
سے کبھی فراموش نہیں ہو سکتا۔ سلطان محمد کو
علم و فن سے بھی گہری دلچسپی تھی۔ اس کا دربار اکثر
اوقات ایک علمی مجلس کی صورت میں بدل جایا
کرتا تھا، جہاں علوم عقلی و نقلی پر بحث مباحثہ
ہوتا، اور خود سلطان کی بحث و تنقید ہر طرف سے
خراج تحسین حاصل کرتی۔ میر محمد مومن سلطان کے
زمانہ میں پیشوائی کی خدمت پر مامور تھے اس
طرح بادشاہ اور وزیر دونوں کی علمی سرپرستی کے
باعث اس زمانہ میں علم و ہنر کی بڑی ترقی ہوئی
سلطان کی علمی قابلیت اور اس کی علم دوستی کے
متعلق گولکنڈہ کے مورخین نے بڑی وضاحت
کی ہے چنانچہ مصنف تاریخ قطب شاہی لکھتا ہے۔

"در فضائل ملکتبہ متعارف نیز سر آمد روزگار ند
واز اقسام علوم عقلی و نقلی آگاہی تمام ایشاں را
حاصل است، در تواریخ استحضار آں حضرت
بمرتبہ الیست کہ مورخان زمان ہرگونہ حکایتے
را کہ ابتدا او نمایند آں حضرت باختلاف روایات
بہ اتمام رسانند، و ہموارہ بہ ارباب فضل و حکمت
صحبت داشتہ بہ افادات دانشمندانہ اہل مجلس
مستفیض می گردانند، و بے شائبہ تکلف ہر شخصے
کہ در فنے از فنون دانشوری چہ از حکمت پرستان
بالغ نظر و چہ از صنعت پردازان صاحب ذوق
سالہائے دراز بیش کاملاں مشق آں علم کردہ
باشد چو بہ شرف ملازمت نکتہ یاب دقیقہ فہم
می رسد از مشاہدہ کمال دانش خود را گم کردہ
در مقام حیرت می آیند و بدائع آنکہ در مشارب
مختلفہ و مدارج متنوعہ در یک مجلس آراد سر می
فرمایند کہ بر طبع عالم دشوار نمی آید"

(ص۱۸۹ مخطوطہ انڈیا آفس)

مصنف حدیقۃ السلاطین کا بیان ہے۔
"فضلائے پائے سریر و فصحائے خویش تقرر۔
بہ کمالات و استعداد آں مغفور و مبرور اعتراف
داشتند" ص۲۲

سلطان کے زمانہ میں سید کمال الدین مازندرانی،
میر قطب الدین، نعمت اللہ، میر مرتضیٰ جیسے
ارباب کمال موجود تھے، ان میں سے ہر ایک
علوم عقلی و نقلی کا ماہر اور اپنے وقت کا بہت بڑا
صاحب کمال تھا۔

میر محمد مومن کی وجہ سے بھی اس دور میں
علم کی بڑی اشاعت ہوئی۔ انھوں نے اپنے تبحر
علمی سے متعدد عالموں اور فاضلوں کو فیض پہنچا
ان کے بیسیوں شاگرد تھے جو اس زمانہ میں اپنی

قابلیت سے سرآمد روزگار بنے ہوئے تھے جن
کی صراحت مصنف "میر محمد مومن" نے کی ہے۔
سلطان محمد کے بعد سلطان عبداللہ قطب شاہ
نے بھی اپنے باپ دادا کی طرح علم کی سرپرستی اور
علماء وفضلا کی قدر دانی کے روایات برابر قایم
رکھے۔ اس کی علمی سرپرستی سے کئی کتابیں مرتب
ہوئیں۔ چنانچہ برہان قاطع لغت اس کے نام پر
معنون ہوا۔ نظام الدین نے حدیقۃ السلاطین
جیسی تاریخ لکھی۔ علامہ ابن خاتون نے کتاب الارشاد
اور جامع عباسی پر حواشے لکھے، اربعین کا ترجمہ کیا
مولانا حسین آملی نے نہج البلاغت کی شرح مرتب
کی۔ ملا فتح اللہ سمنانی نے امام یافعی کی کتاب
روض الریاحین کا ترجمہ کیا، (یورپ میں دکھنی
مخطوطات)

سلطان کے زمانہ کے علماء کی فہرست طویل ہے
ان میں سے بعض یہ ہیں، علامہ ابن خاتون جو میر
محمد مومن کے قابل شاگرد تھے، میر مجد الدین جو
علامہ کے فرزند اور فارسی کے زبردست شاعر
تھے، میر سید محمد اسفرائنے، مولانا رونقی،
قاضی احسن، قاضی ظہیر الدین، حکیم عبدالجبار
گیلانی، شیخ عبداللطیف ملا خلقی، نور اللہ صدر
مدرسہ دار الشفاء، مرزا محمد جوہر تبریزی، مرزا
حمزہ استرآبادی، مرزا فضل اللہ سیفرازی، شیخ
ہارون جزائری، ملا تفنانی شیرازی، مرزا محمد
مشہدی، قاضی علاء اللہ گیلانی وغیرہ، ان علماء
کے علاوہ خود امراء دربار بھی اس زمانہ کے قابل
ترین اشخاص میں شمار ہوتے تھے، مثلاً میر
فصیح الدین، میر محمد رضا استرآبادی، سید عبداللہ
مازندرانی، خواجہ افضل خان وغیرہ ان سب کی
وجہ سے حیدرآباد علم وفن کا مرکز بنا ہوا تھا۔
علم کی شعاعیں دور دور تک پہنچی تھیں۔

علامہ ابن خاتون باوجود مہمات سلطنت
خود بھی درس دیا کرتا تھا، چنانچہ مصنف حدیقۃ
السلاطین لکھتا ہے:۔

" نواب مشار الیہ باوجود کثرت مشاغل
مہام سلطنت ووفور امور مملکت وملازمت
دو وقتہ خاقان یوسف مجال ہر صبح مدرس فیض
مبسط الیشان از وجود ارباب دانش چہ از
فضات علماء وفضلا وصلحا وشعرا واہل استعداد
وکمالات واز اکابر واعیان وامراء وزراء وغیرہم
کہ مشحون میکرد وبافادہ ورفاضۂ علوم منقول
از کتب تفاسیر واحادیث وفقہ از حکمت وریاضی
ومنطق وغیرہ مشغول می باشند"
(ص۲۶۴ انڈیا آفس)

مصنف حدیقۃ العالم لکھتا ہے۔
" پادشاہے بود عادل وباذل وسخی ومشہور

ودانشمند وقدرشناس ارباب ہنر و درعہد
آں شہریار علماء وفضلا و از ہر دیار بدارالسلطنت
حیدرآباد آوردند وہنرمندان عالم درآں بلدہ
مجتمع گشتند، وچندیں کتاب و رسالہ مثل برہان
قاطع کہ در تحقیق لغت فارسی بے شبہ ونظیر است
بنام نامی او تصنیف وتالیف نمودند وبمقاصد
ومارب خود فائز گردیدند وشیخ محمد خاتون کہ
اعلم علماء زماں بود درآں زماں آں بادشاہ اعتبار
بخش فیض رساں اعتبارش از ایوان کیوان
درگذشت چنانچہ مدارس عالی بنا نمودند ومدرسین
درآں مدارس مقرر فرمود" (ص ۲۵۵ مطبوعہ)

اس زمانہ میں دیگر علوم کے علاوہ طب کی
تعلیم کے لئے بھی ایک مدرسہ قایم تھا، نوراللہ
اس مدرسہ کے صدارت کے فرائض انجام دیا کرتا
تھا۔ اس زمانہ میں تعلیم کا جو ذوق وشوق تھا۔
اس کا پتہ اس سے بھی چل سکتا ہے کہ سلطان کی
والدہ حیات بخشی بیگم نے بھی دینی تعلیم کے لئے
حیات نگر میں ایک مدرسہ تعمیر کیا تھا اور طلبہ کے
رہنے کے لئے مسجد میں کمرے بنائے تھے اقامتی
مدرسہ کی بانی کی حیثیت سے اس کا نام تاریخ میں
زندہ ہے۔

اس تفصیل سے واضح ہوسکتا ہے کہ اس
زمانہ میں دو قسم کی تعلیم عام طور سے ہوا کرتی تھی۔
یعنی سرکاری مدارس قایم تھے جن میں ابتدائی اور
اعلیٰ تعلیم ہوا کرتی، اور پھر علماء و فضلا خانگی طور پر
اپنے مکانوں، مسجدوں اور خانقاہوں میں درس
دیا کرتے، جن کے فیض سے تشنگان علم سیراب
ہوا کرتے تھے۔ اس قسم کی تعلیم صدیوں سے اسلامی
ممالک میں مروج رہی اور قطب شاہی دور میں
بھی اس نہج سے علم کی اشاعت ہوتی رہی۔

حمد

اے نام تو بر ہمہ زبان ہا　　ژولیدہ بذات تو گماں ہا
یک تیر نہ رفت بر نشانہ　　ما گرچہ زنیم بر نشاں ہا
گمراہ کن است مرداں را　　در کنہ وجود تو بیاں ہا
فریاد ز دست عقل مجبور　　دارد شب وروز در فغاں ہا
در منزل لیلیٰ وصالش　　گم گشت نشان کارواں ہا
بر سنگ در نگار یکتا　　افگندہ خلائق است جاں ہا

مسلم بہ جمال یار بینیم
عکس رخ خالق جہاں ہا

مسلم

نقد و نظر

نثر ہو یا نظم ادب میں پہلی شرط یہ ہے کہ جو کچھ لکھا جائے وہ علم صرف و نحو، علم معنی، علم بیان، محاورہ زبان، روزمرہ اور لغت کے خلاف نہ ہو۔ دوسری شرط یہ ہے کہ ادائی مطلب کے لئے ایسے الفاظ منتخب کئے جائیں جو صحیح معنی و مفہوم ادا کرنے والے اور مترنم ہوں اگر مضمون اعلیٰ تخیل ارفع بندش چست ترکیب درست اور علم بیان و معنی کی چاشنی بھی ہو تو نور علیٰ نور۔

ادب شعر کی بحث میں ذوق سلیم کا ذکر بھی آتا ہے مگر وہ ہے کیا چیز اوس کی جامع و مانع تعریف آسان نہیں۔ مذاق مختلف ہو سکتا ہے اور ہوتا ہے لیکن مذاق سلیم ایک جداگانہ شیئی ہے امثلہ ذیل سے میرا مطلب واضح ہو سکیگا۔

یہ لوگ کیوں مرے زخم جگر کو دیکھتے ہیں   نظر لگے نہ کہیں اوس کے دست و بازو کو

غالب کے اس مشہور شعر کو مدیر رسالہ نگار غزل کی لطافت سے بالکل علیٰحدہ فنون سپہ گری کی حد میں داخل اور قابل اصلاح سمجھتے ہیں ملاحظہ ہو رسالہ نگار جلد ۲۸ شمارہ (۵) بابتہ ماہ نومبر ۱۹۳۵ء مگر ایک ذی علم وفن زبان دان اور اہل زبان شاعر مولانا نظم طباطبائی مرحوم فرماتے ہیں "اس شعر کی خوبی بیان باہر ہے بڑے بڑے مشاہیر شعرا کے دیوانوں میں اس کا جواب نہیں نکل سکتا" پروفیسر رشید احمد صدیقی غالب پر فانی کو ترجیح دیتے ہیں اور پروفیسر سروری کی رائے ہے کہ "فانی نے غالب کے مخصوص طرز کو اوس کے پیچ و خم نکال کر سیدھا کر دیا ہے" جگر مرادآبادی کی نسبت ارشاد ہوتا ہے "جو مناسبت فانی اور غالب کلام میں تھی وہی جگر اور داغ کے کلام میں بھی ہے۔ داغ کی شعری کائنات ..... ایک سمندر ہے جس کا آب منقطر جگر کی شاعری معلوم ہوتی ہے"[1] بخلاف اس کے مولانا شبلی نعمانی استاد داغ کو اردو شاعری کا آخری تاجدار کہتے ہیں۔

ان مثالوں سے اختلاف مذاق اور مذاق سلیم کے باہمی فرق و امتیاز کا بآسانی اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ جناب جگر مرادآبادی کے مذاق شاعرانہ اور خوبی بیان سے انکار نہیں کیا جاسکتا وہ ایک پرانے مشاق شاعر ہیں سوئے اتفاق سے کبھی کوئی لغزش اون کے کلام میں پائی جائے تو وہ یا تو مقتضائے بشریت ہے یا خود معترض کی کج فہمی۔ کھوٹے کھرے کو پرکھنے اور اچھے برے میں تمیز کرنے والے ارباب ذوق سلیم سے دنیا خالی نہیں۔

رسالہ سب رس بابتہ ماہ مئی ۱۹۴۴ء میں حضرت جگر کا تازہ کلام تحت عنوان "واردات جگر" شائع ہوا ہے یہ غزل خاص برائے سب رس لکھی گئی ہے۔ قارئین رسالہ شہاب کی ضیافت طبع کی خاطر ہم اس غزل پر ایک سرسری نظر ڈالتے ہیں۔ بلاوجہ نکتہ چینی ہمارا شیوہ نہیں مگر جہاں ہم کو شبہ ہو رہا ہے اس کو محض ادب اردو کی خدمت سمجھ کر ظاہر کرینگے خدا کرے یہ شبہات ہماری اپنی ہی غلط فہمیوں کے نتائج ہوں۔

[1] جدید اردو شاعری۔

شعر و نغمہ۔ رنگ و نکہت۔ جام و صہبا ہو گیا   زندگی سے حسن نکلا حسن رسوا ہو گیا

بظاہر یہ مطلع ہے مگر ہے در اصل دو مختلف المفہوم مصرعوں کا سنگم۔ پہلے مصرع میں تین جگہ فارسی کا واو عطف آیا ہے اوس کو اردو سے بدل کر یوں پڑھیئے۔ شعر اور نغمہ۔ رنگ و نکہت۔ جام اور صہبا۔ اب فرمایئے ردیف "ہو گیا" سے یہاں کیا معنی پیدا ہو رہے ہیں۔ ردیف بے کار ہو کے رہ گئی یا نہیں؟ "زندگی سے حسن نکلا" بے معنی جملہ ہے۔ حسن کی رسوائی کے کوئی اسباب بھی ہیں یا محض ادعائے بے معنی؟

اور بھی آج اور بھی زخم گہرا ہو گیا   بس کر اے چشم پشیمان کام اپنا ہو گیا

اپنے کئے پر آپ شرمندہ ہونے اور پچھتانے والے کو پشیمان کہتے ہیں۔ چشم معشوق جب ایک بار نظر ڈال کر خود ہی شرمندہ ہو گئی اور پچھتا رہی ہے تو پھر یہ کہنا کہ "آج اور بھی زخم گہرا ہو گیا اب بس کر" یعنے نظر بازی سے درگزر بالکل مہمل ہے۔

اس کو کیا کیجئے زبان شوق کو چپ لگ گئی   جب یہ دل شائستہ عرض تمنا ہو گیا

"چپ لگنا یا چپکی لگنا اردو کا محاورہ ہے جس کے مفہوم میں زبان داخل ہے۔ ع

چپکی تجھ کو لگ گئی ہے تب سے میر   شوران شیریں لبوں کا جب سے تھا

یعنی تیری زبان خاموش ہو گئی یا تیری زبان بند ہو گئی بس" زبان شوق کو چپ لگنا کے معنی ہوئی زبان شوق کی زبان خاموش ہو گئی جو صحیح نہیں۔ دوسرے مصرع میں حرف اشارہ "یہ" حشو اور لفظ "شائستہ" بے محل استعمال کیا گیا یہ موقع بجائے شائستہ کے آمادہ کہنے کا ہے۔

میں نے جس بت پر نظر ڈالی جنون شوق میں   دیکھتا کیا ہوں وہ تیرا ہی سراپا ہو گیا

کہنا یہ تھا کہ "جنون شوق یا وفور شوق میں جس پر نظر ڈالتا ہوں تو ہی نظر آتا ہے۔ ع

جدھر دیکھتا ہوں اُدھر تو ہی تو ہے۔

مگر ردیف کی خاطر کہہ گئے" وہ تیرا ہی سراپا ہو گیا" یعنے وہ تو ہی ہو گیا یہ مہمل ہے اس کو یا پلٹ یا قلب ماہیت کو نظر کی کرامت کہیں یا جنون شوق کا اعجاز۔

اس کو شاید ہی میسر ہو کبھی توفیق دید   جو اسیر حلقہ امروز و فردا ہو گیا

اردو میں توفیق دینا اور توفیق ہونا تو کہتے ہیں مگر توفیق میسر ہونا نہیں بولتے قطع نظر اس کے یہ موقع "توفیق دید" کہنے کا نہیں ہے دولت دید یا دولت دیدار کہنا چاہئے تھا مصرعہ ثانی میں "اسیر حلقہ" بے معنی ہے اسیر پنجہ کہتے تو مصرعہ بامعنی ہوتا۔

اوٹھ سکا تم سے نہ بار التفات ناز بھی — مرحبا وہ جس کو تیرا غم گوارا ہو گیا

معشوق کی بے پروائی اور بے دماغی کو ناز کہتے ہیں عاشق کے واسطے اس لفظ کا استعمال قابل اعتراض ہے دوسرے مصرعہ میں مرحبا شاہ باش کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے اسلئے "مرحبا وہ" کہنا صحیح نہیں "مرحبا اس کو" یا "مرحبا اوس پر" کہنا چاہئیے۔ مصرعہ اولی میں تم اور مصرعۂ ثانی میں تیرا شتر گربہ ہے۔ مصنف جیسے شاعر سے ایسی غلطی قابل افسوس ہے۔

اپنی اپنی وسعت فکر و یقین کی بات ہے — جس نے جو عالم بنا ڈالا وہ اسکا ہو گیا

"عالم بنا ڈالنا" معلوم نہیں کہاں کی زبان ہے اور اس کا کیا مفہوم ہے "جس نے جو عالم بنا ڈالا" کے عوض جس نے اپنے کو مٹا ڈالا کہتے تو مصرعہ با معنے ہوتا۔

وہ چمن میں جس روش سے ہوکے گذرے بے نقاب — دیر تک ہر ایک گل کا رنگ گہرا ہو گیا

ہوکے گذرے یا بے نقاب ہوکے گذرے بول چال کے خلاف ہے۔ دیر تک کے الفاظ بھی بھرتی کے ہیں۔ "رنگ گہرا ہو گیا" یہاں مفید معنی نہیں رنگ پھیکا ہو گیا کہنا چاہئیے تھا۔

شش جہت آئینہ حسن حقیقت ہے جگر — قیس دیوانہ تھا محو روئے لیلیٰ ہو گیا

حسن مفرد محاسن جمع جس کے معنی ہیں خوبی اور بہ تعلق اعضا خوبصورتی کے معنے میں بھی اس اس لفظ کا استعمال کیا جاتا ہے پس "حسن حقیقت" کے معنی ہوئے حقیقت کی خوبصورتی یا حقیقت کی خوبی دونوں بھی مہمل ہیں قطع نظر اس کے آئینہ بذات خود نہ حسن ہے نہ حقیقت البتہ آئینہ حسن تھا ہے۔ مصرعۂ ثانی میں "دیوانہ تھا" کے بعد لفظ جو کی ضرورت ہے۔

عطارد

دزدیدہ نظر

وہ نگاہ ناز بھی یا برق تھی زیر سحاب! — یا کہ تھی پیمانۂ گل میں نشاط آور شراب

ہوش کیوں پّراں ہوئے یہ رہگیا کیسا اثر — طور پر رقصاں ہیں ابتک بجلیاں کچھ بے حجاب

طور کا جلوہ نہ تھا ہاں تھی وہ "دزدیدہ نظر" — کس طرح محفوظ رہتا پھر کوئی قلب و جگر

کام اپنا کرگئی جو کچھ اسے منظور تھا — یعنی ہستی کی عمارت ہوگئی زیر و زبر

رُباعیاتِ عمر خیام

۸

A book of Verses und-
-erneath the bough,
A jug of Wine, a loaf
of bread and thou
Beside me singing in the
wilderness. Oh. wilderness
were paradise enow.

ہو پاس کتاب شعر و سخن اور سر پہ صنوبر سایہ فگن
پھر قلقل مینا ہوش ربا۔ کچھ سر میں سرود عرق کہن
پھر شاہد مہوش تجھ جیسا اور محو ترنم نغمہ سرا
واللہ۔ بیاباں جنت ہے صحرائے مغیلاں رشک چمن

۹

Some for the glories of
this world; and some
Singh for the prophet's
paradise to come;
Ah, take the cash, and
let the credit go,
Nor heed the rumble
of a distant drum;

کچھ جاہ و حشم کے دلدادہ اور بہر تماشہ دنیا و آئے
کچھ جنت موعودہ پہ عبث امید بندھے فردا والے
امروز کا بہتر ہے سودا عاقل کہ ہوا عید فردا؟
یہ ڈھول سہانے دور ہی لیکن ڈھو میں نہ آ جو بجا ہے

۱۰

Look to the blowing
rose about us -- lo
Laughing she says, into
the world i blow,
At once the silken tassel
of my purse Tear and
its treasure on the garden
throw.

غنچہ چٹکا کچھ دیر ہنسا۔ پھر یوں محو فریاد ہوا
یک لحظہ شگفتہ ہو کر میں بیہودہ عبث ہی شیدا ہوا
بس ایک ہوا کا جھونکا تھا میں تھا کہ سرمایہ تھا
یہ طرۂ زریں پژمردہ۔ آناً فاناً برباد ہوا

م۔ ن۔ محشر

رستم و سہراب

جناب ضیاء عاکف
(کلکتہ)

رستم وسہراب کا افسانہ چین وجرمنی دونوں
جگہوں میں جلوہ گر ہے۔ لیکن جرمنی افسانہ اس
قدر میل نہیں کھاتا جو چینی افسانے میں پایا جاتا ہے
جرمنی افسانہ کچھ پلاٹ سے تطبیق کرتا ہے تو چینی
افسانہ پورے پلاٹ کے ساتھ ساتھ ہر کردار،
کردار کی ہر خصوصیت سے بدرجہ اتم تطابق رکھتا ہے
فرق ہے تو صرف ناموں کا۔ اب سوال پیدا ہوتا
ہے کہ آیا چینیوں نے اسے اہل فارس سے لے کر
اپنا ماحول دیا، یا فردوسی نے اسے چینیوں سے لیا
اور اپنے شاہنامہ کی زینت بنالی۔ جب ہم شاہنامہ
کی ورق گردانی کرتے ہیں تو یہ سوال نہایت اہم
بن جاتا ہے، چونکہ فردوسی نے بار بار چین کا تذکرہ
کیا ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

بدو گفت کز چین یکے نیک خو
نبوی بیامد بہ نزدیک شاہ
گمانم کہ آں چینی آں پہلو است
کہ گونہ ساز و سلاحش نوا است
چنیں داد پاسخ کہ داناچین
یکے داستانے زدست ندیں
ہمی خواں تو برکردگار آفریں

وز آید بروسوئے دریائے چیں
نہ دریائے چیں تابکرماں رسید
ہمہ روئے دریا سپہ گسترید

بہر نوع، یہ ایک تحقیق طلب سوال ہے جس کے
جواب کے لئے لافر LAWFER جیسے شخص
کی ضرورت ہے جو ایرانی اور چینی تہذیب وتمدن
سے صحیح واقفیت رکھتا ہو۔ فی الحال، جہاں تک میرے
جواب کا تعلق ہے وہ یہ ہے کہ سیتھانیوں نے
جب وسط ایشیا میں اپنا اقتدار قائم کیا تو ان کے
اثرات دور دور تک پھیل گئے۔ فارسی افسانوی
ادب تو مالامال ہو گیا جس پر آج بھی اہل فارس
کو ناز ہے۔ بہت ممکن ہے کہ ان اثرات سے چینی
افسانوی ادب بھی بچتے بچتے نہ بچ سکا ہو۔ میرے
اس خیال کی تصدیق تاریخ کردیتی ہے
کہ وُونگ نے ۱۲۵ھ ق م میں
مغربی چین کی سرحدی قوموں کو جمع
کیا۔ ان سے مذہبی درخواست کی اور ان کی قوت
کے بل حکمران ہوا اور اس طرح چاؤ خاندان کی
بنیاد رکھی جس کا سلسلہ ۱۲۲ھ ق م تک چلتا
رہا۔ وُونگ کی یہ کامیابی اگر پوری نہیں تو بھی

حد تک سیستانی اثر کی رہین منت تھی۔ ایسی حالت میں اس امر سے کیا کوئی انکار کرسکتا ہے کہ چینی تاریخ جب متاثر ہوئی تو چینی ادب بچا رہا۔

اس زمرے میں یہ بات بھی قابل تذکرہ ہے کہ ایک عرصہ تک خلیج فارس کے ساحلوں سے اکثر جہاز بحر ہند کو چیرتے ہوئے چین کے دامن تک پہنچتے تھے۔ یہ سلسلہ عربوں کی فتح کے بعد بھی صدیوں تک جاری رہا۔ ان دنوں جو چیز بھی ملک چین کو پہنچتی تھی چین والے اسے ایرانی طبع و ذہن کی پیداوار سمجھتے تھے خواہ وہ ہندوستان یا عرب یا لنکا یا افریقہ ہی کی بنی ہوئی کیوں نہ ہوتی چینیوں کی نگاہوں میں اہل فارس، اجناس فارس کی جب یہ قدر تھی تو ان کے خیالوں، قصے اور کہانیوں کی قدر کیا نہیں ہوئی ہوگی؟

مختصراً، چینی تہذیب و عقائد پر باہر والوں کا جو اثر پڑا۔ بقول لافر اس میں سیستانی پیش پیش تھے۔ ہاں، تو رستم و سہراب چین میں لی چنگ اور اس کے بیٹے نوچا کی لڑائی کے نام سے مشہور ہے۔ لیکن یہاں مذہبی رنگ غالب ہے جس سے رستم و سہراب پاک ہے۔ اس کی وجہ فردوسی کا ترقی یافتہ دماغ تھا جس نے اپنے افسانے میں مذہبی رنگ دکھلانا اپنی کمزوری ظاہر کرنے کے مرادف سمجھا۔ مگر چینیوں نے اس کے خلاف سمجھا اور اسے اپنے عقیدے اور معیار کے مطابق ڈھال لیا۔

اس کی وجہ شاید بدھ مت کا اثر تھا جس کے تحت وہ یہ سمجھتے تھے کہ کوئی شخص اسی وقت کوئی انوکھا کام کرسکتا ہے جبکہ وہ اوتار ہے نیم خدا ہو۔ چنانچہ اونھوں نے نوچا کو اوتار کا درجہ بخشا۔

لیکن فردوسی نے سہراب کو رستم و تہمینہ کی محبت کی یادگار بناکر پیش کیا۔ وہ یادگار جس کا دل تہمینیہ کی رستمی محبت سے مخمور، جس کے بازو رستمی شجاعت سے معمور تھے وہ ایک انسان تھا اوتار نہیں۔

نوچا اور سہراب دونوں غیر معمولی طبع کے تھے۔ مگر سہراب فطری حالت میں ظاہر ہوا اور نوچا غیر فطری حالت میں منظر عام پر آیا مثلاً رستم و تہمینیہ جب جدا ہونے لگے تو رستم نے اپنی چہیتی تہمینیہ کو ایک جواہر نگار مہر دی کہ وہ ان کی ہونے والی یادگار کو بطور پدری نشانی دیدے مگر نوچا نے جو مہر پائی وہ بطن مادر ہی میں پائی اور جب پیدا ہوا تو لوگوں نے دیکھا کہ اس پر لکھا ہوا تھا۔

"زمین و آسمان کا افق"

اس مہر میں معجزائی خصوصیت تھی۔ اس کا پہننے والا خطرناک سے خطرناک دشمن کو موت کے

منھ میں جھونک ڈالنے کی پوری طاقت پالیتا
تھا۔ چینی رستم و سہراب میں سوائے ان مذہبی
جھلکیوں اور کوئی خاص فرق نہیں ہے مثال
کے طور پہ جب سہراب سات ماہ کا ہوا تو
سال بھر کا۔ اور سات سال کی عمر میں دس
برس کا معلوم ہو رہا تھا اور جوانمردی کا یہ
عالم تھا کہ ملک کے نوجوان اس سے الجھنے
میں ڈرتے تھے۔ اسی طرح چینی افسانے کا
ہیرو جب سات سال کا ہوا تو اس کا قد
چھ فٹ کا ہو چکا تھا۔

دونوں افسانوں میں ایک ہی طرح کا
رومان بھی جھلکتا ہے۔ سہراب نے سفید قلعہ پر
حملہ کیا اور قلعہ کے وطن پرست، جنگ آزمودہ
محافظ "ہجیر" کو قید کر لیا۔ سہراب کے اس ستم
پر قلعہ کے حاکم کی دختر گرد آفرید کا دل قابو
میں نہ رہا۔ وہ انتہائی جوش و غضب کے ساتھ
اپنے باپ گژدہم کا بدلہ، وطن کا انتقام لینے
کے لئے دوڑی۔ مگر فوراً اس کے وطنی ولولے
انتقامی شعلے سرد پڑ گئے اور اس نے اپنے
دشمن کو اپنے دل کا مالک وطن کا محافظ
بنا کر استقبال کیا۔

ہو بہو یہی واقعہ چینی افسانے میں
بھی واقع ہے۔ نوچا نے جب ٹینگ چیو
کینگ کو بری طرح شکست دیدی تو اس کی
بیٹی اپنے باپ کا انتقام لینے کے لئے بھوکی
شیرنی کی طرح لپکی اور وطن کا جوش لئے
جھپٹی مگر جونہی نوچا کو اس نے دیکھا تو تپش
انتقام ایک سرد آہ بنی اور وطنی محبت نوچا
میں سمٹ آئی اور اس نے اپنے دشمن کو اپنا
دوست، اپنے وطن کا خیر خواہ سمجھ کر سینے سے
چمٹا لیا۔ آنکھوں پر بٹھا لیا۔

چینی افسانے میں نوچا اپنی تمام ناتجربہ
کاریوں کے باوجود اپنے تجربہ کار باپ کو
مار بھگایا لیکن فردوسی نے واقعیت کا خیال
رکھا اور تجربہ کار باپ کو ناتجربہ کار بیٹے پر فتح
دی اور ڈرامائی کیفیت پیدا کرنے کیلئے باپ
بیٹے کو ایک دوسرے سے انجان رکھا۔ باپ نے
بیٹے کو موت کے سرد و سخت سینہ پر پھینک دیا
اور اسی وقت ایک المناک راز کا انکشاف
ہوا۔ اس انکشاف نے ایسا تاثر پیدا کیا جس سے
چینی افسانہ بالکل محروم ہے۔

نوچا اوتار تھا، لافانی تھا — لافانی بنا۔
سہراب اوتار نہ تھا، لافانی نہ تھا مگر لافانی بنا۔
نوچا پر عظمت تھا مگر سہراب کی طرح پر عظمت
نہ بن سکا، چونکہ اس کی عظمت ایک خاص
طبقہ کے لئے تھی اور سہراب کی عظمت ہر زمانے

ہر طبقہ کیلئے ہے۔

تو چالا فانی بن کر لافانی نہ بن سکا
سہراب فانی بن کر لافانی بنا رہا

مرد.......

اپنے خاوند پر شک کرو تو وہ تمہیں دھوکہ دیگا ـــــ شک نہ کرو تو بھی دھوکا دیگا۔

اگر کبھی مرد کے دانت نقلی ہوں تو یہ ہرگز نہ سمجھو کہ اس کے پاس صرف ایک ہی چیز نقلی ہے

اگر عورتیں بلیاں ہیں تو مرد کتے ہیں۔ بلیاں آگ کے نزدیک بیٹھ کر گرم رہنا چاہتی ہیں، کتے یہ چاہتے ہیں کہ باہر نکل کر اپنے شکم کی آگ بجھائیں اور لڑئیں۔ مگر دونوں میں کون زیادہ دلیر ہے؟ کتے کو مارو اور وہ تمہارے قدموں پر لوٹے گا۔ بلی کو مارو تو وہ اچھل کر کھال نوچ لیگی۔

ممکن ہے بدصورت مردوں میں ان کے "خوش شکل" بھائیوں سے کم عیب ہوں لیکن خدا بچائے ایسی صبح سے جبکہ تمہیں بیدار ہوتے ہی بدصوت قسم کے مرد سے چلا کر کہنا پڑے "خدارا ــــ نیک بنو"

عورت مرد کی برائیاں دیکھتے ہوئے بھی اس سے محبت کرتی ہے۔ بعض اوقات محض ان برائیوں کے لئے ہی لیکن جوں جوں مرد عورت کے عیب دیکھتا ہے اس کی محبت گھٹتی جاتی ہے۔

باالآخر میں یہ کہوں گا۔

" مرد چاہے درندے ہوں یا مطلبی اور مغرور۔ ان میں چاہے دنیا کے سب عیب ہوں لیکن ہم ان کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتیں جس طرح وہ ہمارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے۔

اور

"جس چیز کا علاج نہیں کیا جا سکتا اسے برداشت کرنا ہی پڑتا ہے۔

بھارت چند

"خواب"

(نوٹ:- ایک بوڑھے نے اپنی جوانی میں یہ خواب دیکھا تھا تو یہ بوڑھے بھی کبھی جوان ہی تھے-)

جناب بشیر الدین صاحب

میں اپنے سفر کی کئی منزلیں طے کر چکا۔ سفر کو وسیلۂ ظفر کہا جاتا ہے۔ ممکن ہے کہ صحیح ہو، اس معنی کرتے کہ کامیابی سخت محنت اور تلخ تجربوں کے بعد حاصل ہوتی ہے۔ منزل مقصود کو پہنچنے تک خدا جانے اور کتنی بلاؤں کا سامنا کرنا پڑے اور کتنی مایوسیوں کا منھ دیکھنا نصیب ہو۔ یہ منزل جس کو میں اب طے کر رہا ہوں سب سے زیادہ کٹھن منزل معلوم ہوتی ہے۔ قدم قدم پر تمناؤں کا خون دیکھ رہا ہوں۔ حسرت ویاس کی گرد نے مجھے گھیر لیا ہے۔ عقل کی یہ تدبیر کہ اس گرد وغبار کو چیر کر امید کی روح افزا کرنوں تک پہنچ جائے نا کام ہوتی نظر آتی ہے۔ ہمت اور استقلال کے پاؤں اس تاریکی میں ڈگمگاتے دکھائی دیتے ہیں۔ راستہ سجھائی نہیں دیتا ہر وقت راستہ بھٹکنے کا خوف لگا ہوا ہے۔ یہ بھی خبر نہیں کہ اس وقت جو راستہ اختیار کیا گیا ہے وہ سیدھا ہے اور کسی آرام دہ منزل تک پہنچانے والا ہے۔ خیر ہر چہ بادا باد۔ چلنا ہی پڑے گا۔ ایک جگہ تو رک نہیں سکتے۔ بہر حال سفر ختم کرنا ہے۔ اور ختم کرنا پڑے گا۔ کاش کوئی خضر دستگیری کرتا اور سیدھے وسہل راستہ پر لگا رہتا۔

میں تاریکی میں ایک ایک قدم اٹھاتے تھک گیا ہوں۔ سامنے چوراہہ نظر آتا ہے۔ خدا جانے مجھے یہ راہیں کہاں لیجائیں گی اور کس پر چل کر منزل مقصود پر پہنچونگا۔ اب مجھ میں اتنی تمیز باقی نہیں کہ راستہ کو پہچان سکوں کہ یہ کدھر کو جاتا ہے۔ تختیاں بھی تو نہیں لگی ہیں اور نہ کوئی ایسا آدمی نظر آتا ہے جو ان راہوں سے بخوبی واقف ہو اور مجھے ہر ایک کی تفصیل بتائے نہیں اس سفر میں جو کچھ کرنا ہے مجھی کو کرنا ہے اوروں سے امداد کی توقع بیکار۔ گلہ کیا ہے۔ ہر شخص اپنی اپنی راہ پر گامزن ہے ہر ایک کو اپنی منزل کٹھن معلوم ہوتی ہے اس حالت میں اگر نفسی نفسی ہے تو تعجب کی کیا بات ہے خیر کچھ بھی ہو اسی راستہ پر چلوں جس پر اتبک

چل رہا ہوں۔ کیونکہ ہر موڑ خطرناک ہوتی ہے۔

اچھا کیا جو اسی راستہ پر چل پڑا۔ قریب میں ایک مکان دکھائی دے رہا ہے۔ شاید وہاں سستانے کو کچھ جگہ ملجائے یا کوئی ہمدرد میری دستگیری کرے اور مجھے سیدھا راستہ دکھائے۔ ارے! یہ تو مکان نہیں مندر معلوم ہوتا ہے۔ ہاں مندر ہے۔ مقدس مندر۔ اس میں دیوی رہتی ہے۔ احسان جتانے والے انسانوں کی امداد حاصل کرنے سے۔ بے نیاز دیوی کا احسان برداشت کرنا بہتر ہے۔ اسی سے راہ راست پر لگانے کی پرارتھنا کروں۔

مندر تو کوئی شاندار نہیں۔ لیکن مورتی سنگ مرمر کی ہے۔ عالیشان مندروں میں کاٹھ کی مورتیاں بڑی شان وشوکت سے عمدہ لباس میں ملبوس۔ زیورات سے آراستہ، گنگا جمنی تخت پر براجمان ہوتی ہیں ان کے چہرے خوفناک۔ آنکھیں خون آلود، بشرے سے درندگی عیاں، غصہ اور جلال کی مظہر ہوتی ہیں۔ ان میں کیا جاذبیت ہے کہ لوگ جوق در جوق ان کے درشن کے لئے کشاں کشاں چلے آتے ہیں۔ اندھا اعتقاد، ظاہری جگمگاہٹ! اچھے اچھے پڑھے لکھے بھی ظاہری ٹیپ ٹاپ پر مرے جاتے ہیں۔ خواہ اندر ہی خول ہی خول کیوں نہ ہو، دولتمند ان کاٹھ کی مورتیوں پر اپنی دولت نچھاور کرتے ہیں اور ان سے بھلائی کی توقع رکھتے ہیں۔ شاید اعتقاد کی پختگی سے انہیں کچھ مل جاتا ہو۔ لیکن ان کی آتما کو کما حقہ شانتی نصیب نہیں ہو سکتی۔ کیا کیا جائے۔ ظاہر بین نظریں ظاہر ہی دیکھ سکتی ہیں، باطن کا پتہ نہیں چلا سکتیں۔ ظاہر سے باطن کا اندازہ لگایا جاتا ہے، جو اکثر غلط ہوتا ہے۔ ظاہر ظاہر ہوتا ہے۔ باطن باطن۔ اگر ظاہر اور باطن ایک ہو جائیں تو درمیانی پردہ اُٹھ جائے اور یہ سارے جھگڑے آن واحد میں ختم ہو جائیں۔ اور ان کاٹھ کی پتلیوں کا طلسم ہمیشہ کے لئے ٹوٹ جائے اور سارا بھرم جاتا رہے۔ کاش! ایسا ہوتا۔

سنگ مرمر کی مورت۔ ہے تو پتھر کی، مگر اس میں جان ہے۔ اس کی اس سادگی پر ہزاروں زینتیں نثار۔ اس کی سنجیدگیوں پر ہزاروں نخرے قربان۔ جلال کا نشان نہیں ملتا یا جمال ہے۔ چہرے پر شگفتگی آنکھوں میں نور کی تجلی، لبوں پر ہر وقت مسکراہٹ، کھیل رہی ہے۔ میری نظر اس مورتی پر پڑی۔ میرے دل نے کہا کہ تیری آتما کو سکون اسی دیوی کی سیوا میں مل سکتا ہے۔ میں نے محسوس کیا کہ دیوی کی نظریں مجھ پر جمی ہوئی ہیں لبوں پر مسکراہٹ ہے۔ کون جانے دیوی کے دل میں کیا ہے؟ مندر میں سکون تھا، اور مندروں کا سا شور نہیں۔

مجھے تعجب ہوا کہ لوگ جوق در جوق اس دیوی کی درشن کے لئے کیوں نہیں آتے۔ اس مندر میں

معتقدین کا وہ ہجوم کیوں نہیں ہے جو اور مندروں
میں پایا جاتا ہے۔ شاید لوگوں کو خبر نہیں کہ یہاں
بھی ایک مندر ہے، اس میں ایسی دیوی رہتی ہے
ورنہ ناممکن ہے کہ لوگوں کو خبر ہو اور مندر میں ایسا
سناٹا چھایا ہوا ہو۔ یا یہ ہو سکتا ہے کہ نیا زمانہ نئی
روشنی چاہتا ہے، اور ایسی روشنی کہ دیکھنے والوں
کے آنکھوں کو چندھیا دے اور انہیں اندھا کر دے
ناقدر شناس زمانہ اس ٹھنڈی روشنی کو کیا جانے جو
دل کو سرور اور آنکھوں کو نور بخشتی ہے۔ اندھو!
اپنی آنکھوں کی خبر لو۔ اس ٹھنڈی روشنی کی طرف
آؤ۔ پھر کبھی چندھیا دینے والی تیز روشنی کی طرف
دیکھو گے۔ کاش! ان کی آنکھیں ان دونوں روشنیوں
میں تمیز کر سکتیں۔

دیوی کے درشن سے میرے دل پر خوف طاری
نہیں ہوا۔ امید کی ایک لہر دوڑ گئی۔ دل میں احترام
پیدا ہوا۔ بے اختیار دل نے چاہا کہ قریب سے جی بھر
دیوی کے درشن کروں اور اپنی بپتا سناؤں۔ اور
پرارتھنا کروں کہ دیوی مجھے اپنا داس بنالے تاکہ
میری آتما کو سکون اور شانتی نصیب ہو۔ اور میری
ناکام آشائیں سپھل ہو جائیں۔ میں ایک قدم
آگے بڑھا۔ مورتی کے نگہبان یا پجاری نے جس کو
مورتی پر بجا ناز ہے مجھے حقارت کی نظر سے دیکھا۔
اور للکار کر کہا: "خبردار! آگے نہ بڑھنا، تو نہیں
جانتا کہ یہ پوتر مقام ہے۔ تیرے سر اور چہرے کی طرف
نظر کر، تیرے لباس اور تیری حالت کو دیکھ، تو تھکا
ماندہ کئی منزلیں طے کیا ہوا ہے۔ تیرے سر اور چہرہ
پر گرد جمی ہوئی ہے۔ تیرے کپڑے میلے اور بوسیدہ
ہو رہے ہیں۔ تجھے یہاں تک آنے کی جرأت ہوئی۔
یہ منہ اور مسور کی دال، جا اور کوئی کاٹھ کی پتلی
دیکھ لے۔ اس بستی میں اور کئی مندر ہیں۔ جہاں تجھ
جیسے کے لئے بھی جگہ مل سکتی ہے۔ کاش تو کچھ اور رہتا ہو۔
میں کھڑا پجاری کی باتیں سن رہا تھا۔ پجاری کا
ایک ایک لفظ صداقت میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس کے
کسی لفظ کی تردید نہ کر سکتا تھا۔ میں عرقِ خجالت
میں غرق تھا۔ دل میں کہہ رہا تھا۔ کاش میں یہاں
نہ آیا ہوتا۔ پجاری نے میری ظاہری حالت دیکھی۔
مجھے تھکا ماندہ، غریب اور اچھوت سمجھا۔ اس کا کیا
قصور۔ اس نے جو دیکھا وہی سمجھا اور حقیقت بھی ہے
کہ دیکھی ہوئی چیز پر جتنا اعتبار اور یقین کیا جا سکتا ہے
اَن دیکھی چیز اور سنی سنائی باتوں پر نہیں کیا جا سکتا
پجاری بیچارا میرے دل کا حال کیا جانے۔ میں نے چاہا
کہ پجاری کی منت سماجت کروں اور اس احترام کو
ظاہر کروں جو دیوی کی نسبت میرے دل میں پیدا ہوا
ہے۔ اور اپنا دل کھول کر رکھ دوں۔ مگر پجاری کی
کڑی اور حقارت آمیز نظروں کو دیکھ کر اور اس کے
غیر متزلزل ارادہ اور عزمِ صمیم کے نظر کرتے مجھ میں

لب کشائی کی ہمت نہ رہی۔ اور یہ خوف دل میں جا
گزیں ہوگیا کہ کہیں مندر سے بالکل نہ نکال دیا جاؤں۔
اور دیوی کے درشن سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے محروم
کر دیا جاؤں۔

میں نے وہیں آکے رہنے کو غنیمت سمجھا میری
نظر پھر دیوی پر پڑی۔ دیوی کے مقدس چہرہ پر وہی
مسکراہٹ تھی۔ کون کہہ سکتا ہے کہ یہ مسکراہٹ حقارت
کی نہ تھی۔ بیجا مسکراہٹ ہے۔ مجھ جیسا فقیر دیوی کا
داس نہیں بن سکتا۔ کاش میری حالت کچھ بہتر ہوتی۔
کاش دیوی کے منھ میں زبان ہوتی اور پہلو میں
دل ہوتا۔ سنگ مرمر کی دیوی کے منھ میں زبان
کہاں۔ اور دل ہوگا بھی تو سنگ مرمر کا۔ مسکراہٹ
کی وجہ دیوی کے دانت اور فرط غم سے میری آنکھوں
میں آنسو چمک رہے تھے۔ کون بتا سکتا ہے کہ ان
دونوں میں کس کی آب و تاب زیادہ قدر و قیمت کے
قابل ہے۔ مجھ میں کھڑے رہنے کی طاقت نہ رہی۔

میں روتے روتے سیڑھیوں پر سو گیا۔
ساڑھے تین بجگئے "سحری" کا وقت ہوگیا کی آواز
نے مجھے جگا دیا۔ کتنا مایوس کن خواب! میرے
روزہ کی سحر اور میری تمناؤں کی شام ہوگئی ؛

ذوق دیدار سلامت ہے پردہ کیسا
سامنے سے مرے ہٹتی نہیں صورت تیری

امجد سے خطاب

مداح رسول پاک احمد ہیں آپ
اور شاہ رباعیات کے امجد ہیں آپ
توحید میں جمع ہوگئی ہے تثلیث
حسان ہیں۔ خیام ہیں سرمد ہیں آپ

خان بہادر محمد مظہر الدین صاحب صبا تھانوی

سر دھنتے ہیں سن سن کے کلام امجد
توقیر سے سب لیتے ہیں نام امجد
پھنسنے کیلئے آتی ہے ~~خود~~ آپ سے روح
پھیلا ہوا عالم میں ہے دام امجد

تراب علیخاں صاحب باز

غزل

(۱)

پروانہ جل رہا ہے تو جل جانے دیجئے
عاشق کی آرزو ہے نکل جانے دیجئے

کھا کھا کے غم جدائی کا پی پی کے خون دل
پلتا ہے اک غریب تو پل جانے دیجئے

رہ جائے نہ تیغ ادا تول تول کے
تلوار کچھ جھکی ہے تو چل جانے دیجئے

میں عرض حال زار کروں گا نہ آج سے
کیوں ہیں جبین ناز پہ بل جانے دیجئے

اپنا کرم نباہیئے اپنے فقیر سے
یوں ٹالئے نہ یوں اسے ٹل جانے دیجئے

اشرف برا نہ مانیئے واعظ کی بات کا
کچھ کچھ دماغ میں ہے خلل جانے دیجئے

جناب میر اشرف علی صاحب

خسرو سخن

معلوم نہیں ابتدائے آفرینش سے کتنے ہی "صاحب فن" پیدا ہوکر فنا ہو گئے - اور کتنی صورتیں خاک میں پنہاں ہو گئیں - یہاں تک تو خیر فطرت کا اٹل قانون ہے - لیکن کاش ان کے کمالات لالہ و گل ہی میں نمایاں ہوتے اور بیرحم دنیا ان کے کمالات کو پامال کر کے ریگ صحرا نہ بنا دیتی سچ پوچھئے تو اہل کمال کی قدر نہ کرنا اور ان کو حقیقی معنوں میں زندہ نہ رکھنا ان کی حق تلفی ہی نہیں بلکہ صناع عالم اور "صاحب فن" کے "پیدا کرنیوالے" کی ذوق آفرینش کی توہین - خیر وہ دن تو گئے جبکہ ہر صاحب کمال کا کمال جواہرات یا اشرفیوں میں تلتا تھا اس طرح "قدرت کی قدر" کیجاتی - آسمان کی ہزاروں گردش اور زمین کے سینکڑوں انقلاب کے بعد سچے صاحب فن پیدا ہوتے ہیں کہ دنیا ان کی تعریف کرتی ہے - ہمارا فرض ہے کہ ہم انقلاب دہر کے پامال شدہ ذرات کو جو کبھی افق ادب پر چاند تارے بن کر چمکتے تھے اور فراموشی کے گہرے بادل میں چھپ گئے ہیں ان کے نور اور تابانی کو پھر سے تاباں کریں اور ہندوستان کو ان سے روشناس کرائیں ورنہ ان کی مظلوم روحیں آپ سے سوال کرنے کا حق رکھتی ہیں کہ

مکدر گر نہ کردی با تو گویم ۔۔۔ کہ با مشت غبار ما ہر چہ کردی

صاحبان ذوق اگر اس سلسلہ کو پسند کریں تو ہر پرانے شاعر نثار - مورخ - مصنف کی مختصر سوانح حیات اور تھوڑا سا نمونہ کلام یا نمونہ تحریر شہاب میں شائع کرا کر ان کو پھر ادبی دنیا میں زندہ کریں -

فاطمہ بیگم صاحبہ منشی فاضل (لکھنؤ)

اسی فراموش شدہ افسانہ کو پھر سے دہرانے کیلئے میں خسرو کا آپ سے تعارف کراتی ہوں ۔ فاطمہ

چنگیز خاں کا ظلم و ستم و خون ریزی نے اسلامی دنیا میں ہلچل ڈال دی تھی اور بیچارے امیر غریب اس مصیبت سے جان بچا کر جہاں پناہ ملتی نظر آتی بھاگتے تھے - اسی زمانہ میں ترکوں کے ایک سردار

امیر سیف الدین محمود ہندوستان آئے اور پٹیالی کے
قریب سکونت پذیر ہوئے۔ سلطان شمس الدین
التمشؒ نے اس گوہر بے بہا کو اپنے سلک میں منسلک
کر لیا۔ یہاں نواب عماد الملک کی دختر سے عقد کیا
اور اس سے ۱۲۵۵ء میں وہ ماہ شاعری طلوع
ہوا جس نے دنیا کو چمکا دیا۔ آپ کا نام ابو الحسن
رکھا گیا مگر مشہور خسرو ہی رہے۔ ایک مجذوب اور
دوسرے با کمالوں نے پیش گوئی کی تھی کہ خسرو اقلیم
شہرت و شاعری کا بادشاہ ہوگا۔

نو سال کی عمر میں آپ سایۂ پدری سے محروم
ہو گئے شاعری سے شوق تو آپ کو پہلے ہی سے
تھا نو سال کی عمر میں آپ نے خواجہ عزیز الدین
کے دئے ہوئے چار لفظ مو۔ بیضہ۔ خربزہ۔ تیتر
کو رباعی میں موزوں کر کے فوراً پڑھا جس سے
سب کو بہت تعجب ہوا۔ اس کے بعد آپ برابر
تحصیل علم میں مصروف رہے۔ ذوق سخن قایم رہا۔
پنج گنج آپ کی مشہور تصنیف ہے۔

آپ کو خدا رسیدہ بزرگوں کی خدمت کا شوق
ہوا اور آپ مشہور بزرگ سلطان المشائخ حضرت
محبوب الٰہی نظام الدین اولیاؒ کی فیض صحبت سے
فیض یاب ہوئے۔ سلطان المشائخ آپ کو بہت
چاہتے تھے۔

۱۲۹۵ء میں علاؤ الدین خلجی تخت نشین ہوا
خسرو کی تصنیف کا زیادہ حصہ اسی کے نام ہے
اس کی مدح کے ساتھ خسرو اس جبار قہار بادشاہ کو
ہر طرح کی نصیحت کرتا، اور ہر عیب کی نکتہ چینی کرتا۔
ایک قصیدہ میں لکھتے ہیں:-

چوں خدایت سریر شاہی داد
مملکت از ماہ تا بہ ماہی داد

سلطان قطب الدین مبارک کے معنون کر کے
مثنوی "نہ سپہر" لکھی جس کے صلہ میں بادشاہ نے ایک
ہاتھی کے ہموزن زر و جواہر عطا فرمایا۔ اس کے بعد
غیاث الدین تغلق تخت نشین ہوا۔ اس نے خسرو
کو مصاحبت میں لے لیا۔ اس قدر قدر کرتا تھا کہ کسی
کی نہ ہوئی تھی خسرو کی آخری تصنیف تغلق
نامہ اسی بادشاہ کے نام سے ہے۔
۱۳۲۳ء میں وہ بادشاہ کے ساتھ لکھنؤ بھی گئے۔
اسی عرصہ میں ان کو اپنے پیر سلطان المشائخ کے
انتقال کی خبر معلوم ہوئی وہ دہلی آئے اور بقول
صاحب سیر الاولیاء، سفینۃ الاولیاء شدت غم سے
تارک الدنیا ہو کر مزار پیر پر گوشہ گیر ہو گئے۔ چھ
مہینے غم اٹھا کر ۱۳۲۴ء میں انتقال ہوا اور وہیں
دفن ہوئے۔ خسرو کے انتقال کے ایک سو بہتر برس
بعد ۱۲۹۱ء میں مہدی خواجہ جو شہنشاہ بابر کے
امراء سے تھا سنگ سرخ کی جالی دار محجر تعمیر کرائی
اس کے بعد جہانگیر کے عہد میں محمد عماد حسن ابن سلطان

علی سبزواری نے ۱۶۰۵ء میں سنگ مرمر سے مقبرہ تعمیر کرا کر اشعار لکھوائے۔ تمام تذکرہ نویسیوں نے لکھا ہے کہ خسرو خوش اخلاق، سخی، راست باز، شفیق، مہربان، نیک تھے۔ موجودہ قوالی بھی آپ کی ہی ایجاد کردہ ہے۔ یوں تو خسرو فارسی کے بہترین انشاء پرداز تھے ——— اعجاز خسروی آپ کی نثاری کا معمولی سا نمونہ ہے۔ فارسی شعر گوئی کے تو کہنے کیا خسرو اقلیم سخن ہیں۔ اس کے علاوہ آپ برج بھاشا (جس سے مل جل کر اردو پیدا ہوئی) کے شاعر بھی ہیں جب کہ اردو شاعری یہاں بہت کم تھی خصوصاً مسلمان شعرا میں۔ آپ نے ہندی میں شعر کہے۔ گیتیں، دوہے بنائیے جو ابتک مشہور ہیں آپ کی بہت سی پہلیاں مکرنیاں انمل دوسخنے وغیرہ اب تک آپ کی یادگار باقی ہیں۔ آپ کے کلام کو ہندوستان میں جو مقبولیت حاصل ہوئی وہ ظاہر ہے۔ شیخ سعدی نے آپ کے کلام کو پسند کیا شاہزادہ اور سلطان کو لکھا کہ خسرو اس فن میں کامل ہے۔ اس کو مغتنمات سے سمجھ کر عزیز رکھو مولانا جامی آپ کی بہت عزت کرتے تھے ان کا قول ہے کہ خسرو نے ہر میدان میں قدم مارا ہے، قصیدے کہے غزلیات کا دیوان لکھا، مثنویاں لکھیں اور سب کو کمال کے درجہ تک پہنچا دیا۔ خسرو کو نظم و نثر میں یکساں کمال حاصل تھا بقول صاحب حیات خسرو فارسی کے اور باکمال شعرا خاقانی۔ ظہیر۔ انوری، قصائد فردوسی، رزم نظامی، مثنوی سعدی غزل اور اخلاقی مضامین میں منفرد تھے۔ لیکن خسرو کو ہر شعبۂ نظم میں کمال تھا۔

امیر خسرو عربی فارسی کے علاوہ ترکی ہندی کے باکمال بھی تھے۔ اور نظم و نثر دونوں میں یکساں کمال رکھتے تھے۔ آپ کا زیادہ حصہ کلام و نثر تو ضائع ہوگیا۔ یا آج یورپ کے کتب خانوں میں آپ کی تصانیف میں سے چند کے نام یہ ہیں۔

مثنوی قران السعدین۔ مثنوی مطلع الانوار۔ مثنوی شیریں خسرو۔ مثنوی لیلیٰ مجنون۔ مثنوی آئینہ سکندری، مثنوی ہشت بہشت، مثنوی خضر خاں۔ مثنوی نہ سپہر، مثنوی تغلق نامہ غرۃ الکمال۔ انشائے خسرو۔ اعجاز خسروی۔ افضل الفوائد۔ راحت المحبین وغیرہ وغیرہ۔ غرضکہ کوئی اس نہج سے کوزے میں دریا کیسے بند کرے۔ ع

سفینہ چاہیئے اس بحر بیکراں کیلئے

خسرو کا فارسی کلام ایسا دلکش اور پیارا ہے کہ میں باوجود بہترین کوشش کے ان کے لطیف کلام کا انتخاب نہ کر سکی بھلا تباہیئے رنگا رنگ کے حسین و نکہت بیز خوشبو سے بھرے ہوئے چمن میں کوئی کس پھول کو چنے اور کس کی خوشبو کی تعریف کرے۔ ممکن ہے بسمل صاحب اس میں کامیاب ہو سکیں اس لئے

اس گلچینی کو میں انہیں کے سپرد کرتی ہوں۔

(خسرو کے کلام پر ایک طویل مضمون عرصہ سے رکھا ہوا ہے۔ انشاء اللہ آئندہ کسی اشاعت میں درج کیا جائیگا۔ لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ مذاق پیشین کے اس وقت کتنے ستائش گزار ہیں، کیونکہ آج کل تو ہر طرف سے ادب آواز سے دماغ اس قدر ماؤف ہو رہے ہیں کہ سوچنے سمجھنے کی بھی صلاحیت باقی نہیں رہی)

شہاب ہی حیدرآباد دکن کا واحد ماہنامہ ہے جو آج ۲ سال سے وقت پر شائع ہو رہا ہے اس کو یہ فخر ضرور ہے کہ دو مہینے کا پرچہ کبھی ایک ساتھ شائع نہیں ہوا ضرورت ہے اس کی اشاعت میں آپ کی ہمدردیاں شامل ہوں آپ اور آپکے احباب نشر و اشاعت میں کوشش فرمائیں اور وہ حضرات جو ابتدا ہی سے اس کے خریدار ہیں ختم سال پر جب وی۔ پی ارسال ہو فوراً وصول کرلیں کیونکہ اکثر اوقات وی، پی کا آپ کو علم نہیں ہوتا اور آپکے ملازمین ڈاکیہ سے کہدیتے ہیں کہ خریداری منظور نہیں ڈاکیہ "زبانی انکار" لکھکر وی۔ پی دفتر کو واپس کردیتا ہے جس سے دفتر کو خواہ مخواہ مصارف عائد ہوتے ہیں اسلئے براہ کرم وی پی حاصل کرنے میں توجہ فرمائی جائے ورنہ اردو کے ایک خدمت گزار کو ناگوار اخراجات برداشت کرنا پڑتا ہے۔ منیجر

غزل

شوخی سے کشمکش نہیں اچھی حجاب کی
کھل جائیگی گرہ ترے بند نقاب کی

وہ موسم بہار وہ بلبل کا جھومنا
منقار میں لئے ہوئے پتی گلاب کی

شیشے کھلے نہیں ابھی ساغر چلے نہیں
اڑنے لگی پری کیطرح بو شراب کی

دو دن کی زندگی پہ الہٰی یہ غفلتیں
آنکھیں تو ہیں کھلی ہوئی حالت ہے خواب کی

ہوتے ہی صبح وصل کی شب دیکھتا ہوں کیا؟
تلوار بن گئی ہے کرن آفتاب کی

آتا نہیں کسی پہ دل بدگماں عزیز
جمتی نہیں کسی پہ نظر انتخاب کی

نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیز

واہمہ

فسانہ

ورنن فرنجل ایک ناہموار میز پر سر جھکائے بیٹھا تھا۔ جو وسط کمرہ میں بچھی ہوئی تھی دھوپ کی شعاعیں کھڑکی سے آرہی تھیں اوس کی نگاہیں جن سے حرص و آز ٹپک رہی تھی ایک کھلے صندوقچہ پر لگی ہوئی تھیں۔ دفعتاً اوس کی نظر ایک لانبے پتلے خوف پیدا کرنے والے سایہ کی طرف مڑی جو کمرہ کے فرش پر پڑ رہا تھا۔ یہ سایہ اوس خزانہ کے لئے ایک قابل نفرت بدنما داغ تھا جو گرد آلود چوبی میز کے تختہ کو رونق دے رہا تھا۔

سایہ سیاہ اور کسی موجود شئے کا وجود ہوتا ہے جس کے بلا وہم و گمان نمودار ہونے پر انسان کے دل میں خوشی و مسرت کا ولولہ پیدا نہیں ہوتا۔ ورنن فرنجل خوف سے دہل گیا اس انسانی خاکے کے لانبے پتلے ہاتھ کے کنارہ پر کسی سیاہ چیز کا دھبہ تھا۔ یہ ایک ریوالور کی چپٹی دبی ہوئی نال تھی۔ اگرچہ اس پرچھائیں میں کوئی حرکت نہ تھی۔ لیکن فرنجل کے حواس بجا نہ تھے۔ اس میں جنبش کرنے کی سکت نہ تھی کچھ دور دیوار پر اوس کی رائفل اٹک رہی تھی

لیکن اوس میں مڑ کر دیکھنے کی جرات نہ تھی۔ بے رونق آنکھیں غیر متحرک سایہ پر جمی ہوئی تھیں۔ پلکوں میں جھپکنے کی قوت نہ تھی۔ چہرہ بدرنگ ہو چکا تھا۔ حلق میں کانٹے تھے۔ منہ کھلا ہوا تھا اور اوس کے بدنما دانت نظر آرہے تھے۔

سایہ مٹ گیا۔ روشنی کی سنہری شعاعیں پھر کمرہ میں آنے لگیں۔ تاہم وہ گردن پھیر کر دیکھتے ڈرتا تھا۔ وہ کسی انتظار میں تھا۔ اور گہری سوچ میں کسی گذرے واقعہ کی یاد سے بےچین ہو رہا تھا۔ اس حالت میں کچھ ہی وقت گزرا ہوگا۔ وہ لپک کر کرسی سے دیوار تک پہنچا۔ رائفل کھینچ لی اور دبے پاؤں دروازے کی طرف اپنے شکار کے تعاقب میں رائفل لگا ہوں سے بچاتے انگلیاں لبلبی پر جمائے جھپٹا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ سفید ساحل نیلگوں سمندر جھومتے کھجور کے پتیوں کے درمیان سے نظر آرہا تھا۔ جا بجا پانی سے ابھری چٹانیں تھیں۔ جن پر غضب ناک موجیں الغاروں پانی پھینک رہی تھیں اور خشکی سے متصل سفید جھاگ کی سطح کہاتی اور بند ہو جاتی تھا۔

سامنے ریت کا میدان تھا لیکن ساحل اور میدان سنسان تھا۔ درمیانی دلدل سنسان تھا اور ناقابل فہم سمندر سورج کے نیچے اطمینان کے ساتھ مسکرا رہا تھا۔ اوس نے ادہر اودہر دیکھا۔ دبے پاؤں جھونپڑی کے اطراف چکر لگائے کوئی شخص نظر نہ آیا پھر صندوقچہ یاد آیا۔ اور اس کو کسی محفوظ جگہ رکھنے کے خیال سے وہ اندر واپس ہوگیا۔ یہ موتیوں سے بھرا ہوا تھا ہر دانہ ہزاروں میں منتخب تھا موتی ناہموار خام ناسفتہ نہ تھے سڈول اور آب دار تین قیمتی ہار بنانے کیلئے کافی تھے۔ یہ مشقت سے جمع کئے جاکر فروخت ہوتے تھے جن کے فراہم کرنے میں کافی وقت صرف ہوا تھا تاکہ دنیا کے کسی دار السلطنت کی دولتمند حسینہ ان کی زیبائش سے اپنے رقیب کی آنکھوں میں چکا چوند پیدا کردے یہ قتل و غارت کا مال اور معاملہ تھا اور فرنجل اس سے بخوبی واقف تھا۔

ایک ہاتھ میں بھری رائفل دوسرے میں صندوقچہ دبائے جب وہ کمرے میں کسی محفوظ مقام کی تلاش میں پھر رہا تھا۔ بار بار گھبرائی نظروں سے دروازے کی طرف دیکھتا جاتا تھا وہ اس دولت کا تنہا حقدار نہ تھا بلکہ کوفر KOHER اور N. ANZ بولنگ BOLINK جم بھی اس میں شریک تھے۔ اور یہ دونوں اس خوفناک مہم کے لازمی جزو تھے۔ لیکن فرنجل کا یہ منشا کبھی نہ تھا کہ وہ دونوں اب اس خزانہ کے حصہ دار ہوں۔

ایک بڑھے جوہری ڈبنی نے جو سڈنی کا رہنے والا تھا اس غارت گر کہلونے کو جمع کیا تھا وہ چوروں کے خوف سے کبھی اس ذخیرہ کو اپنی دوکان میں نہ رکھتا تھا بلکہ گودی کے کنارے ایک محفوظ مکان میں موتی پر موتی جوڑتا تھا۔ ایمانداری اور خندہ پیشانی سے قیمت کی ادائی کیا کرتا تھا لیکن بےخبر تھا کہ عقاب کی تیز نگاہیں اوس کے روزافزوں بڑھتے خزانہ کو تاک رہی ہیں۔

بڑھے جوہری کو قتل کر دینا آسان تھا اور مقام واردات سے بلا کسی شبہ کے فرار ہو جانا کچھ کم آسان نہ تھا لیکن کوفر اور جم سے چھٹکارا پانا بہت مشکل تھا۔ فرنجل نے اس کام میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا ایک صبح کوفر ماہی گیر کی کشتی میں سمندر کے کنارے پہاڑیوں سے محصور مقام میں اپنے ساتھیوں سے ملنے آیا تھا لیکن پھر واپس نہ ہوا اور اس کی لاش موجوں پر تیرتی نظر آئی۔

(باقی)

بہ سرپرستیٔ
محترمہ بیگم نواب سر مہدی یار جنگ بہادر صدر المہام تعلیمات
شہاب
ناہید

ناہید

جلد | شہریور ۱۳۵۳ الف م جولائی ۱۹۴۴ء | نمبر ۱

۱۔ سوانح حضرت زرتشت، ملیزہ بانو کاؤس جی نے لکھا ہے۔ بہت کم خواتین حضرت زرتشت کے حالات کا علم رکھتی ہوں گی اون کے معلومات کے لئے یہ مضمون مفید ہوگا۔ توقع ہے کہ ملیزہ بانو آئندہ کسی اشاعت میں اپنی قوم کے رسم و رواج شادی بیاہ عادات و خصائل پر کچھ لکھیں۔

۲۔ لفافہ۔ شیلا کا بھجوایا ہے اس بحث کا تصفیہ آپ کریں۔ یہ ضرور ہے کہ عورت اس مسئلہ میں کبھی پہل نہیں کرتی۔

۳۔ بھلا کوئی بوجھے۔ عظیم النساء نے بھجوایا ہے

حل کیجئے کہ یہ کون ہوں گی اس کی ایک اور قسط باقی ہے۔

۴۔ غزل۔ اہلیہ مفتی میر اشرف علی صاحب نے بھجوائی ہے۔

۵۔ دنیا۔ جمیل النساء کی سعی ہے۔

۶۔ دودھ کا اسٹو۔ مس بی فخر الدین کا مرسلہ ہے۔ کبھی آپ نے ناہید کے لکھے ہوئے پکوان کو آزمایا بھی ہے؟

"ب"

سوانح حضرت زرتشت

منیزہ بانو کاؤس جی

دنیا کے قدیم پیشوایان مذہب میں حضرت اقدس زرتشت کا نام نامی ایک ممتاز مقام رکھتا ہے حضرت کے مقام و تاریخ ولادت کے بارہ میں بعض تاریخی اختلافات ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ملک ایران جسے حضرت زرتشت کا مقام مولود ہونے کا شرف حاصل ہے، صدیوں تک مسلسل سانحات کا آماجگاہ بنا رہا اور مختلف فاتحین نے اپنے مفتوحہ علاقوں کے شاندار ماضی کو بڑی ہی غفلت اور بربریت سے نیست و نابود کرنے کی کوشش کی جس کی لپیٹ میں ایران کی قدیم مذہبی کتابیں نابود ہو گئیں۔ سب سے بڑا نقصان جو سر زمین ایران کو ان یلغاروں کی بنا پر اٹھانا پڑا وہ "اوستا پاک" کا جلا کر بھسم کر دینا ہے اسکندر اعظم کے تحکم کا نتیجہ تھا اور سچ پوچھئے تو یہ ایک بدنما داغ ہے جس کی وجہ سے فاتح اعظم کی جبین داغدار نظر آتی ہے۔ بہرحال نتیجہ اس بربریت کا یہ مرتب ہوا کہ ایران آج اپنے متعدد تاریخی واقعات اور مذہبی عقائد سے محروم ہے۔ "اوستا پاک" کا ایک حصہ جو یونانیوں کے دستبرد سے بچ رہا۔ اسے یکجا کیا گیا جسے ایرانیوں نے "خوردہ اوستا" کے نام سے موسوم کیا یہ کتاب مقدس ایران کی قدیم زبان پاژند میں ہے اور یہی آج زرتشتیوں کے یہاں کتاب مقدس کی صورت اختیار کئے ہوئے ہے۔ ایرانیوں اور یونانیوں کے مابین جو جنگیں ہوئیں اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یونانی ایران پر قابض ہو گئے اور تقریباً ایک صدی تک ایران پر حکمران رہے اس کے بعد ایرانیوں نے رفتہ رفتہ اقتدار حاصل کیا اور طوق غلامی گلے سے نکال ایک نئی سلطنت کی بنیاد ڈالی جو "ساسانی" کے نام سے مشہور ہے شاہان ساسانی ایران پر تقریباً چار سو سال حکمران رہے اور اپنی انتہائی جد و جہد سے دین زرتشت اور ایرانی ادب کو حیات نو بخشی اور اسی دور میں ایران تہذیب و تمدن کا گہوارہ بنا گیا اور دنیا کی بڑی بڑی سلطنتوں میں اس کا شمار ہونے لگا لیکن افسوس باد مخالف کے تیز و تند جھونکے اس چار سو سال کے فراہم کردہ مواد کو خس و خاشاک کی طرح اڑا لے گئے یعنی عرب ایران پر حملہ آور ہوئے جس کی وجہ سے ایران کی

تاریخ میں ایک انقلاب عظیم پیدا ہوگیا انقلاب بھی کیسا، ایرانی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ایران سے بے تعلق کر دئے گئے، حکومت ان کے ہاتھوں سے چھین لی گئی، نتیجہ یہ نکلا کہ ایرانیوں کو ناقابل تلافی نقصانات سے دوچار ہونا پڑا۔ جو نایاب تصنیفات حامیان دین زرتشت کی جد و جہد سے بچ رہیں جن کے مشاہدہ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ حضرت زرتشت ۲۱۷۵ ق م علاقہ بلخ کے "دلے" نامی ایک شہر میں پیدا ہوئے۔ اس وقت ایران پر کیانی خاندان کا چوتھا بادشاہ لہراسپ حکمران تھا۔ حضرت کے والد محترم حضرت "پروشاسپ" اور والدہ محترمہ حضرتہ "دوغدو" ایک قدیم ایرانی خاندان موسومہ "سپیتمان" سے تھے حضرت کی زوجہ کا نام حضرتہ "ہووی" تھا حضرت کے تین فرزند اور تین لڑکیاں تھیں۔

پہلوی زبان کے مورخ حضرت زرتشت کی ولادت باسعادت کے متعلق یوں رقمطراز ہیں کہ آپ کی ولادت کی پیشین گوئی مافوق الفطرت واقعات اور معجزات سے ہوئی۔ حضرت تقدس مآب کے تولد کے وقت مکان کے اطراف ایک نور کا ہالہ دکھائی دیا اور جونہی حضرت تولد ہوئے، آسمان سے خوشی اور مسرت کے نعرے سنائی دئے اور حضرت نے بھی ایک قہقہہ لگایا اس طرح اس لمحہ میں حضرت ہنس رہے تھے جب کہ ہر نو مولود روتا ہے۔ حضرت زرتشت نے عالم طفولیت ہی میں اپنی غیر معمولی ذہانت اور شعور سے اہل شہر میں ایک سنسنی پھیلا دی، جب حضرت پندرہ برس کے ہوئے تو آپ کے والد ماجد نے آپ میں غیر معمولی قابلیت کا مشاہدہ کر کے آپ کو ایک جید عالم "برزین قروس" کی شاگردی میں دیدیا۔ بہت جلد اس فاضل اور کامل استاد نے اس بات کا اعتراف کیا کہ جو مافوق الفطرت شعور اور ذہانت قدرت نے حضرت کو ارزانی فرمائی ہے وہ اس کے اپنے علم و فضل سے بالاتر ہے۔ اس وقت حضرت زرتشت کی عمر پندرہ سال کی تھی۔

اس کے بعد حضرت کی زندگی کا وہ دور شروع ہوتا ہے جس میں آپ کا اکثر و بیشتر وقت قدرت کے مطالعہ اور تلاش حق میں گذرتا تھا اور آپ بالعموم مراقبہ میں رہا کرتے تھے، یہ وہ زمانہ ہے جب کہ آپ نے اپنے ارادے عوام پر ظاہر کرنے شروع کئے اور فاسد طاقتوں کی شکست کو اپنا نصب العین قرار دیا لیکن جب لوگوں نے آپ کی تعلیمات کو اپنے عقائد کیخلاف پایا تو آپ کی جان کے دشمن ہو گئے اور آپ کی راہ میں کانٹے بونے شروع کر دیئے لیکن

س سے حضرت کے عزم راسخ میں مطلق کوئی
فرق پیدا نہ ہو سکا اور حضرت نے برابر لوگوں کو
وجود اللہ اور راہ راست دکھانے میں حتی الامکان
کوشش کی، گو ایسا کرنے میں آپ کو متعدد
ناکامیوں اور مشکلات سے دوچار ہونا پڑا۔
یہ وہ زمانہ تھا جب کہ دنیا جہالت اور ضلالت
کا آماجگاہ بنی ہوئی تھی ظلم و زیادتی کا بازار
گرم تھا، خدا کی مخلوق اپنی زندگی کی غرض و
غایت سے بے خبر، خالق سے نا آشنا، نہایت
ہی بے بصیرتی کے ساتھ زندگی کے منازل
طے کرتی بڑھی چلی جا رہی تھی، زندگی کا کوئی
مقصد تھا نہ منزل، خود پرستی اور خود غرضی کا
دور دورہ تھا کہ ایسے وقت میں حضرت دعاؤں
کا نور، دلوں کا سرور بن کر اس عالم کون و فساد
میں حضرت حق ایزد تعالیٰ کا مظہر بن کر منصہ
شہود پر جلوہ افروز ہوئے اور حق و توحید
کی ایسی آگ مشتعل کی کہ جس کی تب و تابش
نے اہرمنی طاقتوں کو جلا کر بھسم کر ڈالا۔ اہل
ایران کا یہ دعویٰ ہے اور حقیقت و صداقت پر
مبنی ہے کہ حضرت زرتشت وہ پہلے مرسل ہیں
جنھوں نے اس دنیا پر بسنے والوں کو وحدت
الٰہی کا اولین سبق دیا! کیونکہ جب حضرت نے
اپنی تعلیمات کی اشاعت شروع کی اس وقت
وسیع کائنات پر کوئی مذہب یا گروہ ایسا نہ تھا
جس نے وحدت اللہ یا وجود ایزدی کی تلقین
کی ہو۔ اس تھوڑی بہت اشاعت سے
لوگوں کے دل و دماغ ضرور متاثر ہوئے لیکن
اس دور میں حضرت کی تعلیمات ایک مخصوص
طبقہ تک ہی محدود رہیں۔ اس کے بعد حضرت
زرتشت کی زندگی کا وہ دور شروع ہوتا ہے
جب کہ آپ نے قدرت کا عمیق مطالعہ شروع کیا
اور دنیا و مافیہا سے قطعاً عزلت نشینی اختیار
کر لی۔ اپنا تمام تر وقت پہاڑوں اور غاروں میں
بسر فرمانے لگے جو انکشافات اس دور میں حضرت
پر ہوئے ان کو آپ نے خلق اللہ کی خدمت
کے لئے محفوظ کر لیا۔ یہ دور حضرت زرتشت
کی زندگی میں ایک خاص اہمیت رکھتا ہے
کیونکہ اسی دور میں آپ کو نبوت حاصل ہوئی
تھی۔ مستند تواریخ اور مقدس کتابوں میں
حضرت کو نبوت حاصل ہونے کا واقعہ اس
طرح پر بیان کیا گیا ہے کہ ایک روز حسب
معمول حضرت زرتشت غار "سبالن" کے ایک
تاریک گوشے میں گہرے مراقبہ میں محو تھے کہ
یکایک یہ تاریک مقام منور ہو گیا اور کوہ کے
اطراف عناصر قدرت نے ایک شور برپا کر دیا
معلوم ہوتا تھا کہ پہاڑ کی بنیادیں متزلزل ہیں

اور تمام عناصر قدرت مجتمع ہوکر حضرت کو قادر مطلق کی جانب لیجا رہے ہیں۔ اس نور میں حضرت نے اپنی دیرینہ ریاضت کا ثمرہ ذات باری کی جھلک میں دیکھا اور "اشاسپندان" یعنی فرشتوں سے نمودار ہوکر وحی ہی نہیں پہنچائی بلکہ ایک صدائے غیب بھی آسمان سے سنائی دی کہ "پیغام حق کی تبلیغ کر" اس نزول اجلال کے بعد حضرت زرتشت فوراً اوٹھ کھڑے ہوئے اور دین الہی کی تبلیغ کا بیڑہ اٹھالیا۔ اسی دور میں حضرت زرتشت نے اپنی ضمیر کی گہرائیوں میں ان تمام شکوک کو حل کیا جو انسان اور ذات باری کے درمیان ایک خلیج حائل کرتے ہیں، زندگی کا مسئلہ، کائنات کا معمہ، اللہ تعالیٰ پر اعتقاد، نفس پر غلبہ، یہ سب مسائل اسی دور میں حل ہوئے، ان خوبیوں اور نبوت سے سرفراز ہونے کے بعد حضرت زرتشت نے اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی گمراہ مخلوق کا رہبر صادق بننے کا تہیہ کیا اور "نور" جس نے آپ کے لئے معرفت کے دروازے وا کردئے تھے اور "نور" جس میں آپ نے ذات باری کی جھلک مشاہدہ کی تھی اور "نور" جس نے آپ کو نبوت کے بلند مقام پر پہنچایا تھا اسی کو آپ نے اللہ تعالیٰ کی گمراہ مخلوق کی رہنمائی کا ذریعہ قرار دیا اور حق کی آگ روشن کرکے تاریکی اور ضلالت کو دور کرنیکی سعی فرمائی۔

غار "سبالن" سے مراجعت کے بعد ہی حضرت کی حقیقی تعلیمات کا دور شروع ہوتا ہے ابتداً میں حضرت کی تعلیمات پر عوام نے کوئی توجہ نہ کی۔ کیونکہ پشت ہا پشت سے ان پر ارواح پرستی اور عناصر پرستی مسلط تھی، پھر کیونکر ان سے یہ توقع کیجا سکتی تھی کہ وہ ایک ایسی قوت پر ایمان لائیں جو انسانی آنکھوں سے اوجھل ہے۔ المختصر حضرت نے عرصۂ دراز تک نہایت خندہ پیشانی اور صبر و استقلال اور صلح و آشتی کے ساتھ ان مصائب کا مقابلہ کیا اور آخرکار اہل ایران کو باطل پرستی کے عذاب سے نجات دلاکر راہ حق پر لانے میں کامیاب و کامران رہے، رفتہ رفتہ حضرت کی تعلیمات کا اثر ہونے لگا۔ پہلا شخص جو حضرت کے دین پر ایمان لایا وہ "میدمیومنو" آپ کا چچازاد بھائی تھا۔ یہ شخص حضرت کی تعلیمات کو عام کرنے میں ہمہ تن کوشاں رہا اور اس دین کے متعلق کئی کتابیں اسی شخص کا نتیجہ فکر ہیں، اس کے بعد شاہ لہراسپ بھی مشرف بہ ایمان ہوا، اور پھر ایک قلیل عرصہ میں ملک ایران کے ہر گوشہ میں دین زرتشت کے چرچے ہونے لگے اور دور دور سے جید عالم و مفکرین آکر اس دین کامل پر ایمان لانے لگے! یہ دور دین زرتشت کے کمال عروج کا کہلاتا ہے۔ اس کے بعد حضرت زرتشت کی زندگی

وہ دور شروع ہوتا ہے جب کہ آپ نے مختلف ممالک کا سفر کیا، اور اس دین الٰہی کو عام کرنے میں حتی الامکان کوشش کی اور اس میں بڑی حد تک کامیاب رہے۔ حضرت نے آذر بائیجان، بلخ، ایران، توران، ہندوستان، چین، اور ترکستان کا سفر کیا، چند مقامات پر آپ کا خیر مقدم کیا گیا، اور چند مقامات پر آپ کی تعلیمات سے اعراض بھی کیا گیا۔ لیکن حضرت نے حق و صداقت، استقلال و ثابت قدمی کو ہاتھ سے نہ جانے دیا اور ہر جگہ صلح و آشتی کو اپنی تعلیمات کی اشاعت کا ذریعہ قرار دیا اور جور و ظلم یا جنگ و جدال کو روا نہ رکھا، اس وقت حضرت زرتشت کی عمر ۴۲ سال کی تھی اور مذہب کی تبلیغ انتہائی نظم و ضبط کے ساتھ ترقی کی منزلیں طے کر رہی تھی، اور وہ لوگ جو باوجود دنیوی اعزاز و شوکت کے ایک بھٹکی ہوئی مخلوق تھے اب حضرت زرتشت کی تعلیمات پر ایمان لا کر بجائے ارواح پرست کے حقیقی یزدان پرست ہو گئے! اس طرح حضرت زرتشت نے اپنی ہی زندگی میں اللہ تعالیٰ کی رضا کو پورا ہوتے ہوئے مشاہدہ فرمایا اب لوگوں کے دل و دماغ پر حضرت کی تعلیمات نے ایسا گہرا اثر کیا کہ صدیاں گذر گئیں لیکن آج بھی اس حق کے رہنما کے قدر دان و پیرو دنیا کی بسیط و عریض سرزمین پر موجود ہیں۔

حضرت زرتشت کے دین کے چند بنیادی اصول یہ ہیں۔

۱- اللہ ایک ہے، قادر مطلق ہے، اس کا کوئی شریک نہیں۔

۲- ایک باعمل زندگی کے لئے یہ تین اصول اہم ہیں۔ "ہمت" (خیال نیک) "ہخت" (گفتار نیک) اور "ہورشت" (کردار نیک) (یہاں یہ واضح کر دینا مناسب ہے کہ ان تین اصولوں پر دین زرتشت کی بنیاد رکھی گئی ہیں، اور حضرت نے اپنی تعلیمات کی اشاعت میں بھی ان تین زرین اصولوں کو بہت زیادہ اہمیت دی جو حقیقتاً رضائے باری تعالیٰ کے لئے نہایت اہم ہیں)

۳- خالق کی نعمتوں پر شکر اور قناعت لازم ہے۔

۴- اللہ تعالیٰ کی مخلوق باہم مساوی ہے، بہ حیثیت انسان کسی کو کسی پر فوقیت حاصل نہیں ہے۔

۵- مغفرت ایک باعمل اور حق شناس کا حصہ ہے۔

۶- نجات اور حقیقی مسرت اسی کا حق ہے، جو محض اللہ کی خاطر نیکی کرتا ہے۔

۷- دنیوی زندگی میں انسان کو دو قوتوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے "اہورمزد" اور "اہرمن"

اول الذکر راہ راست کی نشان دہ ہے اور آخر الذکر انسان کو ضلالت کی طرف لیجاتی ہے، اللہ تعالیٰ نے انسان میں عقل کی تخلیق کی ہے، اسے چاہئے کہ وہ راہ راست اختیار کرے۔

(۸) وجود ایزدی ازلی اور ابدی ہے۔

جب حضرت زرتشت نے اپنے دین کا بول بالا ہوتے ہوئے دیکھا تو اپنے مقصد زندگی کو کامل تصور کیا اور (۷۷) سال کی عمر میں آتش کدۂ نوبہار میں فروکش ہوگئے۔ یہ بلخ میں واقع ہے اور پہلا آتش کدہ ہے جس میں کہ حضرت نے حق کی آگ روشن کرکے اپنا تبلیغی کام شروع فرمایا تھا، یہاں پر اس حقیقت کا انکشاف مناسب ہوگا کہ عام طور پر یہ بات تصور کر لیگئی ہے کہ زرتشتی آتش پرست ہیں، یہ سخت غلط فہمی ہے حضرت زرتشت چونکہ پہلے رسول اللہ ہیں، اس وجہ سے آپ کو وجود اللہ کا یقین دلانے میں متعدد مشکلات کا سامنا کرنا پڑا، اس زمانہ میں جہالت اور ضلالت کا بازار گرم تھا، مخلوق اپنے خالق کے وجود سے ناآشنا تھی۔ اس وجہ سے حضرت لوگوں کو اس وقت تک باور نہ کرا سکے جب تک آپ نے آگ یا نور کو (جس میں آپ نے ذات باری کی جھلک مشاہدہ کی تھی) ذات باری کا مظہر نہ قرار دیا۔ اس امر کو ملحوظ رکھتے ہوئے یہ کہنا بجا ہے کہ حضرت زرتشت نے آگ کو اللہ تعالیٰ سے قربت حاصل کرنے کا الہامی ذریعہ بنایا لیکن اپنا سر اسی کے سامنے خم کیا جو دین و دنیا کا مالک ہے جو حی و قیوم ہے، جو واحد اور لاشریک ہے۔

اس طرح پر ایام زندگی امن و امان میں گذر رہے تھے اور حضرت زرتشت دین الٰہی کا بول بالا ہوتا ہوا دیکھ کر شاداں و فرحاں تھے کہ ایران کو ایک زبردست طاقت کا مقابلہ کرنا پڑا، توران کا بادشاہ ارجاسپ ایران پر حملہ آور ہوا۔ اس حملہ کی یہ وجہ بتائی گئی ہے کہ اہل توران پر حضرت کی تبلیغ کا گہرا اثر ہو رہا تھا۔ کثیر تعداد میں لوگ اس دین کے پیرو بن رہے تھے یہ بات ارجاسپ کو نہایت ناگوار گذری اور اس نے بغض و کینہ کی بناء پر دفعتہً بلخ پر جو اس وقت ایران کے زیر حکومت تھا اور دین زرتشت کا مرکز بنا ہوا تھا، حملہ کر دیا، تاریخ ایران بلکہ زندگی حضرت زرتشت میں یہ جنگ ایک خاص اہمیت رکھتی ہے کیونکہ اسی جنگ کے دوران میں حضرت زرتشت نے ایک تورانی کے ہاتھوں جام شہادت نوش فرمایا، ضعیف شاہ لہراسپ تہ تیغ کر دیا گیا۔ آتش کدۂ نوبہار کی اینٹ سے اینٹ بجا دیگئی اور صد حیف۔ کہ وہ ہستی

جس نے خدا کی گمراہ مخلوق کو راہ راست تبلائی تھی، انہیں تاریکی وضلالت سے نکال کر نور تک لاکھڑا کیا تھا، وہ ظلم وتعدی کے ہاتھوں شہید ہوئے اور بقائے دوام حاصل کیا حضرت کی شہادت کا واقعہ تاریخوں میں یوں لکھا ہے کہ حضرت جب بلخ کے آتش کدۂ نوبہار میں مراقبہ میں محو تھے ایک تورانی نامی "براتہ رک رش" نے آپ پر وار کیا اور جس مقام کو کہ آپ نے اپنی زندگی کے آخر ایام کا ماوی وملجا قرار دیا تھا، اسی مقام پر جام شہادت نوش فرمایا۔ اس طرح دنیا کا سب سے پہلا خدا کا رسول اہل عالم کو پیغام حق سنا کر جان بحق تسلیم ہوا۔

غزل

اے غمزۂ جاناناں یہ جور وجفا کبتک
تڑپے گا دل مضطر دن رات بھلا کبتک

دل لیکے وہ برہم ہیں ہم جان ہی دیدینگے
تب دیکھئے وہ ہم سے رہتے ہیں خفا کبتک

ہیں جنگ کے شعلے بھی طوفان حوادث بھی
اب دیکھئے رہتا ہے یہ حشر بپا کبتک

دل منتظر جلوہ اک طور ہے سینہ میں
مجھ سے یہ ترا پردہ اے جلوہ نما کبتک

چتون سے تو پاتا ہوں آثار قیامت کے
یہ وعدۂ فردا بھی ہوتا ہے وفا کبتک

دل تنگ ہوں جینے سے کیا جانئے رہتی ہے
ارمانوں کی دنیا میں حرماں کی فضا کبتک

اس دل کی کلی کھلنا منظور نہیں تجھ کو
رکھے گی اسے بیکل اے باد صبا کبتک

ہے آگ لگی دل میں بجھنا ہے فقط باقی
اے جلوہ جاناناں پابند حیا کبتک

جس عشق کے صدقے میں پایا ہے وقار اپنا
کیا جانیئے زخم اس کا رہتا ہے ہرا کبتک

مرسلہ وقار النساء وقار

خبر نگاہ کو، نگہ چشم کو عدو جانے
وہ جلوہ کر کہ نہ میں جانوں اور نہ تو جانے

انشاء

زبان دہن میں تو غنچہ کے بھی ہے کیا لازم
کہ جس کے منہ میں زباں ہو سخنوری جانے

سودا

غم سے معمور، جبر سے لاچار
کیسے دل میں ترا بسیرا ہے

عباس

ایک لفافہ

گزاری ہیں خوشی کی چند گھڑیاں
انہیں کی یاد میری زندگی ہے!

کل صبح میں جب کالج پہنچی تو ایک عجیب قسم کی کیفیت مجھ پر طاری تھی، نہ جانے کیوں؟ صرف دو گھنٹے انگریزی پڑھائی گئی۔ اس کے بعد قرعہ اندازی سے لڑکیوں کو انتخاب کر کے یونیورسٹی بھیج دیا گیا۔ وہاں کسی بڑے شاعر کا تعزیتی جلسہ تھا۔ قرعہ اندازی سے میرا نام منتخب نہ ہو سکا لہٰذا میں کالج میں رہنے پر مجبور رہی۔ میری طرح کلثوم اور تنویر بھی جلسہ میں شریک نہ ہو سکی تھی۔

اثنائے طعام میں کلثوم نے ایک واقعہ بیان کیا جس کا مطلب تھا کہ بعض لڑکیاں محبت میں اپنی حد سے گذر جاتی ہیں۔ محبوب کے مزاج کا خیال کئے بغیر محبت کرنے لگتی ہیں جس کی وجہ سے ان کی محبت کو ٹھکرا دیا جاتا ہے۔

میں نے کہا "کلثوم! مجھے بھی ایک چشم دید واقعہ یاد آگیا۔ کہو تو سناؤں، یہ کہہ کر جواب کا انتظار کئے بغیر میں نے بیان کرنا شروع کیا۔

" میرے ایک رشتہ دار تھے۔ کسی دوسرے شہر کے رہنے والے۔ حیدرآباد آکر انھوں نے ایک رشتہ دار کے ہاں قیام کیا۔ روزآنہ سیر کو پبلک گرونڈ جایا کرتے۔ جب کبھی ان کی نظر آس پاس کے مکانات پر پڑتی تو ایک مکان کی کھڑکی سے دو آنکھیں انہیں گھورتی ہوئی نظر آئیں۔ وہ حیران تھے کہ یہ دیکھنے والا کون ہے۔ کئی دن گزر گئے۔ اور وہ آنکھیں بدستور ان کے چہرہ کی نگران رہیں۔ آخر کار ایک دن ایک چھوٹی سی لڑکی ان کے قریب آئی۔ اور رازداری کے لہجہ میں نام پوچھا۔ تم جانو یہ تو بھولے بھالے تھے ہی نام فوراً بتا دیا۔ اس کے دوسرے ہی دن جونہی یہ پبلک گرونڈ پہنچے۔ لڑکی نے ایک سفید لفافہ پکڑا دیا۔ یہ کچھ پوچھ بھی نہ سکے۔ کیونکہ لڑکی کبھی کی جا چکی تھی۔ لفافہ جیب میں رکھ لیا۔ اور چپکے سے گھر چلے آئے۔"

تھوڑی دیر میں یونہی لقمہ چباتی رہی پھر سلسلہ کلام جاری کیا۔

" مجھے یاد ہے ایک دفعہ بحث چھڑی تو میں نے کہا تھا کہ لڑکیاں بالعموم کبھی کسی بات میں پہل نہیں کرتیں ان کی نسوانی شرم انہیں ایسا

شیلا

کرنے سے باز رکھتی ہے۔" وہ خاموش نگاہوں سے
مجھے دیکھتے رہے۔ پھر کہا، ٹھیک ہے۔ مگر بعض
واقعات ثابت کرتے ہیں کہ یہ خیال غلط نہیں تو
بعید از قیاس ضرور ہے۔"

میں نے کہا "ہرگز نہیں۔ سینکڑوں مثالیں
آپ کو مل جائیں گی اور آپ کو یقین کرنا پڑے گا۔"
وہ ہنسنے لگے کہا "اگر میں ایک ہی مثال تمہارے
خیال کی تردید کے طور پر پیش کروں تو؟" اب
ہنسنے کی میری باری تھی۔ میں نے کہا "ہونہہ، ہم
بھی دیکھیں وہ کونسی مثال ہے۔"

"آؤ" انھوں نے آہستگی سے کہا۔ میں گھبرا گئی۔
کیا واقعی کوئی ایسی مثال وہ پیش کرسکتے ہیں، میں
سمجھتی تھی وہ کوئی قصہ بیان کریں گے جسے میں
آسانی سے جھٹلا سکوں گی۔ مگر خدایا — وہ تو
شاید ثبوت پیش کر رہے تھے۔

خیر میں پیچھے ہولی۔ کمرے میں پہنچ کر انھوں نے
کھڑکی بند کردی۔ شاید احتیاط کے طور پر اور ایک
بکس کھولا، وہی بکس جس میں نہ جانے وہ کیا کیا
چیزیں رکھا کرتے تھے۔ کبھی بھی میں نے اس کی
اندرونی شکل نہ دیکھی تھی۔ ایک دو دفعہ جب
میں کسی کام کے لئے کمرے میں گئی تو دیکھا تھا
کہ وہ بکس کھولے ہوئے بیٹھے ہیں اور اس میں
رکھی ہوئی چیزوں کو دیکھ رہے ہیں لیکن جونہی
میں قریب جاتی وہ لاپروائی سے بکس بند کردیتے
جیسے کوئی بات ہی نہ تھی۔ غرضکہ یہ وہی بکس تھا
جس میں رکھی چیزوں کو میں باوجود کوشش کے
نہ دیکھ سکی تھی۔

خیر انھوں نے چابی سے بکس کھولا۔ اور
اس طرح کھڑے ہوگئے کہ میری طرف پشت تھی اور
بکس ان کے سامنے میز پر رکھا تھا، بکس کھلا ہوا
تھا۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ انہیں سامنے سے ہٹا کر
خود دیکھ لوں مگر کلثوم! وہ کچھ ایسی شخصیت رکھتے
تھے کہ میں ان سے ڈرنے پر مجبور تھی۔

تھوڑی دیر بعد ایک بھورے رنگ کا لمبا
سا لفافہ انھوں نے میرے ہاتھ میں دیدیا اور بکس
بند کرکے چابی ہاتھ میں لے لی۔ میں سوچنے لگی کتنے
محتاط آدمی ہیں یہ کہ بکس تک کھلا نہ رہنے دیا۔

میں نے لفافہ کھولا تو اس کے اندر سفید
چھوٹا سا ایک اور لفافہ رکھا تھا۔ اس کے اندر
ایک پرچہ پر زنانہ تحریر نہایت ہی عمدہ خط میں
لکھی تھی۔ لکھا تھا کہ:-

"ہاں تو کلثوم اس میں لکھا تھا — میں نے
شروع کیا۔

جان سے زیادہ پیارے ـــــ (نام) سلامت،

کئی دنوں سے میں ارادہ کر رہی تھی کہ آپ کو
خط لکھوں مگر آپ کی بے التفاتی اجازت نہ دیتی تھی۔

آپ کو معلوم ہوگا کہ میں روزانہ آپ کے انتظار میں چشم براہ رہتی ہوں۔ سارا دن جس بے چینی میں گزرتا ہے وہ میرا ہی دل جانتا ہے۔ دو تین بار مجھے محسوس ہوا کہ آپ نے مجھے دیکھا۔ اگرچہ سرسری سے ہی مگر دیکھا ضرور۔ اور کیا لکھوں۔ اتنا بھی نہ دیکھ سکتی۔ اگر آپ اپنا نام بتا کر میری حوصلہ افزائی نہ کرتے۔ میں سمجھتی ہوں کہ آپ کی صورت سے زیادہ سیرت اچھی ہوگی۔ میرے درد کو بھی آپ محسوس کرتے ہوں گے۔

اگر آپ جواب دینا چاہیں تو اسی لڑکی کے ہاتھ بھیج سکتے ہیں۔ وہ کل منتظر رہے گی۔ فقط

طالب دیدار

"........"

"کلثوم! میں خط کے آخری حصہ پر جب پہنچی تو غور کرنے لگی کہ کیا واقعی وہ ایسے ہیں یعنی صورت سے زیادہ سیرت اچھی ہے۔ وہ انجان بنے ہوئے چابی سے میز پر ٹھوکے لگا رہے تھے۔ خط پڑھ کر میں نے جوں کا توں بڑے لفافہ میں بند کر دیا۔ اور سوچ رہی تھی کہ کیا یہ حقیقت ہے؟ اتنے میں انھوں نے کہا" لاؤ۔ اب تو غالباً تم سمجھ گئی ہوگی" میں چوٹ کھائے ہوئے انداز سے بولی۔" ہاں۔ کیا میں اس لفافہ کو اپنے پاس رکھ سکتی ہوں؟" نہیں نہیں" جلدی سے اونھوں نے کہا" تم اس کی حفاظت نہ کر سکو گی۔" "کیا آپ نے اس کا جواب دیا تھا؟" میں نے غیر متوقع طور پر سوال کیا۔" اس واقعہ کے بعد میں وہاں جا ہی نہ سکا۔ بدستور سنجیدگی سے جواب دیا۔

" مجھے اس لڑکی سے ہمدردی ہے۔ کاش! اسے معلوم ہو جاتا کہ آپ درحقیقت وہ نہیں ہیں جو بظاہر نظر آتے ہیں۔" میں نے خشک ہنسی ہنستے ہوئے کہا۔ وہ بولے" خیر اب تم لڑکیوں کی حمایت میں کچھ نہ کہنا۔ رہی ہمدردی تو وہ میں بھی رکھتا ہوں۔ نہ میں وہاں جاتا نہ بیچاری کو مجبور ہونا پڑتا۔" لفافہ دے کر میں کمرے سے چلی آئی۔ اگرچہ میں دیکھنا چاہتی تھی کہ بکس میں اور کیا ہے۔ شاید اس لڑکی نے کوئی تحفہ یا اپنی تصویر بھیجی ہو جس کی اتنی حفاظت ہو رہی ہے مگر ان الفاظ میں کہ" اس واقعہ کے بعد میں ادھر جا ہی نہ سکا" کچھ ایسی صداقت تھی کہ مجھے اپنا شبہ بے بنیاد معلوم ہونے لگا۔ اتنا بیان کرنے کے بعد میں خاموش ہو گئی۔ ہم نے کھانا بھی ختم کر دیا تھا۔ تنویر نے جواب تک خاموش بیٹھی تھی پہلی مرتبہ گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا" وہ صاحب کیا حقیقت میں اچھی صورت رکھتے تھے۔

" ہاں! کافی وجیہہ" میں نے پانی کا گلاس اپنے لبوں سے لگاتے ہوئے کہا" تو پھر ان کو

اس واقعہ سے اپنے پر ناز ہونے لگا ہوگا" تنویر نے سوال کیا۔

"نہیں تو"۔۔۔ میں ابھی کچھ اور کہنا ہی چاہتی تھی کہ کلثوم نے جلدی سے کہا:۔

"وہ ایسے آدمی نہیں ہیں تنویر" میں کلثوم کی بے ساختگی پر ہنس پڑی۔ وہ ٹھیک کہتی تھی۔ اس کے بعد ہم تینوں ٹہلنے لگے اور گفتگو کا رخ بدل گیا۔

غزل

خدا سب کو دے عشق و الفت کی دنیا
کرم کی عطا کی عنایت کی دنیا
پتہ بھی نہیں آج اون ہستیوں کا
تھی جن جن پہ نازاں محبت کی دنیا
بڑے انقلابات میں آ پھنسے ہیں
میسر نہیں ایک حالت کی دنیا
حقیقت کا اس میں بھلا ذکر ہی کیا
کہ ہے نام کی اور شہرت کی دنیا
یہاں خون پینے کو کھانے کو غم ہے
یہ دنیا بھی ہے کس مصیبت کی دنیا
سنا ہے فرشتوں نے سجدے کئے ہیں
کہاں آج وہ شان و شوکت کی دنیا
بھروسہ کے قابل کبھی تھی نہ اب ہے
جفا کی ستم کی شرارت کی دنیا
وہ حقانیت وہ سچائی کہاں ہے
کہاں جا بسی ہے صداقت کی دنیا
نہ کیوں دل کو حسنیٰ میں سینہ میں کھولا
یہ دنیا ہے اون کی سکونت کی دنیا

اہلیہ مفتی میر اشرف علی

"دُنیا"

دنیا ہے سرائے رنج و محن آماجگہ ظلم اور ستم
دوکان فریب رنگ و بو یعنی کہ سراپا رنج و الم
ہستی کا یقین اس گھر میں نہیں آتا ہے کوئی جاتا ہے کوئی
اے چشم بصیرت عبرت لے یاں عیش و مسرت آفت و ہم
نمود غرض یہاں کا ہر ذرہ مطلب کی پرستش کرتا ہے
یہ حرص و ہوس کی نگری ہے یہ زر کی دیوی کی مست قدم
جھوٹے ہیں یہاں سنسار کے نغمے جھوٹی ہیں سب اس کی تانیں
بازار فریب و مکر و ریا، میدان دغا اور بند غم
یہاں بھائی کا بھائی دشمن جاں اور باپ کا بیٹا سخت خلاف
ماں سے بیٹی اپنے بدظن بھائی بہن میں چشمک ہر دم
سو سال بھی جی کر کیا کیجئے جب موت مقرر آنی ہے
افسوس یہاں پر سب رہتے ہیں راہ روان ملک عدم
دنیا کی فضائیں زہر شکن مکروہ ہوائیں آفت جان
جائیں تو جمیل اب بچ کے کہاں دنیا ہے بڑی پر پیچ و خم

جمیل النساء بیگم جمیل

”بھلا کوئی بوجھے“

۱۔ ”صحیفہ نسائیت“ ہیں۔ یادِ رفتہ کا خوشنما نقش ہیں۔ چمن ادب کی ”بہار“ عروس علم کا سنگھار بھی۔ ”اخلاق“ کے گراں بہا جوہر ان کے پاس ملتے ہیں۔ آنکھیں روشن ہیں اور احساسات زندہ ـــــ بس دیکھنے والے کی روح اِن کے ساتھ پرواز کرنا چاہتی ہے۔ اس انسان نما درندوں کی بستی ہیں ـــــ زندگی کے پُرخطر راستہ پر خوفناک گھاٹیوں کے نشیب و فراز بتانے والی کامیاب ”رہبر“ ہیں۔ قوت قلم سے دوسروں کو جگا سکتی ہیں تخیل کی حسین دنیا میں اِن کے ساتھ پرواز کرنے کے لئے ”طاقت پرواز“ کہاں! یہی وجہ ہے یہ کچھ دور دور سی معلوم ہوتی ہیں۔

یہ میری ”روح“ ہیں۔

۲۔ ”چمن“ بھی ہیں اور بہار بھی ـــــ طوفان بھی ہیں اور ہوا بھی ـــــ سمندر بھی خود ہیں اور خود ہی ”موج“ ہیں۔ خود آنکھ ہیں اور سراپا ”بینائی“ ہیں۔ غمگین بھی ہیں اور غمگسار بھی۔ ـــــ آنسوؤں کا تار ہیں ہاں! مسکراتا تارہ بھی ہیں۔ بیدار چشمہ ہیں اور روح کی راگنی ہیں۔ المختصر ”زندگی کا نغمہ“ ہیں۔

یہ میری ”خوشی“ ہیں۔

۳۔ ”آرزوؤں کی بستی“ ہیں۔ اِن کے سکوت کا ”رنگ ناز“ تبسم کی شیرینیوں اور تکلم کی رنگینیوں کو مٹا دیتا ہے۔ ”فصل بہار“ انہیں ڈھونڈتی ہے۔ باغ کی رنگینیاں انہیں بار بار پوچھتی ہیں مسکراتے پھول اِن کے نام کو دہراتے ہیں۔ ”فنا“ کی گود سے بھی انہیں زندگی کی صدا سنائی دیتی ہے۔ ”متاع زندگی“ ہیں اور کبھی نہ اجڑنے والا باغ حیات ہیں بس دل کی ”رونق“ ہیں اور دماغ کی تازگی۔

یہ میری ”امید“ ہیں۔

۴۔ ”انسانیت“ کا روشن ذخیرہ ہیں اور زمین کی بیش بہا کائنات ـــــ زندگی کی مسرت ہیں۔ انتظار کی سانس ـــــ خیالستان کی بلبل اور چمنستان کی طوطی ہیں۔ اِن کے پاس زندگی منظر گریہ و ماتم نہیں ـــــ گو اِن کی صدا پر ”درد“ ہے۔ ہاں! اکثر نغمہ میں ”فریاد“ ـــــ ڈھونڈتی ہیں اور حقیقت کی جستجو میں خود ہی ”تلاش“ بن جاتی ہیں۔
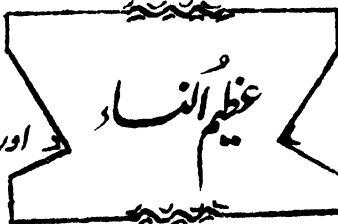
یہ میری ”تمنا“ ہیں

عظیم النساء

۵- ثریا کی لڑی میں سے یہ بھی ایک "ستارہ" ہیں- یہ چشمِ کور سے بھی اوجھل نہیں ہو سکتیں —— دنیا کے اندیشوں سے بہت دور —— نایاب روشنی ہیں- وقت کا ہر ثانیہ اِن کے وجود کی بے اندازہ اہمیت کا ثبوت دیتا ہے- انہیں دنیا "سلسلۂ قفس" معلوم ہوتی ہے اور انسان ایک قیدی بلبل —— دنیا کی "مہیب دلکشی" سے بہت گھبراتی ہیں- دل میں باغ و بہار کی ہوس نہیں ہے- ہاں! "حقیقت" کی تلاش ضرور ہے- زندگی کی اتھاہ "گہرائیوں" سے خوب واقف ہیں-

یہ میری "تسکین" ہیں-

۶- خوشنما "منظر" ہیں- بے داغ نظارہ معلوم ہوتی ہیں- پھول کی ہنسی اور کلیوں کا "تبسم" ہیں- "شفق کا آنچل" اور قوسِ قزح کی رنگینی ہیں- زندہ ہیں اور زندہ دل ہیں- کم مائیگی اور سلبِ ذات اِن کے پاس موت کی نشانیاں ہیں- سمندر ان کے "قابو" میں ہے- ہوائیں اِن کے قبضہ میں ہیں- سچے "دوست" کی تمام خوبیاں ان میں موجود ہیں- دلِ مضطر کی آواز ہیں اور کبھی نہ ٹوٹنے والا "ساز" ہیں-

یہ میری "غمخوار" ہیں-

۷- آنکھیں سلیمانی ہیں اور دل نورانی —— ضبطِ نفس اور تنظیمِ نفس کی منزلیں طے کر کے "معرفتِ نفس" کی منزل میں پہنچ گئی ہیں- بلند خیالات اور پاکیزہ مذاقِ فطرت کے دو بہترین عطیات ہیں جو اِن کو ملے ہیں- "نسائیت" کی تمام جھلکیاں ان میں موجود ہیں- فطرت کی تمام رنگینیاں ان کے بہترین جذبات پر "قربان" معلوم ہوتی ہیں- حیا اور خاموشی اِن کی ہمجولیاں ہیں- حسن و خوبی کی پرستار ہیں- حق و باطل کے "فرق" کو خوب جانتی ہیں- ماضی کا حسین دھندلکا ہیں- "طوفان کے بعد کا سماں" ہیں-

یہ میرا "خواب" ہیں-

۸- روحانی دنیا کی "نامہ بر" ہیں- قطرہ میں دجلہ دیکھتی ہیں- خواب کا پنہاں تبسم ہیں- غنچۂ مسرت ہیں- احساسات اوراقِ دیوان ہیں- اِن کے قدم کا ہر نقش ایک "منزل" ہے- عہدِ استوار ہیں- اور مکتبِ غمِ دل کی تفسیر ہیں- کتابِ حیات کا "صحیح مطالعہ" کرتی ہیں- انسانیت کا بہترین "درس" دیتی ہیں-

یہ میری "ہم خیال" ہیں-

(باقی آئندہ)

دیکھا کئے وہ مست نگاہوں سے بار بار
جب تک شراب آئے کئی دور ہو گئے

دودھ کا اسٹو

وزن :-

پانی	چھوٹی پیاز کی ڈلیاں	آلو	میدہ	دودھ	ادرک
ڈیڑھ سیر	۶ عدد	۱ عدد	تین چمچے	ڈیڑھ پاؤ	چھوٹا ٹکڑا
نمک	الائچی	لونگ	سیاہ مرچ	دارچینی	مکھن
حسب ضرورت	دو دانے	دو	۴ دانے	چھوٹا ٹکڑا	چھٹانک

ترکیب :-

پہلے پیاز اور آلو کو چھیل کر ڈیڑھ پاؤ پانی میں ادرک اور نمک کے ساتھ ڈال کر آگ پر رکھدیں - جب آلو اور پیاز بالکل گل جائیں اور دیگچہ میں صرف ایک چھٹانک پانی رہ جائے تو اسے اُتار لیجئے - پھر دودھ میں میدہ ڈال کر اچھی طرح سے ملا لیجئے خیال رہے کہ میدہ کی گھٹلی نہ رہنے پائے - پھر اس میں پیاز وغیرہ ڈال کر چولہے پر چڑھا دو اور اس میں الائچی لونگ، مرچ، دارچینی ڈال کر پانچ منٹ تک پکاتے رہیں، جب پک جائے تو نیچے اتار کر مکھن چھوڑ دیں - لیجئے اسٹو تیار ہے -

مس بی فخر الدین

محمودیہ مشین پریس چار مینار میں چھپ کر دفتر شہاب ڈبیرپور سے شائع ہوا -

اگست
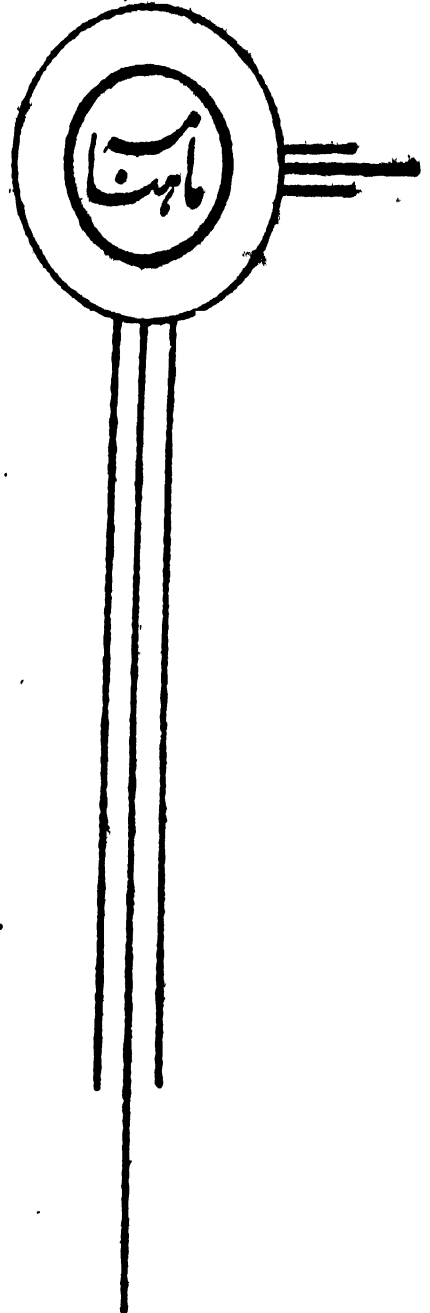
ماہنامہ

شہاب

شہاب

جلد ۱۲ مہر سنہ ۱۳۵۳ ف م اگست سنہ ۱۹۴۴ء نمبر ۱۱

(مرتبہ)

عوام سے سالانہ چندہ (للعہ)	محمد عبدالرزاق بسمل	گورنمنٹ سے (عـــہ)

کُل ہند اُردو کانگریس

پیام شاہانہ

"میری قلمرو میں بھی مختلف زبانیں بولی جاتی ہیں جو مجھ کو اپنی رعایا کی طرح یکساں عزیز ہیں۔ اُردو بھی ان ہی ملکی زبانوں میں سے ہے۔ پہلے یہاں کے دفاتر کی زبان فارسی تھی لیکن نصف صدی سے زیادہ عرصہ ہوا کہ اُردو نے اس کی جگہ لی اور اب وہ اس ریاست کی سرکاری زبان ہے اس کے علاوہ وہ ہندوستان کے بعض صوبوں اور ریاستوں میں بولی اور اکثر دوسرے حصوں میں سمجھی جاتی ہے اس طرح اس کا شمار ملک کی ان زبانوں میں ہے جو کسی خاص فرقہ کی زبان نہیں۔ چنانچہ اس کی بنیاد ہندوستان کے دونوں بڑے فرقوں کے میل جول نے ڈالی ہے۔ ان ہی وجوہ کی بناء پر میں نے جامعہ عثمانیہ کی بنیاد ڈالتے وقت انگریزی کے بجائے اردو زبان کو اس کا ذریعہ تعلیم قرار دیا۔

"مجھے یہ معلوم کر کے مسرت ہوئی کہ ایک کل ہند اردو کانگریس قایم کی گئی ہے، جس میں ہندو اور مسلمان اصحاب دونوں شریک ہیں اور جس کے آئندہ اجلاسوں کی تنظیم میں نہ صرف حیدرآباد بلکہ سارے ہندوستان کے وہ ادارے جو اردو یا ہندوستانی سے دلچسپی رکھتے ہیں یا اس کی خدمت کر رہے ہیں ہاتھ بٹانے کے لئے تیار ہیں

"میں توقع کرتا ہوں بلکہ مجھے یقین ہے کہ ارباب کانگریس اس اجلاس اور اس کے آئندہ اجلاسوں کو فرقہ واریت سے ہر طرح دُور رکھیں گے چنانچہ میرے ملکی روایات بھی یہی ہیں اور میرا اور میری حکومت کا یہ شعار رہا ہے کہ مختلف اقوام اور مذاہب کے ساتھ ہمیشہ رواداری کا برتاؤ کیا جائے۔

"مجھے امید ہے کہ کل ہند اردو کانگریس ہندوستان کی دونوں بڑی قوموں کی اس مشترکہ زبان کی آئندہ ترقی اور توسیع کا اس طرح ذریعہ بنے گی کہ ان کو ایک دوسرے سے قریب تر اور صحیح معنوں میں یک دل و یک زبان بنا دے۔ خدا آپ کی ان ساری کوششوں کو بار آور کرے۔"

شهر رمضان الذی انزل فیه القرآن

دنیا ایک تماشا گاہ حوادث ہے جس کے مناظر دمبدم متغیر ہوتے رہتے ہیں۔ اس کا نقاب جسم و صورت ایک جلوۂ نیرنگی و بوقلمونی ہے، جو حوادث و انقلابات عالم کے ہاتھوں ہمیشہ بدلتا رہتا ہے، یہ تغیر عام ہے، اور تجدد و تبدل کے قانون سے کائنات کی کوئی شئے خالی نہیں۔ جس طرح انسان کی عظیم الشان آبادیوں اور بحر و بر کے بڑے بڑے رقبوں میں انقلابات و تبدلات ہوتے رہتے ہیں۔ اسی طرح اُن غیر مرئی ذروں میں بھی ایک محشر تغیر اور رستخیز تجدد بپا ہے، جس سے جسم کائنات کے اجزا طبیعیہ ترکیب پاتے ہیں، اور جو اس قدر چھوٹے ہیں کہ انہیں انسان کی چشم غیر مسلح[1] نہیں دیکھ سکتی۔

۶۱۰ء ایسا ہی ایک انقلاب روحانی تھا، جو اب سے ٹھیک ۱۳۔سو ۴۴ برس پہلے دنیا میں ہوا۔ جبکہ دنیا تغیر کے لئے بیقرار اور تبدیلی کے لئے تشنہ تھی۔ اور جب کہ کوئی نہ تھا جو اس کی پیاس کو بجھائے اور اس کے لئے مضطرب ہو۔ وہ سمندروں کی طغیانی نہ تھی جو زمین کی بستیوں پر چڑھ آتے ہیں، بلکہ سرچشمۂ ہدایت و فیضان الٰہی کا ایک سرجوش آسمانی تھا جو برسات کے پانی کی طرح زمین پر برساتا اسے سیراب کردے۔ وہ زمین کی سطح کو ڈھلانے والا بھونچال نہ تھا جس سے ڈر کر انسان روتا ہے اور پرند اپنے گھونسلوں سے نکل کر چیخنے لگتے ہیں، بلکہ عالم روح و معنی کا ایک آسمانی زلزلہ تھا جس کی جنبش نے دلوں کو غفلت سے بیدار کیا اور بیقرار روحوں کو امن اور راحت بخشی، تا وہ سونے کی جگہ بیدار ہوں اور رونے کی جگہ خوشیاں منائیں۔ وہ انسانوں کی درندگی نہ تھی جو اپنے ابنائے جنس کو سانپوں کی طرح ڈستی اور بھیڑیوں کی طرح چیرتی پھاڑتی ہے، بلکہ خدا کی محبت اور فرشتوں کی برکت کا ایک الٰہی ظہور تھا۔ جو نسل آدم کے بچھڑے ہوئے گھرانوں کو یکجا کرتا اور زمین کو اس کی چھنی ہوئی امنیت اور سعادت واپس دلاتا۔

لقد جاءکم رسول من انفسکم عزیز علیه ما عنتم حریص علیکم بالمومنین رءوف رحیم (۹ : ۱۲۸)۔ تمہارے پاس تم ہی میں سے ایک رسول الٰہی آیا جس پر تمہاری تکلیف بہت ہی شاق گذرتی ہے اور تمہاری اصلاح کی اسے بڑی تمنا ہے مسلمانوں پر نہایت شفیق اور بیحد مہربان۔

[1] چشم غیر مسلح یعنی بغیر کسی آلہ کے دیکھنے والی آنکھ۔

لیلۃ القدر } یہ انقلاب جس نے دنیا کے لیالی و ایام ہدایت کی تقویم بدل دی، فی الحقیقت ایک مقدس ذات تھی جو وادی بطحیٰ کے لبِ جبل بوقبیس کی ایک تنگ و تاریک غار کے اندر نمودار ہوئی اور اس شبستان لاہوتی کے اندر مشرق ربوبیت اعلیٰ سے آفتاب کلام اللہ طلوع ہوا۔

یا ایہا الناس قد جاءکم برہان من ربکم اے لوگو! تمہارے پروردگار کی طرف سے تمہارے پاس برہان مقدس بھیجی گئی اور
وانزلنا الیکم نوراً مبینا ۔ ۴: ۱۷۴ ہم نے تمہاری طرف ایک نہایت روشن اور کھلا نور نازل کیا۔

دنیا پر چھ صدیاں ضلالت کے سناٹے اور کفر کی خاموشی کی گذر چکی تھیں لیکن اب وقت آگیا تھا کہ سینا کے بیابان کا خداوند اور کوہ زیتون کی روح القدس پھر گویا ہو، اور ایام اللہ کا ایک نیا موسم بہار پر آئے پس ایسا ہوا کہ فضائے وحی الٰہی کے افق مبین پر نور روشنی کی بدلیاں چھا گئیں، فیضان الٰہیہ بجور وانہار جوش میں آگئے۔ ملائے اعلیٰ اور قدوسیان عالم بالا میں ہلچل مچ گئی، مدبرات روحانیہ اور ملائکہ سماویہ کو حکم ہوا کہ زمین کی طرف متوجہ ہو جائیں کیونکہ اب وہ آسمانوں میں محو و محذول نہیں ہیں آسمانوں کے وہ دروازے جو صدیوں سے زمین پر بند کر دیئے تھے۔ یکایک کھل گئے خزائن فیضان و برکات سماویہ جن کی بخشش کا سلسلہ رک گیا تھا پھر مساکین ہدایت و سائلین رحمت کے منتظر ہو گئے۔ خداوند سینا اپنے دس ہزار قدوسیوں کو ساتھ لے کر فاران پر نمودار ہوا تا آنکہ ثمر بیت کو ہویدا کرے، اور کوہ سعیر کی روح القدس فارقلیط اعظم کی ہیکل میں متشکل ہوئی تا اس کو بھیجے جو ناصرہ کے نبی کے آئے بغیر نہیں جا سکتا تھا۔

انا انزلنہ فی لیلۃ القدر وما ادراک ما لیلۃ ہم نے قرآن کو لیلۃ القدر میں اتارا اور تم سمجھے کہ لیلۃ القدر کیا شئی ہے؟ لیلۃ القدر ایک عہد
القدر؟ لیلۃ القدر خیر من الف شہر رحمت و دور برکت ہے جو ہزار مہینوں سے افضل ہے ملائکہ سماوی و روح الٰہی کا اس میں ہر طرف نزول
تنزل الملائکۃ والروح فیہا باذن ربہم من ہوتا ہے سلام اس پر، یہاں تک کہ صبح طلوع ہو جائے۔
کل امر سلام ہی حتی مطلع الفجر ۔

وہ آتش فشاں پہاڑوں کا پھٹنا نہ تھا جن کی چوٹیوں سے آگ اُبلتی اور ہلاکت موت بن کر اجسام حیوانیہ پر برستی ہے، بلکہ وہ فاران کی چوٹیوں پر نمودار ہونیوالا ابر رحمت تھا جو انسانیت کی سوکھی کھیتوں کو سرسبز کرنے اور کائنات ارضی کی تشنگی کو سعادت سیراب کرنے کیلئے امڈا تھا، تاکہ جس طرح یروشلم کے مرغزاروں کو ہدایت کی بہشت بنا گیا تھا اسی طرح عرب کی ریتلی اور بنجر زمین کو بھی شگفتہ و شاداب کر دے

فانظر الی آثار رحمت اللہ کیف یحیی الارض بعد موتہا پس رحمت الٰہی کی نشانیوں کو دیکھو کہ کس طرح وہ موت کے بعد زمین کو حیات بخشتا ہے
ان ذالک لمحیی الموتی وھو علی کل شیء قدیر (۳۰-۴۹) بیشک وہ مردوں کو زندہ کرنیوالا ہے اور وہ ہر بات پر قادر ہے۔

نزول قرآنی } یہ قرآن حکیم اور فرقان مبین کا نزول تھا جس نے قلب محمد ابن عبداللہ علیہ الصلوۃ والسلام کو اپنا مہبط و مورد بنا لیا جبکہ وہ غار حرا کے اندر بھوکا پیاسا، تمام مادیات عالم سے کنارہ کش ہو کر اپنے پروردگار کے حضور میں سربسجود تھا۔

انہ لتنزیل رب العلمین نزل بہ الروح الامین علی بیشک وہ پروردگار عالم کا اتارا ہوا کلام ہے روح الامین نے تیرے قلب پر نازل کیا تاکہ تو ضلالت
قلبک لتکون من المنذرین بلسان عربی مبین۔ وانہ وفساد کے نتائج سے دنیا کو ڈرانے والوں میں سے ہو اور سعادت و فلاح کی طرف حق دے۔

لفی زبر الاولین (۲۶: ۱۹۱) یہ کلام نہایت کھلی ہوئی اور واضح زبان عربی میں نازل ہوا اور پچھلی کتابوں میں اس کی خبر دی جا چکی تھی۔
وہ غذائے آسمانی کی طلب میں جن کی پیدا آوار کنارہ کش ہو کر بھوکا پیاسا تھا۔ پس خداوند نے اس کی بھوک کو دنیا کی سیرابی کیلئے قبول کرلیا۔ (وھو یطعمنی ویسقینی) وہ انسانیۃ کی غفلت و سرشاری کے دور کرنے کیلئے راتوں کو اٹھ اٹھ کر جاگتا تھا۔ پس اللہ نے اس کی بے خواب آنکھوں کو اپنے نظارہ جمال سے ٹھنڈک بخشی (قرۃ عینی فی الصلوٰۃ) اور تمام عالم کیلئے اسے بصیرت عطا کی (قد جاءکم بصائر من ربکم) وہ انسانوں کو سرکشی اور تمرد کے عصیاں سے نکالنے کیلئے شہنشاہ ارض و سما کے آگے سر بسجود تھا۔ پس رب الافواج نے اس کے سر کو الفت و یگانگت کے ہاتھوں سے اٹھایا، اور زمینوں اور آسمانوں میں سربلندی دی۔ تا اس کی روح اس کے کلام کی حامل ہو، اور اس کے منہ سے خدا کی آواز نکلے۔ وما ینطق عن الھوی ان ھو الا وحی یوحی (۵۳: ۴)۔
سعادت بشری کا یہ پاک پیغام جس کی تبلیغ نبی امی کے سپرد ہوئی، وحی الٰہی کا یہ فتح باب جو غار حرا کے عزلت گزیں پر ہوا۔ خدا کا یہ مقدس کلام جو بلسان عربی مبین اس کے منہ میں ڈالا گیا سب سے پہلے جس رات میں اس کا ظہور ہوا وہ لیلۃ "القدر" تھی، اور لیلۃ القدر جس مہینے میں آئی وہ رمضان المبارک تھا۔

شھر رمضان الذی انزل فیہ القرآن رمضان کا مہینہ وہ ہے جس میں قرآن نازل ہوا جو انسانوں کیلئے سرتاپا ہدایت
ھدی للناس و بینات من الھدی والفرقان ہے اور جس کی تعلیم ہدایت و تمیز اور حق و باطل کی نشانی ہے۔ (بقرہ)

انقلاب اعظم } قرآن حکیم، فرقان مجید، نور و کتاب مبین، بصائر للناس، ہدی و موعظۃ للمتقین، شفاء لما فی الصدور نے نازل ہوتے ہی تاریخ عالم کا صفحہ اولٹ دیا، اور کشور انسانیۃ کی از سر نو تعمیر شروع کی۔ وہ تمام تاریکیاں جنھوں نے نور سعادت سے دنیا کو محروم کر دیا تھا اور عالم ارضی یکسر شب تاریک ہو رہا تھا اس آفتاب ہدایت کے طلوع ہوتے ہی نابود ہو گئیں اور ظلمت و تاریکی کی جگہ نور اور روشنی کا عہد رحمت شروع ہوا اس نے کفر و ثنیت کے طوق سے انسانوں کو نجات دلائی، انسانی غلامی و استبداد کی زنجیروں سے انھیں رہا کیا نیکیوں کا ایک لشکر ترتیب دیا جس نے صدیوں کی پھیلی ہوئی بدیوں اور جمی ہوئی گمراہیوں کو شکست دی۔ اور خدا کی بندگی اور پرستش کی ایک ایسی بادشاہت قایم کر دی جس کے آگے دنیا کی تمام ماسوا اللہ طاقتیں سرنگوں ہو گئیں۔

قد جاءکم من اللہ نور و کتاب مبین یھدی بیشک اللہ کے طرف سے تمہارے پاس نور اور واضح و روشن کتاب آئی اللہ اس کے ذریعہ ان
بہ اللہ من اتبع رضوانہ سبل السلام و لوگوں پر سلامتی کی راہیں کھول دیتا ہے جو اس کی رضا کی متابعت کرتے ہیں وہ انھیں
یخرجھم من الظلمات الی النور باذنہ تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لاتا ہے اور صراط مستقیم کی طرف ان کی ہدایت
ویھدیھم الی صراط مستقیم (۵: ۱۰) کرتا ہے۔

ماہ مقدس } پس رمضان المبارک کا مہینہ فی الحقیقت جشن سعادت انسانیۃ اور ہدایت امم کے ظہور کی یادگار ہے جس کا دروازہ قرآن حکیم کے

نزول سے دنیا پر کھلا اور خدا اور اس کے بندوں میں ہجر و حرماں کی جگہ وصل و محبت کے راز و نیاز شروع ہوئے یہی مہینہ ہے جو آسمان کی سب سے بڑی برکت کے نزول کا ذریعہ بنا اور یہی مہینہ ہے جو اپنے ساتھ زمین کی سب سے بڑی سعادت لایا اسی موسم میں خدا کی رحمتوں کی پہلی پہل بارش ہوئی اور اسی عہد میں دنیا کی وہ سب سے بڑی خشک سالی ختم ہوئی جو صدیوں سے کائنات روح و قلب پر چھائی ہوئی تھی ہدایتوں کے فرشتے اسی میں اترے، سعادت کے قدوسی اسی میں زمین پر پھیلے، خدا نے سب سے پہلے اسی مہینہ میں بندوں کو پیار کیا اور بندوں نے بھی سب سے پہلے اسی ماہ میں اس کی محبت کا جام پیا۔ یہ پاکی اور بزرگی کا وقت تھا کہ پاک تعلیمات کا منبع بنا اور عظمت و شرف کا عہد مقدس تھا کہ خدا کا کلام اس کے بندوں پر نازل ہوا پس جبکہ دنیا طرح طرح کی یادگاروں کو منانا چاہتی تھی تو مسلمانوں کو حکم دیا گیا کہ وہ اس روحانی انقلاب کی یادگار امانت ارضی کے جشن ماہ مبارک کو اپنی برکتوں اور رحمتوں کے نزول کی وجہ سے خدا نے قبول کر لیا، اس کی قبولیت سے انکار نہ کریں دنیا خونریزیوں کی یادگار مناتی ہے لیکن سچے امن اور حقیقی رحمت کی یادگار ہے۔ دنیا لڑائیوں کو یاد رکھنا چاہتی ہے صلح و امنیت کے ورود کی یادگار ہے۔ دنیا نے تخت نشینیوں کو سب سے بڑا سمجھ کر یاد رکھنا چاہا مگر یاد نہ رکھ سکی خدا نے بتلایا کہ سب سے بڑا انسان ایک غار نشین تھا جس کی یادگار زندہ رکھی گئی اور ہمیشہ زندہ رہی دنیا نے ملکوں کی فتح اور زمینوں کی تسخیر کو بڑا واقعہ سمجھا اور اس کی یاد میں خوشیاں منائیں مگر ہمیں تعلیم دیا گیا کہ دلوں کی فتح اور روحوں کی تسخیر ہی سب سے بڑی بات ہے اور اسی کی یادگار منانی چاہیئے۔

ورفعنا لک ذکرک ۔(۹۴ : ۴) اور ہم نے تیرے ذکر کو رفعت اور بقائے دوام عطا فرمایا۔

اسوۂ ابراہیمی و اسوۂ محمدی } اللہ تعالیٰ کا قاعدہ ہے کہ وہ اپنے قدوسوں اور محبوبوں کے کسی فعل کو ضائع نہیں کرتا، اور ایسے مثل ایک مظہر فطرت کے دنیا میں ہمیشہ کے لئے محفوظ کر دیتا ہے حضرت خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے خانہ کعبہ کی دیواریں چنیں اور حضرت اسمٰعیل علیہ السلام نے اس قربانگاہ کا طواف کیا خدا کو اپنے دوستوں کی یہ ادائیں کچھ اس طرح بھا گئیں کہ اس موقع کی ہر حرکت کو ہمیشہ کے لئے قائم کر دیا اور اس کی یادگار منانا تمام پیروان دین حنیفی پر فرض کر دیا۔ ہر سال جب حج کا موسم آتا ہے تو لاکھوں انسانوں کے اندر سے اسوۂ خلیل اللہ جلوہ نما ہوتا ہے، اور ان میں سے ہر متنفس وہ سب کچھ کرتا ہے جو اب سے کئی ہزار سال پہلے خدا کے دو دوستوں نے وہاں کیا تھا۔ یہی معنی ہیں اس بیان الٰہی کے کہ:۔

ووھبنا لھم من رحمتنا وجعلنا ہم نے حضرت ابراہیمؑ اور ان کی ذریت جسمانی و روحانی کو اپنی رحمت میں سے بڑا حصہ **لھم لسان صدق علیا** (۱۹ : ۱۴) دیا، اور وہ یہ تھا کہ ان کے لئے ایک اعلیٰ و اشرف ذکر خیر دنیا میں باقی رکھا۔

یہ تو "اسوۂ ابراہیمی" کی یادگار تھی۔ لیکن جب وہ آیا جس کے لئے خود ابراہیم خلیل نے خداوند کے حضور التجا کی تھی۔

ربنا وابعث فیھم رسولا منھم اے پروردگار! میری ذریت میں ایک ایسا رسول بھیج جو اللہ کی آیتیں **یتلوا علیھم ایاتک ویعلمھم** پڑھ کر سنائے کتاب اور حکمت کی تعلیم دے اور دلوں اور روحوں کا تزکیہ **الکتاب والحکمۃ ویزکیھم انک** کر دے بیشک تو تو ہی عزیز و حکیم ہے۔

انت العزیز الحکیم (۲: ۱۲۴)

تو دنیا کے لئے "اسوۂ محمدی" کی حقیقت الحقائق اعلیٰ رونما ہوئی اور ہدایت و سعادت کی اور تمام حقیقتیں بے اثر ہوگئیں۔ اس اسوۂ عظیمہ کا سب سے پہلا منظر وہ عالم ملکوتی کا استغراق و استہلاک تھا۔ جب کہ صاحب فرقان نے انسانوں کو ترک کر کے خدا کی صحبت اختیار کر لی تھی، اور انسان کے بنائے ہوئے گھروں کو چھوڑ کر غار حرا کے غیر مصنوع حجرے میں عزلت گزیں ہوگیا تھا وہ اس عالم میں متصل بھوکا پیاسا رہتا تھا اور پوری پوری راتیں جمال الٰہی کے نظارے میں بسر کر دیتا تھا۔ تاآنکہ اس تنگ و تاریک غار کی اندھیاری میں طلیعۂ قرآنی کا نور بے کیف طلوع ہوا، اور مشرقستان الوہیت سے نکل کر اس کے قلب مقدس میں غروب ہوگیا۔

تبارک الذی نزل الفرقان علی عبدہٖ لیکون تمام حمد و ثنا اس خدا کے لئے جس نے فرقان اپنے بندوں پر نازل کیا۔
للعلمین نذیراً (۲۵: ۱) تاکہ وہ دنیا جہان کے لئے ڈرانے والا ہو۔

پس جس طرح خدائے تعالیٰ نے دین حنیفی کے اولین داعی کے اسوہ کو حیات دائمی بخشی تھی اسی طرح اس آخری متمم و مکمل وجود کے اسوۂ حسنہ کو بھی ہمیشہ کے لئے قایم کر دیا۔

لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ۔ بیشک، تمہارے لئے رسول اللہ کے اعمال حیات میں ارتقاء انسانیت کا اعلیٰ ترین نمونہ رکھا گیا ہے۔

وہ بھوکا پیاسا رہتا تھا۔ پس تمام مومنوں کو حکم دیا گیا کہ تم بھی ان ایام میں بھوکے پیاسے رہو، تا ان برکتوں اور رحمتوں میں سے حصہ پاؤ جو نزول قرآنی کے ایام اللہ کیلئے مخصوص تھیں وہ اپنا گھر بار چھوڑ کر ایک تنہا گوشے میں خلوت نشین تھا، پس ایسا ہوا کہ ہزاروں مومن و قانت روحیں ماہ مقدس میں اعتکاف کے لئے مسجد نشیں ہونے لگیں اور اس طرح غار حرا کے اعتکاف کی یاد ہر سال تازہ ہونے لگی۔ وہ راتوں کو حضور الٰہی میں مشغول عبادت رہتا تھا، پس پیروان اسوۂ محمدیہ و متبعان سنت احمدیہ بھی رمضان المبارک کی راتوں میں قیام لیل کرنے لگے، اور تلاوت و سماعت قرآنی کے وسیلے سے وہ تمام برکتیں ڈھونڈھنے لگے جو اس ماہ مبارک کو اس کے نزول و صعود سے حاصل ہیں۔

فمن شھد منکم الشھر فلیصمہ پس تم میں سے جو اس مہینہ کو پائے اسے چاہئیے کہ روزہ رکھے۔

جس طرح اسوۂ ابراہیمی کی یادگار حج کو فرض کر کے قایم رکھی گئی اور لاکھوں انسانوں کو اسوۂ ابراہیمی کا پیکر بنایا گیا، اسی طرح اسوۂ محمدی کی بھی یہ یادگار ہے جو ماہ رمضان کی صورت میں قایم رکھی گئی اور جو تیرہ سو برس کے گذر جانے کے بعد اللہ بھی زندہ ہے اور ہمیشہ زندہ رہے گی۔

خدا کی قایم کی ہوئی یادگاریں کاغذوں، اینٹ اور پتھر کی دیواروں، اور فانی زبانوں کی روایتوں میں باقی نہیں رکھی جاتیں کہ یہ انسانوں کے کام ہیں، وہ اپنے جس بندے کو بقائے دوام کے لئے چن لیتا ہے اس کی یادگار کو مجمع انسانیت کے سپرد کر دیتا ہے اور نوع بشری اس کی حامل بن جاتی ہے۔ پس نہ تو وہ مٹ سکتی ہے اور نہ کوئی اسے مٹا سکتا ہے۔ آج بھی کروڑوں انسان کرۂ ارض پر موجود ہیں جو ماہ مقدس کے آتے ہی اپنی زندگی کو یکسر بدل دیتے ہیں، اور اس یادگار عظیم و قدوس کو اس طرح اپنے جسم و دل پر طاری کرا دیتے ہیں کہ اسوۂ محمدی کی روحانیت کبریٰ کرا دڑوں روحوں کے اندر سے "انا الحی بالحی الذی لا یموت" (میں زندہ و باقی ذات میں فنا ہو کر خود بھی ہمیشہ کے لئے زندہ و باقی ہو گیا ہوں) کی صدائے حقیقت سے غلغلہ انداز عالم و عالمیان ہوتی ہے۔ پھر کیسی مقدس و اقدس تھی وہ بھوک، جس ایک بھوک کی یاد میں خدا نے اپنے لاتعد و لاتحصی بندوں کو بھوکا رکھا، اور کیسی پاک اور بزرگ تھی وہ ذات جس کی حیات طیبہ کا کوئی فعل گمنامی کے لئے نہیں چھوڑا گیا! پس اے پیروان دین حنیفی۔ و اے وابستگان اسوۂ محمدی، آؤ کہ نزول آیت و سعادت کے اس انقلاب عظیم کی یادگار منائیں، اور جس طرح صاحب قرآن اس ذات حی و قیوم میں فنا ہو گیا تھا، ہم بھی اس کے اسوۂ حسنہ کے اتباع میں اپنے تیئں فنا کر دیں۔ کیونکہ محض جسم کی بھوک اور پیاس سے وہ حقیقت ہم پر طاری نہیں ہو سکتی جب تک کہ روح اور دل پر بھی جسم کی طرح روزہ نہ طاری ہو جائے۔ فسبحان ذی الملک والملکوت، سبحان ذی العزۃ والعظمۃ والھیبۃ والقدرۃ والکبریاء والجبروت سبحان الملک الحی الذی لا ینام ولا یموت ابدا ابدا سبوح قدوس ربنا و رب الملائکۃ والروح۔

غزل

ہے یہ وحشت کا تقاضا بار بار اب کے برس
ہوں گریباں جیب دامن تار تار اب کے برس

پاؤں اب جمتے نہیں اف رے جنوں کی سرکشی
ہو نہ جائے وسعت صحرا شکار اب کے برس

رنگ گلشن بے ثبات و بوئے گل بے اعتبار
دیگئی درس فنا فصل بہار اب کے برس

فصل گل آئی ہے کلیاں کھل رہی ہیں باغ میں
میری قسمت بھی کھلے پروردگار اب کے برس

وہ گزشتہ خوبیاں "ہے ہے" نظر میں پھر گئیں
دیکھ کر اس برق وش کو شرمسار اب کے برس

پھر وہی ضد ہے، وہی حجت، وہی تکرار حیف!
پھر مجھے کرنا پڑے گا انتظار اب کے برس

جھیلتا صدمات فرقت دل کہاں تک اے عزیز
چل دئے تاب و تواں صبر و قرار اب کے برس

عزیز یار جنگ

اقبال اور عورت

(جناب سید محمد نور الحسن صاحب)

عورت کے متعلق مختلف زبانوں میں لوگوں نے مختلف خیالات کا اظہار کیا ہے اور اکثریت ایسے لوگوں کی ہے جنھوں نے عورت کو فتنہ و فساد کی جڑ اور امن و سلامتی کی دشمن قرار دیا ہے۔ سقراط نے عورت کو ایک ایسے پھل سے تشبیہ دی ہے جو دیکھنے میں تو خوشنما اور خوش رنگ معلوم ہو مگر جب کوئی پرندا سے کھائے تو فوراً ہلاک ہو جائے۔ ملٹن نے عورتوں کو شیطان کی گذرگاہیں کہا ہے۔ منو جی نے بھی عورت کو اذیت رساں، ضدی اور بیوفا کہکر مشورہ کے وقت عورتوں کو اپنے پاس سے ہٹا دینے کی نصیحت کی ہے مگر سردار دو عالمؐ نے جو سارے عالم کے لئے رحمت بن کر آئے تھے، ارشاد فرمایا۔ "دنیا خود ایک متاع ہے دنیا کی متاع اور بہترین پونجی نیک عورت ہے۔"

اس نکتہ کو سمجھنے کی ضرورت ہے کہ پیغمبر اعظمؐ نے نیک عورت کو دنیا کی بہترین پونجی کہہ کر کس طرح ہر عورت کے دل میں نیک بننے کی خواہش پیدا کر دی اور ساتھ ہی ساتھ مردوں کو عورتوں کی عزت اور قدر کی طرف مائل کر دیا، علامہ اقبال نے جن کی تعلیمات سراسر اسلامی تعلیم کا پرتو ہیں، اکثر مقامات پر اپنے اشعار میں عورت سے خطاب کیا ہے اور بیش بہا نصیحتیں فرمائی ہیں۔

بقائے انسانیت اور اچھی معاشرت کے لئے عورت کی جس قدر اہمیت ہے، ظاہر ہے لیکن باایں ہمہ عورت کا درجہ مرد سے کم ہے۔ عورت مرد پر منحصر ہے۔ ابتدائے آفرینش سے لے کر آج تک کے جملہ تجربات اس بات کے شاہد ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے بھی قرآن مجید میں ارشاد فرمایا ہے۔

وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ ط

(اور عورتوں کا حق بھی مردوں پر ویسا ہی ہے جیسا (مردوں کا حق) عورتوں پر دستور کے مطابق ہے مگر مردوں کو عورتوں پر کچھ فوقیت ضرور ہے۔)

اس نازک دور میں جب کہ ہندوستان میں عورت کا مسئلہ دن بدن اہمیت اختیار کرتا جا رہا ہے آزادی نسواں کی تحریکوں نے پردہ میں رہنے والی خواتین کے دلوں میں بھی آزادی کی امنگیں پیدا کر دی ہیں۔ عورتوں کو آزادی دینے کے جو نتائج ہو سکتے ہیں اس کی زندہ مثالیں ممالک مغرب، ہماری نظروں کے

سامنے ہیں مگر اس کے باوجود یہ اندیشہ لگا ہوا تھا کہ مغرب کی یہ تیز و تند آندھی کہیں مشرق کے پردہ کو اٹھا نہ دے۔ اس وقت ضرورت تھی کہ کوئی زبردست مصلح اس طرف توجہ کرے۔ ایک مرد مسلم نے سرزمین پنجاب سے اس باطل کے خلاف صدائے حق بلند کی۔ ؎

اک زندہ حقیقت ہے مرے سینہ میں مستور کیا سمجھے گا وہ جس کی رگوں میں ہو لہو سرد
نے پردہ نہ تعلیم نئی ہو کہ پرانی نسوانیت زن کا نگہبان ہے فقط مرد
جس قوم نے اس زندہ حقیقت کو نہ پایا اس قوم کا خورشید بہت جلد ہوا زرد

آزادئ نسواں کے جس نظریہ کو یورپ نے پیش کیا وہ انسانی اور اخلاقی نقاط نظر سے سراسر مہلک ہے، جس سے عورت میں حیا، جو کہ ایمان کا جزو ہے، باقی نہیں رہتی۔ عورت ہی قوم کی معمار ہے۔ اسی کے آغوش تربیت میں قوم پلتی ہے اگر عورت کا کیرکٹر اچھا نہ ہو تو قوم کا کردار کس طرح اچھا رہ سکتا ہے اور یہ ایک کھلی ہوئی بات ہے کہ جس قوم میں اخلاق باقی نہیں رہتے وہ بہت جلد صفحۂ ہستی سے حرف غلط کی طرح مٹ جاتی ہے ؎

خنک آں ملتے کز وار داتش ! قیامت ہا بہ بیند کائناتش !
چہ پیش آید چہ پیش افتاد اُورا تواں دید از جبین امہاتش !

(وہ قوم بڑی خوش قسمت ہے جس کی کائنات زندگی میں عورت کی خدمت گزاری سے قیامت کی سی بیداریاں پیدا ہوں۔ اس قوم پر کیا کچھ گزری اور مستقبل میں اس کی قسمت میں کیا لکھا ہے، صرف ماؤں کی پیشانیاں دیکھ کر ہی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔)

عورتوں کی تعلیم و ترقی کے اقبال بڑے حامی ہیں مگر موجودہ تعلیم جو عورتوں سے جوہر نسوانیت چھین لیتی ہے اس کی وہ سرے سے مخالفت کرتے ہیں۔ قوم کو چاہئیے کہ فوراً عورتوں کی تعلیم کی طرف متوجہ ہو مگر ان کو مدرسوں اور کالجوں کی تعلیم کی ضرورت نہیں۔ اقبال کہتے ہیں ؎

جس علم کی تاثیر سے زن ہوتی ہے نازن کہتے ہیں اسی علم کو ارباب نظر موت

بانگ درا میں بڑے لطیف مزاح کے ساتھ فرماتے ہیں ؎

لڑکیاں پڑھ رہی ہیں انگریزی ڈھونڈھ لی قوم نے فلاح کی راہ
روش مغربی ہے مدّ نظر وضع مشرق کو جانتے ہیں گناہ

یہ ڈراما دکھائے گا کیا سین؟ پردہ اٹھنے کی منتظر ہے نگاہ

ایک حکیم کا قول ہے کہ عورت بذاتہ بد یا نیک نہیں ہوتی وہ ماحول ہے جو اسے نیک یا بد بنا دیتا ہے مغربی تہذیب کے سیلاب نے مشرقی تہذیب وثقافت کی شاندار عمارت کو بیحد نقصان پہنچایا معاشر کی جو کچھ بھی خرابیاں آج پیدا ہو رہی ہیں۔ اس کے ذمہ دار کون ہیں؟ وہ حضرات جو خود مغرب پرست ہیں اور اپنے بیوی بچوں کو بھی مغربی طرز پر ڈھالنا چاہتے ہیں ان کے لئے اقبال کے یہ اشعار ذرا غور طلب ہیں۔

ہزار بار حکیموں نے اس کو سلجھایا مگر یہ مسئلہ زن رہا وہیں کا وہیں
قصور زن کا نہیں ہے کچھ اس خرابی میں گواہ اس کی شرافت پہ ہیں مہ و پرویں
فساد کا ہے فرنگی معاشرت میں ظہور کہ مرد سادہ ہے بیچارہ زن شناس نہیں

قوم کی لڑکیوں سے خطاب کرتے ہوئے ارمغان حجاز میں علامہ فرماتے ہیں۔

ز شام ما بروں آور سحر را بہ قرآں باز خواں اہل نظر را
تو میدانی کہ سوز قراءت تو دگرگوں کرد تقدیر عمرؓ را

حضرت عمرؓ کے اسلام لانے کا واقعہ تو تقریباً سب کو معلوم ہے، وہ ایک عورت کا سوز قراءت ہی تو تھا جس نے پتھر جیسے سخت دل کو موم بنا دیا۔

خدا کرے کہ ہماری قوم کی لڑکیوں میں حضرت عمرؓ کی بہن جیسا سوز قراءت پیدا ہو جائے تو یقیناً ہماری شام سے ایک نئی سحر پیدا ہوگی مگر قراءت میں سوز اسی وقت پیدا ہو سکتا ہے جب کہ قرآن کی تلاوت کیجائے اور تہذیب حاضر نے تو ہمارا یہ حال کر رکھا ہے کہ بقول اکبر

انہیں شوق عبادت بھی ہے اور گانے کی عادت بھی نکلتی ہیں دعائیں ان کے منہ سے ٹھمریاں ہوکر

سیدھا راستہ

اے خدا! میرے گناہوں کو بخش دے اور مجھے سیدھے راستہ پر چلا میں اپنی زندگی کی راہ میں گم ہو گیا ہوں۔ راستہ نہیں ملتا، منزل کا نشان گم ہے! میری زندگی کی صبح بڑی خوشگوار تھی لیکن جوں جوں دن نکلتا گیا، میں رنج وغم سے دوچار ہوتا گیا، یہاں تک کہ میرے سامنے مصیبتوں کا سیلاب آگیا۔ میں اپنی زندگی کی شاہراہ میں کس طرح گم ہوا، مجھے کوئی علم نہیں بجز اس کے کہ یہ میرے گناہوں کی سزا ہو لیکن جب مجھے اپنی گمراہی کا علم ہوا تو پریشان ہونے کے بجائے اپنے دل میں صبر و استقلال کو جگہ دی اور تیری رحمت کے سہارے راستہ طے کرنے لگا کہ ایک دن ضرور اپنی منزل مقصود تک پہنچ جاؤں گا۔ سید عزیز الحسن ضیا

ترقی پسند ادب

جناب عطار رضا صاحب

زبان اُردو ایک عجیب دورِ کشمکش سے گزر رہی ہے ایک طرف تخریب کی دوسری طرف تعمیر کی کوششیں ہو رہی ہیں- دنیا کی صدہا زبانوں میں اُردو ہی ایک ایسی زبان ہے کہ جن اسلاف پیشین کی جد وجہد اور کدوکاوش سے وہ عالم وجود میں آئی پروان چڑھی اور آج علمی زبانوں کا پہلو دبا رہی ہے انہیں کے اخلاف میں کوئی اوس کو حرف غلط کی طرح صفحہ ہستی سے مٹانا چاہتا ہے کوئی اوس کے چہرہ زیبا کو داغدار کرنے میں مصروف عمل ہے اور کوئی اوس کی توسیع ترویج اور اصلاح میں کوشاں ہے - اگر تخریب میں تعلیم یافتہ نوجوانوں کا قلم کار فرما نہ ہوتا تو کوئی توجہ بھی نہ کرتا مگر یہ بدبختی دیکھئے کہ جن تعلیم یافتہ نوجوانوں سے علمی مقالہ لکھنے تحقیق طلب مسائل پیش کرکے ردو قبول- اعتراض وجواب- بحث واستفادے کا موقع دینے اور شائقین علم و فن کو فائدہ پہنچانے کی توقعات تھیں آج وہی ترقی پسند ادب کے نام سے ایسی ایسی نظم ونثر لکھ رہے ہیں جس سے ادب وانشا سر در گریبان اور شاعری ونظم نگاری انگشت بدنداں ہے اس خصوص میں بیسویں صدی نے ایسی شخصیتیں پیدا کی ہیں جن کا نام تاریخ ادب اردو میں مخرب زبان اردو کی حیثیت سے سرفہرست رہے گا- مجھے اندیشہ نہیں اب یقین ہو گیا ہے کہ ان نوجوانوں نے ادب وشعر کی حقیقت سمجھنے میں غلطی کی ہے کہتے ہیں کہ مصور اور شاعر میں مماثلت ہے ایک مادی اشیاء کی تصویر اتارتا ہے دوسرا جذبات کی- کیا ترقی پسند ادب میں یہ مقولہ قابل قبول ہے؟ عالم جذبات وحسیات کے صدہا مطالب میں مظاہر طبعیہ اور تغیرات فطریہ کے بیسیوں حوادث ہیں حسن وعشق کے بیشمار اسرار وواردات ہیں مگر ترقی پسند ادب کا موضوع سخن سرمایہ داری کی مذمت مزدوروں کی حمایت حکومت کی شکایت اشتراکیت کی مدحت- مذہب کی حقارت مشرقی تہذیب وتمدن سے نفرت کے سوا اور کچھ نہیں مذہب سے وہ نا آشنا مذہب ان سے بیزار اس لئے اوس کو تو اپنے حال پر چھوڑ دیں عریاں نویسی سے تہذیب وتمدن کو شرمسار نہ فرمائیں باقی جو مسائل ان کے جذبات کو ابھارنے والے ہیں اون پر بجوشی نظم ونثر میں اپنے خیالات کا اظہار کریں- تخیل میں رفعت کی کمی ہے تو مضائقہ نہیں کم ازکم صحت الفاظ ومحاورہ کے ساتھ ساتھ خوبی زبان اور حسن بیان پر تو نظر رکھیں- جو لوگ زبان کے قواعد اور

علم معنی وبیان کے ضوابط سے نا آشنا ہیں اون کے لئے شاعری زیبا نہیں۔ یاد رکھیئے محض کلام موزوں پر شعر کی اور ہر مطبوعہ تحریر پر ادب کی تعریف صادق نہیں آتی۔ ہر سند یافتہ اور مدرسہ کا ہر استاد اور کالج کا ہر پروفیسر شاعر و ادیب نہیں ہوتا یہ فن ہی جدا ہے اس کے قواعد وضوابط بھی جدا ہیں۔

ذوق ایں مے نہ شناسی بخدا تا نہ چشی

شاعری کو غیر اکتسابی فن کہا جاتا ہے مگر بطور کلیہ اس کو تسلیم کرنے میں تامل ہے طبعی ذہانت اور فطری موزونیت ہے تو اس حال میں بھی استادان فن کی صحبت مشاہیر شعرا کے کلام کا بہ تعمق نظر وسیع مطالعہ لازم ہے، اسی سے مذاق سلیم پیدا ہوتا ہے طائر تخیل میں پر پرواز نکلتے ہیں زمین سخن گل کہلاتی ہے اور آسمان ادب رنگ بدلتا ہے ورنہ بغیر رہبر کے ملک سخن کی کوچہ گردی سے پائے فکر گرد آلود اور دامن تخیل حسرت آمود ہی رہے گا۔ اپنے ہم خیال احباب کی تحسین و اعتناء پر مغرور ہونا اور قدر شناسوں کے سکوت کو نظر انداز کرنا دانائی نہیں ہے۔

ترقی پسند ادب کی الٹی گنگا ہند و دکن میں یکساں بہہ رہی ہے اور ایک طوفان بے تمیزی برپا ہے اگر نظائر پیش کئے جائیں تو کئی صفحات کو نظر طغیان کرنا پڑے گا تاہم چند متفرق الفاظ و تراکیب اور دو چار اشعار بطور نمونہ از خروار نظر ناظرین کرتا ہوں اس توقع پر کہ شاید اصلاح حال پر کوئی بذل التفات کرے۔ ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ شاعر بے عدیل فرماتے ہیں ؎

بات کیا تھی ذکر کس کا تھا کہ ہنگام نشاط مسکرانے والی آنکھیں ہچکیاں لینے لگیں

ان بزرگوار سے کون پوچھے کہ حضرت آنکھوں کا مسکرانا اور ہچکیاں لینا کے کیا معنی ہیں۔ مسکرانا اور ہچکیاں لینا آنکھوں کیواسطے صفت یا تشبیہ تو نہیں ہے۔ یہ معشوق نادرہ روزگار عجائب خانہ میں رکھنے کے قابل ہے۔ ایک اور شعر سنئے۔ ؎

اس زمین موت پروردہ کو ڈہایا جائے گا اک نئی دنیا نیا آدم بنایا جائے گا

اگر کوئی پوچھے کہ جناب "زمین موت پروردہ" استعارہ ہے یا کنایہ تو بغیر اس کے اور کیا جواب ہوسکتا ہے "جی نہیں یہ ایجاد بندہ ہے"۔ "زمین کو ڈھانا بھی اوسی کے ذیل میں شمار کیجئے۔ یہ اردو کی بول چال نہیں۔ ایک نظم کے آغاز سے قبل لفظ مشرق لکھا گیا ہے میں بھی نقل کرتا ہوں یہ عنوان نہیں مطالب اشعار کی طرف اشارہ ہے۔ ؎

جہل فاقہ بھیک بیماری نجاست کا مکان — زندگانی ناز کی عقل و فراست کا سامان

پیکر ماضی ہے اک بے رنگ اور بے روح غول — ایک مرگ بے قیامت ایک بے آواز ڈھول

اک مسلسل رات جس کی صبح ہوتی ہی نہیں — خواب اصحاب کہف کو پالنے والی زمین

مشرق پر کیسی کیسی پھبتیاں اڑائی ہیں اور کیسے کیسے نادر الفاظ جمع کئے ہیں اون کی کیا داد دیجا سکتی ہے۔ مرگ بے قیامت۔ اور اصحاب کہف کے خواب کو پالنے والی زمین۔ کہہ کر زمین شعر کو تحت الثریٰ میں دفن کیا۔

ایک دوسرے صاحب جو شاید دہلی یا لاہور کے باشندے ہیں اون کے فکر و تخیل کی بھی داد دیجئے فرماتے ہیں۔

حسن محبوب کے سیال تصور کی طرح — اپنی تاریکی کو بھینچے ہوئے لپٹائے ہوئے

سیال تصور اور تاریکی کو بھینچنا اور لپٹانا۔ کیا کسی نے کبھی سنا یا دیکھا بھی ہے۔ ؎

تشنہ افکار جو تسکین نہیں پاتے ہیں — سوختہ اشک جو آنکھوں میں نہیں آتے ہیں

اور باتوں سے قطع نظر تشنہ افکار اور سوختہ اشک کو دیکھئے اور مصنف کے ایجاد پر آفریں کہئے اور ایک شعر ملاحظہ ہو۔

شب مہتاب کی سحر آفریں مدہوش موسیقی — تمہارے دلنشیں آواز میں آرام کرتی ہے

سحر آفریں مدہوش موسیقی کا کسی کی آواز میں آرام کرنا ایسا تخیل ہے کہ ترقی پسند ادب نقطۂ عروج سے بھی آگے نکل گیا۔ کیا قیاسات شعری اسی کا نام ہے۔

چند متفرق الفاظ و تراکیب کا ملاحظہ بھی لطف سے خالی نہیں۔" اجنبی بہار۔ حسن معصوم۔ معصوم تبسم۔ معصومانہ تبسم۔ معصومانہ پشیمانی۔ موج پایاب۔ جان بلب دعا۔ چاندنی کی تھکی ہوئی آواز۔ رباب کی مضمحل لئے۔ خلوت شبانہ کا بوجھ۔ مضمحل تبسم۔ نیم خواب شبستاں۔ دھندلی سی راحت۔ راحتوں کے زمین بوس محل۔ شفق زار جوانی۔ بیرنگ سا عشرت۔

کہاں تک لکھوں ان ادیبوں کے فکر و تخیل اور ایجاد و اختراع کا میدان بہت وسیع ہے۔ یہ مضمون ناتمام رہے گا اگر کفر و الحاد کے دو ایک نمونے پیش نہ کروں۔ نقل کفر کفر نباشد۔

دلوں میں اژدہام آرزو لب بند رہتے تھے — نظر سے گفتگو ہوتی تھی دم الفت کا بھرتے تھے

نہ ماتھے پر شکن ہوتی نہ جب تیور بدلتے تھے — خدا بھی مسکرا دیتا تھا جب ہم پیار کرتے تھے

یہیں کھیتوں میں پانی کے کنارے یاد ہے اب بھی

دوسرے صاحب فرماتے ہیں ؎

اک فرصت گناہ ملی وہ بھی چار دن — دیکھے ہیں ہم نے حوصلے پروردگار کے

اہل زبان ہونے کے دعویدار تعلیم یافتہ نوجوانوں کی زبان وقلم سے ایسے الفاظ اور ایسا بیان سُنکر اور پڑھ کر بعض بزرگان قوم فرماتے ہیں کہ یہ تعلیم کا نقص ہے تعلیم کا نقص ہو یا نہ ہو حقیقت حال یہ ہے کہ علوم مغربی میں ہم جو کچھ بھی کمال حاصل کریں جب تک ہم علوم مشرقی سے بے بہرہ۔ مادری زبان سے ناآشنا اور مذہب سے بیگانہ رہیں ہم سے نہ قوم کو فائدہ پہنچ سکتا ہے نہ ملک کو۔ اب وقت آگیا ہے کہ بہی خواہان زبان اُردو اور دردمندان قوم اپنی عاجلانہ توجہ اس طرف مبذول فرمائیں ورنہ اندیشہ ہے کہ یہی لیل ونہار رہے تو آنے والی نسلیں گمراہ اور ادب وانشا کا نام برعکس نہند نام زنگی کافور کا مصداق ہو کے رہ جائے گا۔ **اُردو کانگریس** کے معزز اراکین سے توقع ہے کہ وہ اپنے میدان فکر وعمل کے کسی گوشہ میں اس مسئلہ کو بھی جگہ دیں گے۔

مراد خضرعنان گیر باید از چپ و راست — کہ گم رہی نہ کنم ورنہ عزم راہ خطا ست

کُل ہند اردو کانگریس حیدرآباد دکن کے سہ روزہ اجلاس کی روداد مقامی اخبارات میں آپ پڑھ چکے ہیں ایک ماہنامہ کو اس کی تفصیلات کیلئے جگہ نکالنی مشکل تھا۔ اسلئے 'پیام شاہانہ' کے اشاعت کی عزت حاصل کیجاتی ہے جس وسیع اور شاندار پیمانہ پر کانگریس کی تیاریاں عمل میں آئیں مہمانوں کے لئے بشیر باغ جیسا پرفضا مقام آرام وآسائش کا انتظام ہندوستان کے ایسے اجتماع کیلئے آپ اپنی نظیر کہلا سکتا ہے۔ یہ سب نتیجہ ہے نواب زین یار جنگ بہادر کے نفاست طبع اور کانگریس سے گہری دلچسپیوں کا۔ جس کی وجہ حیدرآباد کی دیرینہ روایات اور نمایاں ہوگئیں یقین ہے کہ ہمارے مہمانان محترم کے دلوں سے یہ نقش مدتوں مٹ نہ سکے گا جس طرح اس شاندار اجلاس کے مباحث ختم ہوئے ہیں خدا کرے اوس کے نتائج بھی دوررس اور مفید ثابت ہوں۔ البتہ بعض زبانیں "مقامی رسائل کے مدیران کو مدعو نہ کرنے کی شکوہ سنج تھیں" حالانکہ زبان کی اصلاح اور ادب وشعر کی نشر واشاعت کا وسیع ذریعہ ماہوار رسائل ہی ہوتے ہیں ان سے بے اعتنائی کوئی خوشگوار تعاون نہیں ہو سکتا۔

آئندہ کسی اشاعت میں ہم اپنے آٹو گراف البم سے وہ غزلیں شائع کریں گے جو مہمانان محترم سے حضرت جگر مرادآبادی اور سید ظہیرالدین صاحب علوی ظہیر شعبہ اردو مسلم یونیورسٹی علی گڈھ نے لکھی ہیں۔

شام و سحر

(۱)

صبحِ ہستی آشنائے شامِ ہستی ہو چلی   مہرِ تاباں کی درخشانی میں پستی ہو چلی
شاہِ انجم چھپ گیا، تاروں کی بستی ہو چلی   اور مسلط چار سو یک گونہ مستی ہو چلی
شام کے آغوش میں مہرِ تپاں روپوش ہے   شب کی تاریکی میں دنیائے عمل مدہوش ہے

(۲)

صبح کا نکلا ہوا اب کارواں منزل میں ہے   لیلئ شب محوِ خوابِ جانفزا محمل میں ہے
اِک فقط بلبل نوا سنجِ فغاں محفل میں ہے   اور اِک ہیجان برپا اس دلِ بسمل میں ہے
ربطِ باہم دونوں میں دیرینہ ہے نالے ایک ہیں   کشتگانِ غم ہیں، اپنے دل پہ آلے ایک ہیں

(۳)

ہیں رہِ غم کے مسافر، اپنی منزل دُور ہے   مرحلے طے کرنے ہیں، راہِ عمل بے نور ہے
لَن ترانی کی صدا باقی ہے، کوہِ طور ہے   یاں تنازُع لِلبقا کا جاوداں دستور ہے
اے کہ سُن گر آرزوئے منزلِ مقصود ہے   حرکتِ لاانتہا ہی رازِ ہست و بود ہے

(۴)

غنچہ ساں ہے کیوں گرفتہ؟ کیوں ہے پابندِ محن   نکہتِ گل بن کے ہو آوارہ بر دوشِ چمن
پھر اَناالحق کیلئے تیار ہے دار و رسن   پھر متاعِ ہوش لوٹے ہے فریبِ پیرزن
آبیاری نہرِ شیریں کی کسی قصے میں ہے   آج کل فرہاد باہمت کے حصے میں ہے

(۵)

پست اب کیوں ہوگئیں وہ رفعتیں افکار کی   کیا ہوئی اب وہ روانی گرمئ رفتار کی
ک[illegible] ہوگئی ہے دھار بھی تلوار کی   ہر طرف سے اب تو چھائی ہے گھٹا ادبار کی

عہد ماضی کا ترے رنگیں فسانہ رہ گیا — رہ گیا رونے کو تو، ہنستا زمانہ رہ گیا

(۶)

کیا اسی دن کے لئے عہد وفا باندھا تھا تو؟ — کیا اِسی خاطر بہا اسلاف کا تیرے لہو؟
کیا ہوا جوشِ عمل اور وہ ترا ذوقِ نمو؟ — کیوں تہی داماں پھرے ہے آجکل تو کُو بکُو؟
اب نہ وہ ساقی - نہ وہ میکش - نہ وہ محفل رہے — وہ نہ لیلائیں رہیں باقی - نہ وہ محمل رہے!

(۷)

حیف خستہ ہو گیا تیرے ارادوں کا فرس — قافلہ اوجھل نظر سے اور منزل دور رس
کارواں کے بعد کچھ باقی تھی آوازِ جرس — اب تو تو ہے اور ہے گرد و غبار راہ بس
عرصۂ عالم میں تیری شومئی تقدیر دیکھ — پاؤں میں تیرے غلامی کی پڑی زنجیر دیکھ

(۸)

ہو گئی مدت، چمن سے فصلِ گل روپوش ہے — بلبل بے خانماں اب آشیاں بر دوش ہے
نوجوانی ہی میں تجھ سے موت ہم آغوش ہے — نشۂ غفلت کے متوالے، تجھے بھی ہوش ہے
یہ زبوں حالی ہے خود تیری مکافاتِ عمل — قعرِ ذلت کے مکیں اب تو ذرا لِلّٰہ سنبھل

(۹)

ہے ارادہ شرط، منزل اب بھی پا سکتا ہے تو — عزم راسخ ہے تو جوئے شیر لا سکتا ہے تو
ہو جو ہمت، آگ پانی میں لگا سکتا ہے تو — وسعت دنیا میں عزت سے سما سکتا ہے تو
کیا سبب اغیار ہی کے ہات ہوں بادہ و جام — محفل ساقی میں تو بھی اپنا کر پیدا مقام

(۱۰)

نکہتِ گل اور ہے، رنگِ گلستاں اور ہے — اور ہے برقِ تپاں، شمعِ شبستاں اور ہے
وہ مسلماں اور تھا اور تو مسلماں اور ہے — درد کا تُو درد والے تیرے درماں اور ہے
تو نہ جب تک اُس کے نقشِ پا پہ ہوگا گامزن — ٹھوکریں کھاتا پھرے گا یوں ہی رُسوائے زمن

(۱۱)

نعرۂ اللہ اکبر میں لحن پیدا تو کر — سینۂ حبشی میں تھی جو، وہ جلن پیدا تو کر

بوذرؓ۔ وسلمانؓ۔ وحیدرؓ۔ کا چلن پیدا تو کر　　کربلا والوں کا پھر رنگیں کفن پیدا تو کر
آئینہ ذوقِ عمل کا تیرے گرد آلود ہے　　عزم و استقلال تجھ میں نیست اور نابود ہے

(۱۲)

اندلس، یورپ، عجم، افریقہ و ہندوستاں　　تیرا لوہا مانتا تھا دم بخود سارا جہاں
الحذر تیرے مہم۔ غزوات تیرے الاماں　　اب وہی تو ہے کہ ہے پژمردہ بجبیں، نیم جاں
اٹھ کہ پھر پر تولتا ہے تیری قسمت کا عقاب　　اٹھ کہ پھر وا کر جہانداری، جہانبانی کا باب

(۱۳)

اُٹھ کے پھر ہنگامہ برپا مشرق و مغرب میں کر　　روحِ بن و بدر پھر رنگ ابی طالب میں کر
طارق و محمود کے یلغار ہر جانب میں کر　　قلب مضبوط و قوی پیدا ترے قالب میں کر
دیکھ پھر کیسے عروسِ دہر بر ماتی ہوئی　　تیری ہی ہو رہتی ہے یہ آغوش گرماتی ہوئی

(۱۴)

چونک غفلت سے۔ ہُویدا پھر سحر ہونیکو ہے　　پھر ہم آغوشِ تجلی برگ و بر ہونے کو ہے
قافلے کا کوچ پھر اے بےخبر ہونیکو ہے　　تو پڑا سوتا ہے کیوں؟ کیا دربدر ہونیکو ہے
اِس تن آسانی کا اے غافل بُرا انجام ہے　　گامزن ہیں اور، تو گم گشتۂ ایام ہے

(۱۵)

پا بہ گلِ رہنا ہے قسمت سروِ بستاں کیلئے　　محور و مرکز ہے ماہ درخشاں کے لئے
وسعتِ دنیا ہے کم تجھ رخشِ جولاں کیلئے　　تیری پیدائش ہوئی عزم سلیماں کے لئے
تا بہ کئے وا ماندگی؟ تا کے تخیل با غتن؟　　دیگراں ساغر بہ لب تو تشنہ در انجمن!

م۔ ن۔ محشر

اے پپیہے خبردار ہو ذرا ہماری نصیحت سُن کہ آسمان پر بیشمار ابر ہیں مگر تمام ایک قسم کے نہیں کئی تو بارش سے زمین کو سیراب کرتے ہیں اور کئی فضول گرج کر ہوا ہو جاتے ہیں۔ اس واسطے اسے دوست ابر نیساں کے سوا کسی کے آگے عاجزانہ التماس نہ کر۔

مغالطہ

اعزازی نوٹ:- اس کھیل کا بنیادی خیال ایک مرہٹی فسانہ سے چرایا گیا ہے۔

(۱)

(اسکول کا ایک وراندہ۔ کئی لڑکیاں ادہر ادہر آجا رہی ہیں۔ ایک طرف کو ذرا ہٹ کے تین لڑکیاں کھڑی آپس میں باتیں کر رہی ہیں، دو مسلمان ہیں ایک ہندو۔ آپس کی مخاطبت سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نام زہرہ، عشرت اور کمود ہیں۔ زہرہ اور کمود صبیح ہیں لیکن عشرت کچھ سانولی ہے)

عشرت۔ سچ! آج بڑا مزا رہے گا۔ تم دونوں ہیرو، ہیروئن بن رہی ہو نا (کچھ سوچ کر کمود کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے) ایک بڑی اچھی سی ترکیب سوچی ہے۔

کمود۔ آخر وہ کیا؟ ہم بھی تو سنیں۔

زہرہ۔ خواہ مخواہ دانت دکھائے جا رہی ہو۔ کچھ بتاؤ گی بھی کہ نہیں۔

عشرت۔ واللہ بڑے مزے کی ہے لیکن میں تم کو تو ہرگز نہ بتاؤں گی۔ واہ خوب رہی یہ بھی کہ سوچیں تو ہم سر کھپا کر۔ اور بتا دیں تمہیں مفت میں۔

کمود۔ یہ تو بس حماقت ہی حماقت ہے ہنسے چلے جانا بلا وجہ یونہی۔ بات بے بات محفل میں۔

زہرہ۔ کچھ اپنی صورت جیسی ہی بات ہوگی۔ اچھا نہ بتاؤ نہ سہی۔ جیسے ہم ان کے بڑے و۔ ہیں نا۔

عشرت۔ اچھا! اچھا! چڑو نہیں بتو لیکن ابھی سے بتاؤں گی تو لطف کھویا جاتا ہے۔

زہرہ۔ ذرا سی بات بتانے میں اتنی خوشامد۔ واللہ بالکل احمقانہ پن ہے۔ اب لطف نہ آئیگا۔ تو کیا انگلش کلاس میں آئیگا۔

عشرت۔ واقعی باتیں کرنے کو تو کلاس ہی موزوں ہوتی ہے چپکے چپکے۔ دھیرے۔ دھیرے۔

کمود۔ تو آخر کب بتاؤ گی بھی۔ کہہ بھی دو نا۔

عشرت۔ جب ڈرامہ کے آخری سین میں تم دونوں اپنی شادی کے بعد ساتھ ساتھ بیٹھو گی تب سمجھیں!

زہرہ۔ یہ بھی خوب رہی۔ وہاں بھی کچھ چھیڑ کرنے پہنچ جاؤ گی تم۔ کوئی ایسا ہی فقرہ کسنے۔

عشرت۔ وقت آنے پر معلوم ہو جائے گا۔

(ڈرامہ شروع ہونے کی گھنٹی بجتی ہے)

کمود۔ اے لو۔ وہ تیاری کی گھنٹی بھی بج گئی۔ تمہاری
سبھی چلو اب چلیں بھی۔ (پردہ گرتا ہے)

(۲)

(ایک کمرہ۔ بادی النظر میں ہراج خانہ معلوم
پڑے۔ ایک طرف سنگھار میز لگا ہے۔ اس کے سامنے
کرسی پر ایک لڑکی بیٹھی ہے۔ لڑکیاں کپڑے پہن پہنا کر
آتی جاتی ہیں۔ لڑکی سب کو 'میک اپ' میں مدد
دے رہی ہے۔ سب اپنی اپنی تیاریوں میں مشغول۔
کوئی دوپٹہ اوڑھ رہی ہے، کوئی پاؤڈر تھوپ
رہی ہے کوئی کسی کو زیور پہنا رہی ہے۔ ایک عجیب
بے چینی اور چھینا جھپٹی ہو رہی ہے۔ اسے کنگھے
سے فرصت نہ اسے کاجل سے۔ اتنے میں وہی تینوں
لڑکیاں داخل ہوتی ہیں۔ زہرہ سمندری رنگ کی ساری
باندھے ہے جس پر ستارے جگمگ جگمگ کرتے ہیں،
مانو ناس کا آکاش۔ کانوں میں بندے لرز رہے ہیں
کمود۔ نیلی ٹوئیڈ کی شیروانی، سفید بے داغ
پاجامہ پہنے ہے۔ ہاتھ میں ٹوپی الجھی ہوئی۔ بال برابر
کر رہی ہے۔
عشرت۔ چنا چنایا کھڑا دوپٹہ، پاجامہ اور لمبی
آستینوں والا کرتا پہنے زہرہ اور کمود کو سنوارے
جاتی ہے)

زہرہ۔ اے عشرت۔ ذرا یہ پھول تو میرے
لگا دینا۔ کمود۔ زہرہ! پہلے چوٹی تو ٹھیک سے بندھوا لو۔

عشرت۔ چوٹی تو ذرا بھلی نہ لگے۔ جوڑا بندھوا لو
اس میں پھول سجیں گے تو مانو ناگن بیلے کی ڈال پر
جھول رہی ہو۔

کمود۔ لے بس۔ یہی ٹھیک رہی۔ (زہرہ آئینہ کے
آگے کھڑی بال باندھ رہی ہے۔ اس عرصہ میں کمود
بال چھپا ٹوپی پہن چکتی ہے۔ شیروانی عشرت ٹھیک
کرتی ہے۔ میک اپ کرنے والی لڑکی پکارتی ہے)

لڑکی۔ کمود۔ او کمودی۔ جلدی آنا بھئی سب
تیار ہو چکے۔ تم تینوں کسی طرح تیار نہیں ہونے
پاتے۔ حالانکہ اہم کردار تمہیں لوگوں کے ہیں۔

عشرت۔ میرا کیا ہے رجو۔ کالی کلوٹی میک
اپ کی ضرورت ہی کیا۔ کردار بھی کون بڑا اہم۔ ہاں
ان دونوں کو کسی طرح تیار کر چکو تو جانو۔

کمود۔ رضیہ تم فکر نہ کرو، منّا ہماری۔ یہ ہماری
آپا عشرت بڑی اچھی طرح ہمارا سارا کام کر لیتی ہے

عشرت۔ خوب رہی۔ ترس کھا کر جو ذرا کام کر دیا
تو منّی نے آپا کا خطاب جڑ دیا۔

کمود۔ ار۔۔۔ار۔ برا نہ ماننا رانی۔ ہم نے
تمہیں تو ہمارا بنانیوالا بتایا ہے اور مجھے اپنی آپا سے
اتنی محبت۔۔۔۔!

عشرت۔ بنا لو بتو جتنا جی چاہے۔ ذرا تم دونوں
اچھی ہونا۔ میں ذرا کالی ہوں۔ نہ معلوم اللہ میاں
کا کیا بگڑتا جو مجھے بھی ذرا ہی خوبصورت بنا دیتے۔

تب تمھیں ناکوں چنے چبواتی۔

زہرہ۔ (جوڑا ٹھیک کرتے ہوئے) اچھا ہی ہوا جو تم خوبصورت نہ بنیں۔ زمین آسمان ایک ہوجاتے۔ اللہ رگ پہچانتا ہے۔

(سب لڑکیاں ہنس پڑتی ہیں۔ رضیہ پھر چلاتی ہے)

رضیہ۔ آؤ بھئی جلد آبھی جاؤ۔ تم تینوں اب جہاں بھی ہوں گی قینچی جیسی زبان چلاتی ہی رہوگی۔

عشرت۔ ہاں رضیہ۔ یہ دونوں بڑی خراب ہیں میں تو کام کر رہی ہوں۔ مگر یہ دونوں کسی طرح چپ نہیں کرتیں۔ کام بھی لیں گی۔ لڑیں گی اور بک بک بھی کریں گی (کمّو رضیہ کے پاس چلی جاتی ہے)

زہرہ۔ لو عشرت ذرا یہ پھول تو لگادو۔ ایسے اچھے ایسے اچھے کہ بس!

عشرت۔ ایسے اچھے اچھے کہ کہ (آنکھیں عجیب طرح نچاتی ہے۔ زہرہ چپت لگاکر ہنس دیتی ہے)

عشرت۔ (رونی صورت بناتے ہوئے) دیکھو کمّو! اللہ تم میرا بدلا ان سے لینا۔ کیا ستا مارا ہے انھوں نے۔

کمّو۔ ضرور ضرور! بس ذراسی دیر ہے۔ پھر دیکھو کیسے لگاتا ہوں (شیروانی کے بٹن سنوارتی ہے۔

عشرت زہرہ کے پھول چن دیتی ہے دونوں باری باری اپنے کو بناتی ہیں۔ عشرت آخری بار بالکل ٹھیک کردیتی ہے۔ اور زہرو کی طرف دیکھ کر آنکھیں بنا بنا کے ہنستی ہے۔ (پردہ گرتا ہے)

—— (۳) ——

(ڈرامہ کا ختم ہے۔ لڑکیاں بے ترتیب ہوگئی ہیں۔ کوئی کپڑے سنبھالتا ہے۔ کوئی چیزیں سمیٹ رہا ہے، اسٹیج پر ایک صوفہ پڑا ہے جس پر کمّو اور زہرہ زنانہ اور مردانہ لباس میں ہاتھوں میں پھول سنبھالے بیٹھے ہیں۔ اٹھا ہی چاہتے ہیں کہ عشرت دوڑی آتی ہے)

عشرت۔ ارے ذرا کی ذرا بیٹھ رہو۔ کہاں بھاگی جاتی ہو۔ مجھے کچھ کرنا ہے۔

کمّو۔ بھئی یہاں سے تو اٹھنے دو۔ کام باہر جاکر کرلیں گے۔ یوں بیٹھنا کیسا مضحکہ خیز ہے۔ آب

عشرت۔ انہوں۔ کام تو یہیں کرنا ہے میں نے کہا نہ تھا تم سے۔ اب بیٹھ بھی چکو۔ زہرہ پھر بتادونا۔ (عشرت کیمرہ نکال دونوں کی ایک طرف کھڑے ہوئے تصویر لے لیتی ہے۔ دونوں حیرانی سی ہیں)

عشرت۔ بس یہی کام تھا اب اٹھ چلو۔ جو جی میں آئے کرنا۔ یہ کیا اب کیوں بیٹھ رہیں۔

زہرہ۔ میری تو کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ آخر یہ کون تھا موقع تصویر کا۔ پھر اس لباس میں۔ ایسا ہی لینا تھا تو ہم بعد کو تینوں مل کرے لیتے۔ کمّو اور کیا میں تو ایسے ہی شیروانی پہنے ہوں گی

بھے ایک کاپی دینا ضرور۔

عشرت ۔ منھ دھو رکھو میں نے کچھ سوچ کر ہی تصویر لی
ہے ۔ تم دونوں کو اسی لباس میں لینا چاہتی تھی ۔ اور
مر میری صورت بھی تو ایسی نہیں کہ تمہارے ساتھ
تصویر لواتی۔

کمود ۔ تم ہماری آنکھوں سے تو دیکھو اپنے کو۔
ور پھر زبان تو تمہاری ہزار صورتوں پر بھاری ہے۔
را اٹھے ہیں پردہ)

(۱۴)

(زہرہ کی شادی ہے ۔ مسند پہ زہرہ کچھ سمٹی سمٹائی
ی بیٹھی ہے ۔ عشرت اور کمود پاس ہی ہیں ۔ عشرت
زہرہ کو سنوار رہی ہے ۔ برابر باتیں بھی کئے جاتی ہے
نتی کسی کی نہیں ۔ زہرہ سن کر کبھی مسکراتی ہے کبھی
ور زیادہ شرما جاتی ہے ۔ اور بہت ساری سہیلیاں
بھی جھرمٹ بنائے ہیں)

عشرت ۔ کمود ! تم تو بس چپکی بیٹھی رہتی ہو کچھ
ام نہیں کرتیں ۔ لو سنبھالو یہ آئینہ سامنے ۔ میں ذرا آنکھ
ند ہوں ۔

کمود ۔ تمہارے ہوتے کوئی کام بھی تو نظر آئے ۔

عشرت ۔ باتیں نہ بناؤ ۔ آج کی برپائی تو یوں ختم
ہونے دوں گی ۔

کمود ۔ (آئینہ سنبھالتے ہوئے ۔ عشرت ٹیکہ
اتی ہے) ہوش کی کیا میں تیری جیسی میٹھی ہوں جو ناس

کھاؤں ۔ بس ذرا سا میوہ کھایا ہے ۔ اور بھئی تو جو یہ
ان مار کے کام کر رہی ہے ۔ تو کیا یہ تجھے یاد بھی کریں گی
بعد کو۔

رضیہ ۔ اور سنا کہ ان کی نندیں بڑی حسین و خوبصورت
ہیں ۔ وہ ان کو پیار کریں گی۔

عشرت ۔ منا ہم چیز ہی اور ہیں ۔ اور تم نندوں کے
حسن کا کسے طعنہ دیتی ہو ۔ کیا میں کچھ کم ہوں (سب
ہنستے ہیں) ارے میں تو اوّل درجہ کی خوبصورت ہوتی۔
بس ذرا آنکھیں بڑی اور نشیلی ہوتیں ۔ ذرا بال لمبے
ہو جاتے ۔ ذرا رنگ کھلتا کھلتا یا سمبلنی ہوتا ۔ اور
ذرا ابرو کماندار ہوتے ذرا ناک .....

کمود ۔ (سب کے پیٹ میں بل پڑ رہے ہیں ۔ کمود
ٹھٹا مار کے) بھئی یہ ذرا ذرا کی خوب ہی رہی (پھر
قہقہہ پڑتا ہے)

عشرت ۔ یاد کریں یا نہ کریں ۔ اب تو ہماری دوست
ہیں ۔ تم کڑھو نہیں کمود ۔ تمہارے بیاہ میں میں بھی
آؤں گی ۔ اور اس سے کہیں اچھا تمہیں بناؤں گی ۔
تم اس کا برا نہ مانو ۔ سنگھار کا ذمہ میرا ۔

(زہرہ بھی جو ابھی تک ہنسی ضبط کئے تھی ہنس
پڑتی ہے ۔ کمود ۔ شرما کر ایک ٹھوکا عشرت کے دیتی ہے ۔
عشرت ہنسی کے مارے لوٹ جاتی ہے ۔ اتنے میں زہرہ
کی امی آتی ہیں ۔ لڑکیاں جلد اٹھ کھڑی ہوتی ہیں ۔
زہرہ سر جھکا لیتی ہے ۔

سب لڑکیاں - خالہ جان آداب - خالہ جان تسلیم - مبارک ہو آپ کو -

خالہ جان - جیتی رہو - تم کو بھی سلامت رہے - پروردگار تمہارے بھی سہرے کے پھول کھلائے -

ہاں بچو - تم نے کھایا بھی کہ نہیں -

سب لڑکیاں - جی ہم سب کھا چکے - شکریہ -

کمود اور عشرت - اور ہم نے زہرہ کو بھی کھلادیا ہے

خالہ جان - اچھا کیا - کمود تمہاری ماتا نہیں آئیں ابھی؟

عشرت - وہ تو مہمانوں کی طرح آتی رہیں گی - کیا کرتیں جلد آکر سوائے پان خرچہ کرنے کے - کام کرنے والے تو کچھ ہم ہیں -

خالہ جان - پان خرچ آج نہ ہوں گے تو پھر کب ہوں گے - بچی باتیں تو خوب کرتی ہے - میں تمہارے لئے بھی بھجوائے دیتی ہوں کھا لینا -

سب - شکریہ! شکریہ (وہ چلی جاتی ہیں)

عشرت - شکریہ تو میرا ادا کرو - ہاں کیا چال چلی ہے -

رقیہ - بھئی عشرت سمجھ میں نہیں آتا - اپنا تحفہ کسے پکڑا دوں - تم ہی سنبھالو نا (ایک پیکٹ دیتی ہے)

عشرت - تم بڑی پیاری اچھی بچی ہو - چلو تم سب بھی کھالو اپنے تحفے - کمود ذرا وہ اسٹول تو دینا -

(کمود تپائی لئے آتی ہے - سب اس پر تحفے رکھ دیتے ہیں - عشرت سب دیکھ رہے ہیں)

عشرت - کمود بھئی تم کیا دے رہی ہو - کمود - مرضی اپنی - تم سب کا پوچھو گی اپنا تو بتاؤ -

(عشرت ایک چاندی سے جڑی تصویر نکالتی ہے - وہی کمود اور زہرہ والی تصویر ہے - سب ہنس دیتے ہیں)

(۵)

(زہرہ کا اپنا گھر - وہ کمرہ میں اکیلی بیٹھی ایک بکس ٹٹولتی ہے - اور وہی تصویر نکال کر دیکھتی ہے اتنے میں بائیں طرف کا پردہ اٹھا کر بیرسٹر ریاض زہرہ کا شوہر آتا ہے - کافی اچھا آدمی ہے - زہرہ چاپ سن کر ڈرتی ہے - اور فوراً ہی گھبرا کر بکس مقفل کر دیتی ہے - پھر بھی وہ دیکھتا ہے)

ریاض - کیوں زہری کیا دیکھ رہی تھیں اکیلے اکیلے - ہمیں بھی تو بتاؤ نا -

زہرہ - کچھ نہیں جی! کچھ نہیں - آپ کے دفتر جانے کا وقت ہو گیا - ہاں سنئے تو میں آج ذرا مسز چندر کمار کے ہو آتی ہوں - بہت دنوں سے بلائے جاتی ہیں (ریاض زہرہ کی پریشانی کو غور سے دیکھتا ہے)

ریاض - ہوں - چلی جانا - کب تک لوٹو گی -

زہرہ - یہی دو گھنٹے تک -

ریاض - مگر تم نے تو وہ بتایا ہی نہیں -

زہرہ - جی وہ کوئی آپ کے دیکھنے کی چیز نہیں

(زہرہ بڑی معصومیت سے یہ جملہ ادا کرتی ہے - لیکن ریاض تیور چڑھا لیتا ہے - وہ جانے لگتا ہے)

زہرہ دروازہ تک جاتی ہے مگر کچھ کہہ نہیں سکتی۔ وہ کمدرسا چلا جاتا ہے۔ زہرہ گھبرائی ہوئی بکس کے پاس آتی ہے)

زہرہ ۔ یا اللہ اب کیا کروں! وہ تو جیسے ناراض ہو گئے ہوں۔ لیکن بتاؤں بھی کیسے! عشرت نے خوب شرارت کی۔ لیکن اسے کیا معلوم تھا۔ خود مجھے بھی کیا معلوم تھا...... انہہ اب اگر پوچھیں تو بتا دوں گی۔ اب تو مسز کمار پاس جانا ہے۔ وہ تو اب ایک بجے آئیں گے ۔ (پردہ)

(۶)

(زہرہ کا شوہر ریاض دبے پاؤں داخل ہوتا ہے۔ اِدھر اُدھر دیکھتا ہے اور پکارتا ہے)

ریاض ۔ آیا.... او آیا۔ بی بی جی نے کب تک لوٹنے کو کہا ہے؟

آیا ۔ گیارہ بجے آنے کو بولیں تھے پر اب تو دس بجیں سرکار۔

ریاض ۔ اچھا آیا ذرا بی بی کی کنجیاں تو لادو۔

(آیا چابیاں لادیتی ہے)

ریاض ۔ تم جاؤ اپنا کام کرو (بکس کھول کر تصویر نکالتا ہے۔ چاندی کے چوکھٹے میں جڑی ایک خوبصورت جوڑے کی تصویر۔ زہرہ کا ساتھی کون ہے؟ سوچتا ہے)

ریاض ۔ ہوں تو زہرہ بیگم صاحبہ بھی دیکھا کرتی تھیں۔ مجھ سے چھپ کر تنہائیوں میں دیکھنے میں کتنی معصوم۔ عورت واقعی عورت ہے زلیخا کی بہن جو ہوئی۔ اس نے خواہ مخواہ میری تمناؤں سے ہولی کھیلی۔ بیرسٹر ہو کر بھی میں اس مجرم کو پہچان نہ سکا۔ (قدموں کی آہٹ ہوتی ہے۔ وہ چپ سا ہو جاتا ہے۔ زہرہ پردہ اٹھا کر داخل ہوتی ہے۔ ویسی ہی تازہ رو اور ہنس مکھ۔ لیکن فوراً ہی چونک پڑتی ہے)

زہرہ ۔ اوہ! آپ اتنی جلد آ گئے۔

ریاض ۔ ہاں مگر آنا نہ چاہئے تھا۔

(بے رخی سے باہر چلا جاتا ہے۔ زہرہ پریشان سی ہو جاتی ہے۔ زندہ دلی غائب ہو جاتی ہے۔ سوچتی ہے۔ بکس کو ادھ کھلا اور چابیوں کو فرش پر پڑا دیکھ کر سر ہلا دیتی ہے۔ جیسے سمجھ گئی ہو۔ دو آنسو مچل کر نکلتے ہیں، اور رخساروں پر ٹھٹک جاتے ہیں) (پردہ)

(۷)

کمود کا کمرہ ہے۔ کرسی پر بیٹھی جھول رہی ہے۔ کچھ گنگناتی ہے۔ اتنے میں عشرت کچھ پریشان سی داخل ہوتی ہے۔ کمود فوراً کھڑی ہو کر اس سے لپٹ جاتی ہے)

کمود ۔ ہلو عشرت! بہت بعد آنا ہوا۔ تعطیلات میں کبھی دل ہی نہیں لگتا۔ اچھا ہوا کہ تم آ گئیں۔

چلو پکچر چلیں، (پکڑ کر عشرت کو صوفہ پر بٹھاتی ہے خود بھی بیٹھ جاتی ہے)

عشرت - تم کو پکچر کی لگی ہے، یہاں تو جناب جان پر بنگئی ہے۔

کمود - (پریشیان ہوکر) کیوں! بات کیا ہے' جلد کہو۔ جبھی تو کہوں تم خاموش سی ہو - ورنہ آتے ہی زبان چلنے لگتی - دو میل سے آمد کی خبر ہو جاتی، شرارت سوجھتی۔

عشرت - کمودی اب سے میں نے کان پکڑے شرارت کروں تو جانو۔ یہ شرارت کا نتیجہ ہی ہے۔

کمود - تمہاری توبہ شرابیوں کی توبہ، دن کو توبہ رات کو میخواری (دونوں ہنس دیتے ہیں) آخر بتاؤنا کیا ہوا جو یوں منہ پر ٹھیکرے ٹوٹ رہے ہیں' کب سے پریشان کیا ہے۔ (عشرت ایک خط ہاتھ میں پکڑا دیتی ہے۔ کمود بھویں سکوڑ لیتی ہے، اور پڑھنے لگتی ہے۔ عشرت چوڑیوں سے کھیل رہی ہے - کمود کو دیکھتی ہے، اور پھر کچھ سوچنے لگتی ہے)

کمود - (خط ختم کرکے) آخر ہوا نا وہی بیچاری زہرہ پہ آفت آئی۔ ان کے میاں کیسے بھلے سے لگتے تھے، لیکن کیسے نکلے۔ تمہاری تصویر کے سبب بات چیت بند ہے۔ ہائے اللہ زہرہ۔

عشرت - (ایکدم اچھل کر) اہا اہا۔ کیا بات یاد آئی۔ ہاتھ لا کمودی۔ ایسی چال سوچی ہے کہ بس - حیرت ہے ابھی تک دماغ کہاں تھا۔ اب جو آگ لگائی ہے۔ شرارت سے تو بجھا بھی دوں گی ایسے ہی۔ لاپیڈ پیپر لکھیں خط زہرہ کو (کمود جیر الماری سے رائیٹنگ پیڈ لاتی ہے) (پردہ)

(۸)

زہرہ کچھ خوش خوش کچھ رنجیدہ رنجیدہ سی گھر کا کام دیکھ رہی ہے۔ لباس وہی ڈرامہ والا پہن آئی ہے - بالوں میں پھول سنوار رہی ہے سنگھار دان کے آئینہ میں اپنے آپ کو دیکھ کر مسکرا دیتی ہے)

زہرہ - آیا! دیکھو تو سب کام ٹھیک ہیں آج میرے دوست آرہے ہیں۔ اور ہاں رجب علی سے کہنا باہر رہے کہیں چلا نہ جائے۔

آیا - اچھا ماں! مگر آپ کی سہیلیاں صاحب کے سامنے نکلیں گے؟

زہرہ - کیوں نہیں آیا۔ وہ تو میری عزیز ترین دوست ہیں۔ مانو بہن جیسی - (ریاض داخل ہوتا ہے تیور بگڑے - چہرہ سہتا ہوا۔ آرام کرسی پر گرتا ہے)

ریاض - آخر کون آرہا ہے؟

زہرہ - میرے کالج فیلو - کیوں (سہمی ہوئی اسے دیکھتی ہے)

زہرہ - (موٹر کی آواز سن کر) اسے لو وہ تو ابھی گئے۔ کیا آپ ان کا استقبال نہ کریں گے (اس سے پہلے کہ وہ کچھ جواب دے ہنستی ہوئی عشرت

کمود کے ساتھ جو مردانہ وہی لباس میں ہے آتی ہے اندر آکر زہرہ سے لپٹ جاتی ہے۔ کمود لڑکے کی طرح دُور ہی کھڑی مسکرائے جاتی ہے)

کمود۔ آداب عرض ہے مسٹر ریاض۔

زہرہ۔ جی تسلیم (آگے بڑھ کر مسکراتی ہوئی ہاتھ بڑھا دیتی ہے)

عشرت۔ (ریاض کو جو حیران دیکھ رہا ہے) آداب عرض ہے دلہا بھائی۔ واہ آپ یہ اجنبیوں جیسے کیوں بیٹھے ہیں۔ پھاٹک تو کیا دروازہ تک بھی تو لینے نہ آئے۔ اور اب بیٹھنے کو بھی نہ کہا معاف کرنا زہرہ۔ اچھا یہ دیکھئے یہ میرے بھائی جان اختر سلیم یہیں رہتے ہیں۔ اپنی زہرہ کے دلہا مسٹر ریاض الدین احمد بیرسٹر (ریاض ناگواری کے انداز میں ہاتھ ملاتا ہے)

کمود۔ آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی ہیں کسی سرکاری کام کے سبب زہرہ کی شادی میں شرکت نہ کر سکا تھا۔ خیر اب ملاقات ہوگئی۔

ریاض۔ لیکن بعد میں بھی کبھی آپ نظر نہ آئے۔

کمود۔ جی ہاں۔ آپ سے ملنے کی آرزو تو بہت تھی، اور زہرہ کو دیکھنے کی بھی۔ لیکن کچھ ایسے ہی ملنا نہ ہوا۔ اب ایک ہفتہ کی رخصت پر یہاں آگیا تو عشرت نے کہا ملتے چلو (چائے آتی ہے۔ زہرہ بنانے لگتی ہے)

(زہرہ پہلے کمود کو پھر ریاض اور عشرت کو چائے دیتی ہے۔ ریاض بار بار کمود کو دیکھ رہا ہے)

کمود۔ کہو زہرہ کیسی رہیں۔ ہمارے بغیر تم نے شادی کر لی (مسکراتی ہے۔ ریاض چونک پڑتا ہے)

عشرت۔ بھائی جان یہ بھی خوب رہی۔ آپ تو کوسوں دُور تھے، آئیوں نہیں گئے۔ بلاوا تو ملا تھا۔

کمود۔ سچ بھئی۔ مگر کیا کروں مجبور تھا۔ خیر اب تو مٹھائی کھائے بغیر تمھیں یوں سستا نہ چھوڑوں۔ اور ہاں مسٹر ریاض آپ کو زہرہ جیسی خوبصورت اور خوب سیرت لڑکی ملی ہے۔ مٹھائی ابھی ملجائے۔

عشرت۔ دلہا بھائی تو بات ہی نہیں کر رہے آخر بات کیا ہے؟

ریاض۔ (بہ تکلف مسکراتے ہوئے) نہیں کچھ بات نہیں۔ آپ لوگوں کی دلچسپ باتیں سن رہا ہوں۔

کمود۔ ریاض صاحب کہیں یہ زہرہ آپ سے لڑتی جھگڑتی تو نہیں۔ بچپن میں تو بہت شریر تھیں بات بے بات روٹھ جاتیں تو گھنٹوں منانا پڑتا۔

(زہرہ شرما کر ہنستی ہے۔ ریاض غصہ ہو جاتا ہے)

ریاض۔ لیکن آخر سلیم صاحب آپ دونوں کی دوستی کیسے ہوئی؟

کمود۔ جناب دوستی کی بھی ایک ہی کہی ہمارا تو بچپن ہی سے ساتھ رہا۔ ساتھ کھیلے ساتھ بڑھے۔

ریاض۔ لیکن ایک اجنبی لڑکی اور لڑکے میں

ایسی دوستی ہرگز نہیں ہو سکتی۔ (غصہ بڑھ جاتا ہے)

کمود۔ (تیور چڑھا کر) کیوں نہیں ہو سکتی؟ برابر ہو سکتی ہے۔ دوستی کے لئے کوئی قانون نہیں ہے۔ اور ہماری دوستی کا کیا ہے؟ آپ کے نام و نشان سے پہلے بھی تھی، اور آخر تک رہیگی۔

ریاض۔ اچھا وہ آپ ہی تھے جس نے زہرہ کے ساتھ تصویر لوائی تھی۔

کمود۔ جی ہاں۔ اس میں برائی کیا ہے افسوس میں تو آپ کو روشن خیال سمجھتا تھا۔

ریاض۔ جی مجھے معاف رکھئے۔ میں ایسا روشن خیال نہیں کہ نئی تہذیب کی آڑ میں اخلاق کا خون دیکھوں

کمود۔ جناب آپ کا لہجہ بہت سخت ہے ہم آپ کے مہمان ہیں۔ خیر۔ مجھے تو زہرہ پر رحم آتا ہے کہ ایسا آدمی اس کے پلے پڑا۔ (عشرت اور زہرہ سہمی ہوئی سی ہیں) چلو عشرت ایسے گھر میں ٹھیرنا بھی میں فضول سمجھتا ہوں۔

ریاض۔ جی ہاں آپ ابھی چلے جائیے میں اب سمجھ گیا کہ اس تصویر کا کیا مطلب تھا۔ زہرہ جاؤ تم بھی ان کے ساتھ چلی جاؤ۔ (اس جملہ پر زہرہ سرخ ہو جاتی ہے۔ آنکھیں جیسے برسنے پر آمادہ ہوں۔ عشرت بھی اٹھ کھڑی ہوتی ہے تینوں دروازہ کی طرف بڑھتے ہیں۔

کمود۔ (جاتے جاتے مڑتے ہوئے) خدا حافظ۔ پھر نہ کہنا زہرہ کو لے گئے۔ (یہ کہہ کر ٹوپی اتارتی ہے۔ خوبصورت لمبے بال جو ٹوپی میں جکڑے تھے، گچھوں میں شانوں پر پھسل پڑتے ہیں۔ ساتھ لائے ہوئے بکس سے ساڑی نکال کر کمرے میں جاتی ہے (اور ساڑی پہن کر آداب بجالاتی ہے)

کمود۔ تسلیمات۔ اب شائد آپ حقیقت کو سمجھ گئے ہوں گے۔ اور تصویر کی بدگمانی جاتی رہی ہوگی۔ وہ لڑکا جناب ایک ڈراما میں میں بنی تھی۔ اور تصویر اسی زمانہ کی یادگار ہے۔ معاف کرنا میں نے گستاخی کی۔ لیکن وقت کا مقتضا یہی تھا کمود کا نام تو جانتے ہی ہوں گے اور پھر میرا رشتہ بھی تو آپ سے مذاق ہی کا ہے۔

وہ تصویر اس شریر عشرت نے کھینچی تھی اور اب آپ کو ٹھیک کرنے کی ترکیب بھی اسی نے بتائی (زہرہ کے کندھے پر پیار سے ہاتھ رکھکر) بھئی زہری اب چلتے ہیں ہم۔ اور یہ حضرت بھی ٹھیک ہو گئے ہیں۔ پھر کبھی ضرورت ہو تو یاد کرنا اختر سلیم کو۔

(دونوں ہنستے ہوئے ہاتھ ملا کر باہر چلے جاتے ہیں۔ ریاض حیران سا ہے۔ زہرہ سر جھکائے کھڑی ہے۔ آنسو جیسے ابل رہے ہوں)

ریاض۔ (چونک کر) چلے گئے۔ میں نے بیٹھنے کو

بھی نہ کہا (زہرہ کی طرف بڑھتے ہوئے)

زہرہ ۔ معاف کرنا ۔ مجھے زبردست مغالطہ ہوا تھا ۔ (زہرہ سر اٹھاتی ہے ۔ آنکھیں ایک دفعہ ریاض کو دیکھتی ہیں ۔ پھر جھک جاتی ہیں ۔ جیسے ابھی خفگی نہ مٹی ہو ۔ ریاض اس کی طرف بڑھتا ہے)

(پردہ)

زینت بیا جدہ (سال چہارم)

توجہ طلب آپ کو شکایت ہے کہ نظمیں اور افسانے شائع نہیں ہوتے اور ہمارا عذر یہ ہے کہ وہ معیاری نہیں یوں صفحے سیاہ کر دینا اور بات ہے اسلئے براہ کرم ایسے افسانے یا نظمیں ہوں کہ پڑھنے والا آپ کے مذاق کی داد اور کاوشوں کی حوصلہ افزائی کرے اور پرچہ کا معیار بلند سے بلند ترین ہوتا جائے ۔ ایسے افسانوں کے لئے شہاب کے اوراق ہمیشہ پذیرائی کو آمادہ رہیں گے ۔ لکھئے تو ایسا لکھئے کہ آپ کی تقلید دوسروں کیلئے سبق آموز اور سودمند ہو ۔

آپ ہمیں ملزم ٹھیراتے ہیں اور ہمارا جواب یہ ہے کہ اس میں خود آپ کی کوتاہ قلمی کا زیادہ حصہ ہے ورنہ ہر پرچہ کے اوراق پر مضامین نگاروں کا کافی حق ہے ۔

مضامین صاف خط میں بھیجئے

غزل

(۹)

ابر سیاہ بر رُخ گیتی ردا کشید
بائیست بادہ ہائے خنک ساقیا کشید

تا بوئے زلفِ یار رسد در مشامِ جان
باید فرار منتِ باد صبا کشید

معراجِ عشق تست کہ گویند بعد من
یک مردِ آشنا ستمِ آشنا کشید

طعنہ مدہ کہ مثلِ تو ہر جائی گشتہ ام
جذبِ محبتِ تو مرا جا بجا کشید

رحمے بعاشقے کہ ہمہ عمر خویش را
صد گونہ رنج در طلبِ مدعا کشید

مسلم گدائے خاک در شمس دین منم
کو سرمۂ فروغ بچشم صفا کشید

مسلم

واہمہ

بسلسلۂ گزشتہ

فسانہ

یہ جم کا ہاتھ تھا جو فرنجل کی طرح اس نکتہ سے نا واقف نہ تھا کہ شرکا کی کم تعداد حصہ میں زیادتی کا موجب ہوتی ہے۔

ایک آوارہ گرد اسٹیمر میں وہ دونوں ایک ساتھ سنگاپور روانہ ہوئے یہاں فرنجل نے ایک مقامی قزاق کو خفیہ تحریص دے کر آمادہ کیا کہ وہ جم اوس کے آخری شریک کو ہمیشہ کے لئے اوس سے الگ کر دے۔ فرنجل سمجھتا تھا کہ موتیوں کو کھلے خزانہ مغربی بازار میں فروخت کرنا اندیشہ ناک ہے اگر وہ ایسا کریگا تو کسی نہ کسی مصیبت میں گرفتار ہو جائے گا اور خانگی طریقہ پر فروخت کے لئے کسی گاہک کے پاس لیجانے سے مال مسروقہ کا پانچواں حصہ بھی دستیاب ہوگا اسلئے آلرٹن نامی ایک شخص کے تجارتی جہاز پر وہ بحر الکاہل واپس ہوا، اور ایک غیر آباد جزیرہ پاپاگی پر اتر پڑا۔ یہاں ایک مشہور موتی نکالنے کی کوٹھی تھی جس کی تقریباً نصف سے زیادہ مساحت کی جا چکی تھی لیکن آمدنی سے زیادہ صرفہ ہونے کے باعث ترک کر دیگئی تھی۔ پس طے پایا کہ آلرٹن اپنے سفر کی دوسری مہم پر غوطہ خوروں اور سامان کو لائیگا اور وہ باہم موتیوں کی جستجو کریں گے۔

سڈنی میں کسی شخص کا گمان نہ تھا کہ فرنجل بھی واردات سرقہ میں شامل ہے الزام کو فریر تھا جو پہلے ہی مرچکا تھا۔ بولنگ جم شریک جرم تھا لیکن فرنجل آزاد اور ایک معصوم جوہری تھا پس اوس نے ارادہ کیا کہ سیپیوں کے کھولنے کا کام جو اوس کے غوطہ خور نکالیں گے وہ خود انجام دے گا اور مسروقہ موتی سیپیوں سے برآمد شدہ متصور ہوکر بازار میں بلا کسی خطرہ کے فروخت ہوسکیں گے اور اس طرح وہ اون کی پوری پوری قیمت حاصل کریگا۔

کمرہ کے فرش پر سایہ کے نمودار ہونے سے قبل وہ اکثر اپنی ان تجاویز پر خوش ہوا کرتا تھا۔ اوس کا خیال تھا کہ اوس کے ساتھیوں کے گنوار دماغ ان تجاویز سے کوسوں دور رہتے ہیں لیکن اب اوس کی خوشی خوف سے مبدل ہوگئی تھی اوس کو معلوم ہوا کہ بولنگ جم نہ صرف ابھی زندہ ہے

بلکہ اوس کے تعاقب میں ہے کیونکہ سایہ قدآور اور اوس کے بائیں ہاتھ میں ریوالور تھا اور یہ جم کے سوا اور کوئی شخص نہ تھا۔

سنگاپور کے زرد رو قزاق نے اپنا کام قابل اطمینان طریقہ پر انجام نہیں دیا اور الرٹن جہاز پر روانگی کا حال اوس کو معلوم ہوگیا ہے۔ اس خیال سے فرنجل کے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ چہرہ زرد پڑگیا اور پیشانی پسینہ سے ڈوب گئی۔

ان تینوں ملزمین میں بولنگ جم بیحد سفاک بے رحم اور ظالم تھا۔ فرنجل اوس کی بیدردانہ مظالم کی یاد سے تھرا گیا۔ اوس نے کہا کہ اگر واقعی بولنگ جم اوس کے دروازہ پر آیا تھا اور یہ مہیب سایہ اوسی کا تھا تو نتیجہ اوس کے حق میں بہت برا ہوگا جب وہ دروازہ کی طرف پیٹھ کئے بیٹھا تھا وہ اپنے فریب خوردہ دشمن کے رحم وکرم پر تھا لیکن جم نے اوس کی اس حالت سے فائدہ نہ اٹھایا، اور وہ لوگ جن سے وہ اس طرح درگذر کرتا ہے ایسے خوش قسمت نہیں ہوئے کہ ایک گولی سے فوری اون کا خاتمہ کردیا جائے بلکہ وہ لوگ نہایت وحشیانہ انتقام کے مستحق ہوتے ہیں۔

فرنجل کا تمام جسم خوف سے کپکپا رہا تھا جم کا ناہموار بدنما چہرہ اوس کی چمکدار شیطنت بھری آنکھیں جن سے خوفی شعاعیں نکلتی رہتی تھیں اس کی نظروں میں پھر رہی تھیں۔ وہ موتیوں کی تلاش میں اس جزیرہ میں آیا ہے جن کو وہ اوس وقت حاصل کریگا جب وہ اپنے دہوکہ دینے والے کے جسم کو اپنے قدموں پر زخموں سے دم توڑتے دیکھ لیگا۔

جزیرہ بڑا کافی سرسبز اور گنجان تھا۔ دشمن کے چھپنے کے لئے سینکڑوں پناگاہیں تھیں۔ اوس کا خاتمہ ایک گولی سے بہ آسانی ہوسکتا ہے۔ جب وہ پانی اور غذا کی تلاش میں باہر نکلتا ہے ان خیالات کے تلاطم سے پریشان ہوکر فرنجل نے صندوقچہ رکھ دیا اپنے غذا کے ذخیرہ کی تنقیح کی۔ جھونپڑی میں گوشت کے ڈبوں کے سوا اور کوئی چیز نہ تھی وہ اپنی غذا اس غیر آباد جزیرہ کی فطرتی پیداوار سے جس طرح چاہتا حاصل کرلیا کرتا تھا اوس کے سوا اور کوئی سفید آدمی یہاں نہ تھا اور نہ اوس کو یہ امید تھی کہ الرٹن کے سوا جو غوطہ خوری کا سامان لانے گیا ہوا ہے اور کوئی شخص اس مقام کا پتہ لگا سکیگا۔

الرٹن کی واپسی کے لئے کم سے کم دو ہفتے درکار ہوں گے اوس وقت تک حملہ آور سایہ سے اس مکان کی مدافعت کرنا پڑے گی۔ اوس نے دروازہ بند کردیا۔ کھلی کھڑکی پر نظر پڑی جس میں پٹ نہ تھے میز کی ٹانگیں ہتھوڑی سے الگ کرکے ناہموار تختہ کھڑکی میں جڑ دیا گیا۔ اس سے کسی قدر اطمینان ہوا لیکن پینے کے پانی کا بڑا ۔۔۔ ال تھا۔ جھونپڑی سے

نصف میل دور ہری بھری درختوں کے درمیان ایک پہاڑی چشمہ کا پانی ایک پتھریلی گہری چٹان میں جمع ہوا کرتا تھا۔ جھونپڑی میں ایک چھوٹا برتن تھا جو اس قیمتی سیال شئی سے فی الوقت بھرا ہوا تھا، جو دو ہفتے کے لئے کافی نہ تھا دیوار پر ایک خالی بڑا ڈبہ لٹک رہا تھا جس پر اوس نے ایک پرسکون نگاہ ڈالی لیکن ڈبہ۔ رائفل جواہرات کا صندوقچہ سب ایک ساتھ لیجانا مشکل تھا۔ بالخصوص ایسی حالت میں جب کہ دشمن کے ہر وقت کمین گاہ میں موجود ہونے کا پورا احتمال ہو۔ اور ایک خفیف اشارہ پر رائفل استعمال کرنے کی ضرورت پیدا ہوتی ہو، اوس نے دل میں کہا کہ جب وہ اس [illegible] سے اس ہیئت کذائی سے باہر نکلیگا۔ جم اوس کے خوف سے تھر تھرانے والی ٹانگوں اور بہتے پسینہ پر نظر کر کے مسرت سے بیحد قہقہہ لگائیگا اور بالآخر جب اوس کا تمسکار نظروں سے اوجھل ہونے لگے گا اوس کی ہنسی غضب سے مبدل ہو جائے گی اور رائفل کی ایک گولی اس بے بسی کے عالم میں ہمیشہ کے لئے اس کے خوف کا خاتمہ کر دے گی۔

ڈینی جوہری جس کو اوس کی محنت اور مشقت سے جمع کی ہوئی دولت کے معاوضہ میں منت و سماجت کے باوجود گولی مار دیگئی تھی گیا اسی طرح خوف سے نہ لرز رہا ہوگا یہ وہ وقت تھا جب فرنجل کو اپنی زلیست پر افسردگی اور مردہ جوہری پر ہمدردی معلوم ہوئی۔ عمر میں پہلی بار اوس کو زندگی کی قدر و قیمت اور اپنے گزشتہ واقعات پر نفرت پیدا ہوئی تھی اوس نے کہا کہ اگر وہ اس آفت سے بچ گیا تو پھر کبھی قتل و غارت میں شریک نہ ہوگا قتل ایک ڈراونا انجام ہے جس میں وہ خود گرفتار ہے اوس کو باہر جاکر پانی لانا چاہیئے۔ کیونکہ دو ایک دن اگر ایسی کشمکش و پیچ میں گزر گئے تو پھر جھونپڑی سے باہر نکلنے کی ہمت باقی نہ رہے گی اوس نے صندوقچہ کھولا، موتی کاغذ میں منتقل کئے پڑا جیب میں رکھا، خالی صندوقچہ گڑھا کھود کر زمین میں دفن کر دیا۔ ڈبے میں رسی باندھی اوس کو کندھے سے لٹکایا، رائفل ہاتھ میں لی جھونپڑی کا دروازہ بند کیا اور چپکے سے باہر نکل گیا

دن گرم تھا۔ سمندر کا کنارا ساکت بنا تھا۔ جنگل سو رہا تھا۔ مرطوب ابخرات ہوا میں بلند ہو رہے تھے اور دور سے مینہ برسنے کا گمان پیدا ہوتا تھا فرنجل کے چہرہ پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں، ایک رنگ آتا اور ایک جاتا تھا قدم بھاری اور مشکل سے اوٹھ رہے تھے۔

(باقی)

بہ سرپرستی

محترمہ بیگم نواب مہدی یار جنگ بہادر صدر المہام تعلیمات

شہاب

ناھید

ناہید

جلد ۲ | مہر ۱۳۵۳ف م اگسٹ ۱۹۴۴ء | نمبر ۱۱

---

۱ - بے کیفیاں، ذرا توجہ سے پڑھنے کے لائق ہے کہ اس زندگی میں کیا کیا صورتیں پیش آتی ہیں اور کتنی بے کیفی ہوتی ہے کیا یہ عیوب ہم سے دور ہو سکیں گے۔

۲ - سرحد اور تعلیم نسواں۔ آپ کے ہمدردیوں کے قابل ہے کہ روشن زمانہ میں تعلیم سے یوں لاپروائی برتی جا رہی ہے۔ نہ جانے کب زمانہ پلٹے۔

۳ - گویم مشکل و نہ گویم مشکل۔ درحقیقت مشکل ہے، بے پردگی کی وہ رو ہے جس میں ہم بھی جا رہے ہیں جس کا آج تک کوئی صحیح حل نہ ملا نہ جانے کہاں جا کر ختم ہوگی یہ مسئلہ ہماری بہنوں کو غور و فکر کی دعوت دیتا ہے۔ اس کا سنجیدہ جواب اگر کوئی بہن لکھیں تو اچھا ہوگا۔

۴ - شہر میلا نوجوان۔ مس ریٹا کا ترجمہ ہے جنہیں اردو کا شوق ہے خدا اس شوق میں اور اضافہ کرے۔

۵ - شادی - ۔۔۔ ہے بیگم نواب لطیف الدین خاں کا اس سلسلہ میں ابتک بیسیوں مضامین لکھے گئے ہیں آج تک اس کا تصفیہ نہ ہوا اور نہ ہو سکیگا۔

۶ - کترے ہوئے پھول - ماہ عجم کے ہیں۔

(ب)

بے کیفیاں

"بس اب تو یہ زہر ہی مجھے زہر میں دوا نہ ملا"
وہ دن بھی کتنے سہانے، سلونے اور رسیلے تھے جب کہ زندگی گڑیا کے بیاہ کی طرح معصوم، مکمل، اور بے عیب تھی۔ جب عیب کی باتیں بھی عیب نہ گنی جاتی تھیں۔ اب تو اچھی بھی بری ہو جاتی ہے۔ بری تو پھر بری ہے۔ جب ذری ذری سی بات بہت زیادہ اہم، اور اہم سے اہم ترین باتیں معمولی و ادنی سی محسوس ہونے کا ہی بس احساس تھا۔ زندگی کیونکر گذرتی ہے اس کو در اصل کیسے گذرنا چاہئے تھا۔ اتنی مکاری نہیں آتی تھی کہ جیون کے ان ہتھکنڈوں کو سمجھیں، ہنسنا بولنا ہی بس لے دے کے زندگی کی مکمل داستان تھی۔ مار کا بس خوف تھا جھڑکی کا صرف احساس تھا وہ بھی تھوڑی دیر کے بعد ختم۔

اب تو جیون ایک جنجال ہے۔ جتنا سوچو زندگی مصیبت سے قریب معلوم ہوتی ہے ذرا سی بات طبیعت کے خلاف ہوئی تو جینے سے جی بیزار ہو گیا۔ نیند گھنٹوں کی غارت ہو گئی۔ صبح اٹھے تو بیماروں کی صورت، منہ پر ہوائیاں اچھو رہی ہیں، جن کا دماغ نہیں سوچتا ان کو خوب نیند آتی ہے۔ ادھر سوئے ادھر غائب۔ دنیا بری نہیں، ہم دنیا والے برے ہیں، حسد کی آگ میں ہم جلتے رہتے ہیں۔ اسی حسد کے کارن ہم آئے دن اپنے پرائے کی برائی کرتے ہیں کسی کو اچھے حالوں میں دیکھ نہیں سکتے۔ خدا کی دین پر بھی نکتہ چینی ہے۔ وہ جس کو چاہے نوازے، کسی کا علم آنکھوں میں کھٹکتا ہے تو کسی کی قیمت دولت تو دل کا کانٹا ہے۔ یہی دشمنی کی جڑ بنیاد ہے۔ بھائی بھائی کو دیکھ نہیں سکتا بہن کی محبت پیسہ کی محبت کے سامنے کچھ بھی نہیں رہتی غرض ان سارے مصیبتوں کا سبب جہالت ہے جب تک جہل دور نہ ہوگا۔ انسان علم کے سرچشمہ سے "حقیقی معنوں" میں سیراب نہ ہوگا دل کی دشمنیاں نہ جائیں گی۔

یہ تو رہی دنیا۔ اب اپنی یہ حالت ہے۔ مجبوری کا جہاں سوال آیا طبیعت آپے سے باہر ہو گئی۔ قیود و حدود پسند نہیں آتے بغیر بلائے کہیں آنے جانے طبیعت نہیں چاہتی۔

جہاں بانو ایم۔ اے
حیدرآباد

بلکہ بلائے پر جانا بھی وبال جان معلوم ہوتا ہے۔ فرصت کی یکسانی سے الجھن سی ہوتی ہے۔ کام کی زیادتی سے دم گھبرانے لگتا ہے۔ غرض اس طوفان بے تمیزی کا دیکھئے کیا انجام ہو۔

کسی بچہ کی پیدائش پر سب کیسے خوش ہو جاتے ہیں۔ یہاں یہ سوچ پڑ جاتی ہے کہ نہ معلوم کیوں حضرت دنیا میں آئے ہیں۔ کونسی مہم سر کرنا ہے۔ کتنے میدان مارین گے۔ اگر یہی دنیا در اصل اچھی ہوتی تو نہ جانے کس ذوق و شوق سے آتے ابتو دم غنیمت اتنا ہے کہ صرف روتے ہوئے آئے ہیں۔ جاتے ہوئے بھی سب کو رلائیں گے۔ یہ رونے کا بھی فلسفہ بڑا گہرا اور دلچسپ ہے جن کے دل بہت زیادہ دکھتے ہیں ان کی آنکھوں سے آنسو بہت کم نکلتے ہیں۔ جن کو جلد جلد، ذرا ذرا سی بات پر رونا آجاتا ہے۔ یہ سمجھ جائیے ان کے دل کو معمولی سی بھی ٹھیس نہیں لگی۔ یہ مکاری کے آنسو پیاز کے آنسو۔ یا مگرمچھ کے آنسو صرف دیکھنے اور دکھانے کے ہوتے ہیں جو حقیقت میں روتے ہیں۔ وہ سب سے ہٹ کر روتے ہیں۔ ان کی آہ سحر گاہی و گریہ نیم شبی سطحی آنکھیں نہیں دیکھ سکتیں۔ قدرت کا لگایا ہوا زخم ہر کس و ناکس کو دکھانے کا نہیں ہوتا جو دکھ دیتا ہے اسی سے دوا مانگی جاتی ہے۔ ہر کسی کے سامنے رونا اپنا وقر کھونا اور اپنی جگ ہنسائی ہے۔ مگر اس کو کون جانے۔ بچہ تو بلا وجہ بھی روتا ہے غالب کو بیٹھے بیٹھے دیدۂ تر یاد آتا ہے۔ اقبال کے اپنے انفعالی رونے کو شان کریمی کی ودیعت سمجھتے ہیں۔ اور پھر ادھر ہی لوٹا دیتے ہیں۔ میر کے تو دیدۂ و دل عذاب میں دونوں۔ انیس قسم قسم سے رلاتے ہیں۔ اور یہی رونا بس ایسا ہے کہ اس سے دل کی صفائی و سیاہی دور ہوتی ہے۔ باقی سب ڈھکوسلہ ہے۔

اب چلتے چلتے زندگی کی دوسری موڑ آتی ہے۔ جاتے میں کہیں جنازہ مل گیا۔ اور جی کھٹک گیا۔ اپنی موت آنکھوں میں پھرنے لگی۔ اس دو دن کی زندگی کے لئے لوگ کیا کیا کرتے ہیں حقوق تلفی، مکاری، فریب، جعل، ظلم، غیبت اور نہ جانے کیا کیا خرافات۔ اور ایک بڑی چیز ہے بھی جادو!

اس جادو پر کسی کو اعتقاد ہو یا نہ ہو مجھ کو تو ہو چلا ہے۔ اسی جادو نے ایسے ایسے جادو جگائے ہیں کہ بس آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ ملاؤں نے گھر دیکھا اور گھر کا نقشہ بگڑ گیا۔ آپس میں محبت کو بڑھانے کی سوجھتی ہے۔ ادھر اعتقاد ذرا ڈانوا ڈول ہو جاتا ہے۔ محبت نفرت سے بدل جاتی ہے۔ محبت کوئی اکتسابی چیز نہیں ہے۔ یہ تو دل کا

سودا ہے۔ یہ دل ہے جدھر آگیا آگیا، یہ چھو منتر کا سودا نہیں۔ دو آپس میں مل کر رہنے والوں کو دیکھا نہیں جاتا۔ ان کے نفاق کے سامان ڈھونڈے جاتے ہیں۔ پانسہ الٹ جاتا ہے۔ گھر کی فضا مکدر و ملول ہو جاتی ہے۔

خوشی خوشی لوگ آپس میں کیسی میٹھی چھری بن کر دھنستے ہوئے ملتے ہیں۔ ادھر پیٹھ پلٹی اور تمہاری برائی کے دفتر کھلے۔ ملازموں کے سامنے، بچوں کے سامنے تمہاری ایسی ایسی برائیاں بیان کیجاتی ہیں کہ جن کا عشر عشیر بھی تم میں نہیں ایسی دو رنگی طبیعت والے جو تمہارے سامنے میٹھے اور تمہارے غیاب میں کڑوے ہوتے ہیں کبھی اعتبار کے قابل نہیں۔ خود کو کسی دل پر چڑھانے کے یہ ڈھنگ تو نہیں کہ تم کسی دوسرے کو اس دل پر سے اتار دو جس پر خود چڑھنا چاہتے ہو، جوں جوں تمہارے یہ عیوب کھلتے جاتے ہیں تمہاری قدر و منزلت گھٹتی جاتی ہے۔ دنیا سنتے ہیں چار دن کی ہے۔ لیکن ایسی ذہنیت کے لوگ اس مقولہ پر کبھی سوچ بچار نہیں کرتے۔ ان کی زبان پر تو موت رہتی ہے۔ لیکن اس آنیوالی گھڑی کا ایک ذرا سا بھی ان کے دل میں خوف نہیں رہتا خدا اور موت سے حقیقی معنوں میں ڈرنے والے اس قماش کے نہیں ہوتے۔

چھوٹے ہوئے تیر اور چلتے ہوئے فقرے کبھی واپس نہیں آتے۔ تیر کے زخم تو مندمل ہو جاتے ہیں لیکن الفاظ کے زخم ہمیشہ ہرے رہتے ہیں۔ جس انسان کے یہ فقرے دل دکھاتے ہیں اس سے ملنے، اس سے بولنے، اس کا منہ دیکھنے طبیعت نہیں چاہتی۔ تمہاری اخلاقی جرات تو یہ ہے کہ تم زہر بھی دو تو ہانکے پکارے۔ کسی کی کوئی بات بری لگی تو اس کے منہ پر کہہ دو، ظاہرداری، خوشامد لگی لپٹی کی قلعی بہت جلد کھل جاتی ہے۔ خلوص کا بول بالا ہوتا ہے۔ دشمنی میں بھی خلوص کارفرما ہے۔ ایسے دوست کو آستین کا سانپ سمجھو جو تمہارے سامنے تم پر وارے نیارے جاتا ہے۔ یہ شکر میں لپٹی ہوئی گولیاں بظاہر تو بڑی میٹھی ہوتی ہیں لیکن اندر سے کڑوی ہیں۔

مالک جانے ہم مسلمانوں میں ہی یہ عیب کیوں ہنر مانا جاتا ہے۔ ہم ایمان والے کیوں کافری کرنے لگ جاتے ہیں۔ اپنے گریبانوں کے چاک بھول کر دوسرے کا دامن سینے کی ہم کو کیوں فکر لگ جاتی ہے اپنی برائیوں پر ہماری نظر کیوں نہیں جاتی۔ دوسرے کا ہنر بھی ہم کو عیب کیوں نظر آتا ہے۔ سمجھ قاصر، عقل عاجز اور شعور سر بگریباں ہے۔

زندگی کی ہر دوسری اذیت ناقابل برداشت ہوتے ہوئے بھی گوارا ہے لیکن نہیں ہے تو

دورنگی انسان کی قربت و صحبت ! مگر ۵
جفا اٹھانے کی عادت پڑے تو کیونکر جائے
ستم ہے مگر اتنے کہاں کہ جی بھر جائے

غزل

عالم میں ہم رہے یا زمیں میں نہاں رہے
پر زیر آسماں رہے ہم جہاں رہے
کس طرح تم گذارتے ہو عمر زندگی
مرجائیں ہم یہ عمر اگر جاوداں رہے
لائی قفس میں کھینچ کے رنگین بیانیاں
بلبل کی طرح کوئی نہ شیریں زباں رہے
جب موت آگئی تو عدم نے کیا سوال
مجھ سے بچھڑکے اتنے دنوں تک کہاں رہے
راحت کا شوق یاس و تردد ملال ہجر
سایہ کی طرح ساتھ رہے ہم جہاں رہے
تنکے چنوں کچھ ایسے نشیمن کے واسطے
ہر برق کی نگاہ میں میرا آشیاں رہے
پایا نہ ہم نے چین کہیں زیر آسمان
برق تپاں کی طرح رہے ہم جہاں رہے
چیرا جو قلب خار تو پایا لہو سے گل
کانٹوں سا بھی رہے جو کوئی رازداں رہے
یہ زندگی جمود مسلسل ہے نسیم
خواہش اگر بقا کی نہ دامن کشاں رہے

وحیدہ نسیم

کترے ہوئے پھول

ر ریڈیو سے ج جنگ کی خ خبر سن کے مگن نہ ہو
ص صغیر طائر خوش نوا نہ نفیرِ زاغ و زغن نہ ہو
م م مجھ میں اور ت تجھ میں ج جو ر ربط اور ض ضبط تھا
ب بلبل و رگ گل میں کبھی م میانہ چ چمن نہ ہو
ن نامہ پرسش پنج میں م مجھ سے پ پوچھتا
ک کمر تو ان کے ھ ہے نہیں ک کیا کروں جو دہن نہ ہو
ن نجائے رقیب کے گ گھر خدا کے و واسطے
ر رفیق اس کو نہ جانیئے جو م مجھ سا نیک چلن نہ ہو
ش شیخ شہر کو کیا کہوں س سمجھ لیں آپ ب بن یہی
م مقبروں کا ہو پاسباں کہ کسی لحد میں کفن نہ ہو
ع عجمی غ غریب ہے ت تم غ اس کو نہ دیجئے
ق قدر اس کی جو نہ ہوگئی و دوسروں کو جلن نہ ہو

ماہ عجم بی۔ اے

سرحد اور تعلیم نسواں

تعلیم نسواں کی بحث کافی پرانی ہو چکی ہے شاید آپ کے لئے اس میں کوئی دلچسپی نہ ہوگی لیکن جس وقت میں اپنی سرحدی بہنوں کی طرف دیکھتی ہوں تو مجھے یہی کہنا پڑتا ہے کہ یہ بحث شاید پنجاب تک ہی محدود رہی - یا سرحد کی طرف آتے ہوئے یہ پہاڑوں اور آبشاروں سے ٹکرا کر پاش پاش ہوگئی - کس قدر افسوس کا مقام ہے جب زمانہ ترقی کی راہ پر رواں ہو اور یہاں وہی ڈھاک کے تین پات والا قصہ پیش نظر ہو۔

رفتار زمانہ اور ضرورت نے سرحد کے لوگوں کو مجبور کیا کہ وہ اپنے لڑکوں کو تعلیم دلوائیں ورنہ زیادہ عرصہ نہیں گزرا جب کہ یہاں کے مرد بھی جاہل تھے - لیکن جب زندگی کا دارومدار تعلیم پر منحصر ہو گیا تو مجبوراً لڑکوں کی تعلیم کے لئے دو ایک کالج کھولے گئے - اگرچہ اب بھی ان تعلیمی اداروں میں زیادہ تعداد پنجابی یا دیگر صوبوں کے افراد کی ہے -

تعلیم نسواں کے متعلق جو بے پرواہی یہاں کے لوگ برت رہے ہیں اس کے لئے جتنا بھی افسوس کیا جائے کم ہے - ابھی تک ایسے لوگوں کا شمار لا تعداد ہے جن کے خیال میں لڑکی کی دنیا گھر کی چار دیواری تک ہی محدود ہے - لڑکی کی حالت ایک قیدی پرندے سے کم نہیں شادی کے بعد اس کی دنیا میں ذرا سی وسعت ہو جاتی ہے کیونکہ اب وہ دو گھروں میں آ جا سکتی ہے لیکن کئی بدقسمت تو شادی کے بعد اور سخت زندان میں پھنس جاتی ہیں - ان کو ایسے انسانوں کے ساتھ زندگی گزارنے کے لئے باندھ دیا جاتا ہے جو انہیں اپنے قریبی رشتہ داروں سے ملنے کی اجازت بھی نہیں دیتے - اور اگر دیں بھی تو یہ موٹر یا تانگے پر پردہ باندھ کر جاتی ہیں - ابھی پچھلے ہی دنوں میں میں نے ایک لڑکی کا قصہ سنا ہے اس کے خاوند نے اپنے سگے بھائی کی شادی میں جانے کی اجازت بھی نہ دی - اسی قسم کے واقعات سن کر سوائے افسوس کے اور کیا ہو سکتا ہے -

ثریا پروین بی اے (پشاور)

اس پس ماندگی کی سب سے بڑی وجہ یہاں کے لوگوں کی اپنی کمزوری ہے - وہی قوم کے لیڈر جن کے ہاتھ میں ترقی کی باگ ڈور ہے اور جو تعلیم

اور حقوقِ نسواں پر لیکچر دیتے ہیں۔ اپنی عورتوں کو
اسکول کی شکل دکھانے کے بھی روادار نہیں، جو
اوروں پر تعلیم کا پرچار کرتے ہیں وہ اپنی عورتوں کو
جاہل اور قید میں رکھ کر خود اپنے الفاظ کی مخالفت
کرتے ہیں۔ سرحد ایک اسلامی صوبہ ہونے کے
باوجود بھی اسلام کے اصولوں پر نہیں چلتا۔ اسلام
جس کی ہر حالت میں تمام مذاہب پر فوقیت حاصل ہے
جس مذہب نے عورت کو برابر کے حقوق کا مستحق
بنایا ہے اسی اسلام کے ماننے والے عورتوں کے
حقوق پر ڈاکہ زنی کر کے نہ صرف اپنے پاک مذہب کی
مخالفت ہی کر رہے ہیں بلکہ ترقی کے راستہ میں روڑا
بھی اٹکا رہے ہیں۔

اس بے گانگی نے لڑکیوں پر بھی بہت بُرا
اثر ڈالا ہے۔ ان کے خیال میں تعلیم کی کچھ حقیقت ہی
نہیں وہ جس قدر تعلیم سے دُور ہیں اسی قدر انہیں تعلیم
سے نفرت بھی ہے۔ سو میں سے شاید ایک ہی ایسی
ہوگی جسے پڑھنے سے تھوڑی بہت رغبت ہوگی ورنہ
یہاں کی عورتوں کا بھی یہی خیال ہے کہ لڑکیوں کا کام
صبح شام کا کھانا تیار کرنا اور اپنا جہیز بنانا ہے شادی
کے بعد شوہر کی خدمت، اور بچوں کی پرورش۔ ان کے
خیال میں تعلیم یافتہ لڑکی نہ تو خانہ داری کے کام ڈھنگ
سے انجام دیتی ہے اور نہ اسے شوہر کی خدمت کا خیال
ہوتا ہے۔ اور یہ تو یہاں تک تعلیم کو بُرا جانتی ہیں کہ

اس سے اخلاق پر بُرا اثر پڑتا ہے تعلیم حاصل کر کے
لڑکیاں فیشن پرست، آوارہ اور بے پرواہ ہو جاتی
ہیں نہ جانے ان کے ذہن میں یہ بات کیوں سما گئی ہے
حالانکہ میں نے تو یہ دیکھا ہے کہ غیر تعلیم یافتہ لڑکیاں
آرائش و زیبائش میں تعلیم یافتہ لڑکیوں سے آگے
ہیں، خیر یہ تو اپنی اپنی تربیت پر منحصر ہے، اور پھر سب
لڑکیوں کے عادات بھی ایک سے نہیں ہوتے بعض
لڑکیاں اگر تعلیم حاصل کر کے اس کا برا استعمال کریں گی
تو اس میں ان کے اپنے اخلاق کا قصور ہوگا یا ان
کی تربیت کا۔ صرف تعلیم کے تاریک پہلو کو ذہن میں
کر کے لڑکیوں کو جاہل رکھنا ان کے اخلاق پر خواہ
مخواہ شک کرنا ہے، جب کہ یہاں کی لڑکیوں کو کبھی
اس بات کا موقع ہی نہیں ملا کہ وہ اپنے دماغ کو استعمال
میں لائیں اور تعلیم حاصل کر کے قوم کی ترقی میں ہاتھ
بٹائیں اور پھر تعلیم کو قصور وار ٹھہرانے کا کیا مطلب۔
میری سمجھ میں یہ ابتک نہیں آیا۔ اس قسم کی
باتوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ترقی کی امید رکھنا کچھ
بے معنی سا معلوم ہوتا ہے۔ زندگی کی گاڑی دونوں
پہیوں ہی سے چلتی ہے۔ اسے ایک ہی پہیہ سے
ہانکنے کی کوشش کرنا اور پھر کامیابی کی امید رکھنا سراسر
غلط ہے۔

یہاں کی عورتوں میں ایک اور کمزوری یہ ہے کہ
وہ سمجھنے کی مطلق کوشش نہیں کرتیں۔ ایک مرتبہ مجھے

اسی قسم کے ایک گھرانے میں جانے کا اتفاق ہوا جہاں تعلیم نسواں کو ایک قسم کا گناہ سمجھا جاتا ہے باتوں باتوں میں میری تعلیم کا ذکر چھڑ گیا۔ میری میزبان فرمانے لگیں، اتنی زیادہ تعلیم کو چاٹنا تھوڑی ہے، میرے خیال میں تو لڑکیوں کو پڑھنا ہی نہیں چاہیئے اور اگر وہ پڑھیں بھی تو بس اتنا ہو کہ معمولی پڑھ لکھ سکیں۔ بی۔ اے، ایم، اے کروا کے کوئی نوکری تو نہیں کروانی ہے۔

میں نے کہا: "بیشک ہر ایک لڑکی نوکری کرنے کیلئے نہیں پڑھتی۔ اور نہ ہی ہر لڑکی کو نوکری کرنے کا موقع ملتا ہے کیونکہ شادی کے بعد عموماً وہ گھریلو دھندوں میں مصروف ہو جاتی ہیں لیکن بعض اوقات مجبوری انسان کو بھیک بھی منگواتی ہے مشکل میں کوئی بھی ساتھی نہیں رہتا۔ ایسی حالت میں اگر آن پڑے تو نوکری کرنا بھی گناہ نہیں" یہ سن کر وہ تو الٹا مجھ ہی کو برا بھلا کہنے لگ گئیں، میں نے تو چپ رہنا ہی بہتر سمجھا۔ انہیں کون سمجھائے کہ تعلیم کا مقصد صرف نوکری کرنا ہی نہیں ہوتا۔ کیونکہ جہاں کہیں تعلیم کا ذکر چھڑا انہوں نے "نوکری نہیں کرنی" کی رٹ لگانی شروع کر دی یا وہ یہ کہیں گی، تعلیم سے اپنی لڑکیوں کو عیسائی تو نہیں بنانا ہے۔ ان کا یہ بھی خیال ہے کہ تعلیم حاصل کر کے اور خاص کر انگریزی تعلیم لڑکیاں اپنے مذہب کی طرف سے بیگانگی برتنے لگتی ہیں۔ ان کا یہ خیال مغرب کی اندھا دھند تقلید کرنے والیوں کو دیکھ کر کسی حد تک صحیح بھی ہے، لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ تمام الزام تعلیم کے سر پہ ہی عائد ہو جائے۔ یہاں میں تربیت کو زیادہ قصوروار ٹھہراؤں گی مگر میں نے تو اندازہ لگایا ہے کہ غیر تعلیم یافتہ رہ کر بھی ان میں مذہب کی کوئی خاص پابندی نہیں پائی جاتی۔

مجھے اپنے صوبہ کی لڑکیوں کے ساتھ بہت ہمدردی ہے۔ کیوں نہ ہوگی جب کہ انہیں کے ساتھ تو زندگی گزر رہی ہے۔ لیکن ان کی حالت دیکھ کر سوائے رحم کھانے کے اور کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔ بیچاریوں کو خدا نے دماغ دیا ہے۔ دل دیا ہے۔ وہ اپنے دماغ کو استعمال میں لائیں تو نہ جانے جلد ہی اپنے صوبہ کی کایا پلٹ کر رکھ دیں۔ لیکن انہیں موقع ملے تو۔ اس لڑکی کی حالت پر کسے ترس نہ آئے گا جو پڑھنے کے لئے تڑپے اور اس کی خواہش پوری ہونے کی کوئی امید نہ ہو۔ میری ایک واقف ہیں جو میری اور کئی واقف کاروں میں سے ایک ہی ایسی ہیں جنہیں پڑھنے سے بہت رغبت ہے۔ اور یہ بھی قدرتی بات ہے چونکہ تعلیمی ماحول ہی میں پلی ہیں، اور ہمیں اسکول کالج جاتے بھی دیکھتی رہی ہیں۔ لیکن ان کو اسکول بھیجنا تو در کنار، کوئی گھر ہی میں دو چار حروف نہیں پڑھا دیتا۔ ایک دن وہ والدہ سے کہنے لگیں کہ آپ مجھے اردو پڑھا دیا کریں۔ میں نے جب یہ سنا تو

میں نے کہا میں خود پڑھا دیا کروں گی۔ دو چار روز یہ ہمارے ہاں آتی رہیں، اس قلیل عرصہ میں توقع سے کہیں زیادہ پڑھ گئیں، میرا خیال تھا کہ چند روز بعد انگریزی کا قاعدہ بھی شروع کروا دوں گی لیکن چار روز بعد انھوں نے آنا بھی بند کر دیا، بعد میں مجھے معلوم ہوا، ان کی دادی بہت خفا ہو رہی تھیں کہ پڑھنے کیلئے لڑکی دوسرے گھر کیوں جاتی ہے، مجبوراً لڑکی کو چھوڑنا ہی پڑا۔ اس میں قصوروار دادی بھی ہے، لیکن اس سے زیادہ لڑکی کے باپ کا قصور ہے۔ اولاد پر زیادہ حق والدین ہی کا ہوتا ہے، بڑے بوڑھے تو تقریباً سب کے ہی تعلیم نسواں کے خلاف ہوتے ہیں۔

دیگر صوبوں کے ساتھ آمد و رفت سے جو تھوڑی بہت بیداری پیدا ہو رہی ہے وہ بالکل برائے نام اور چند بڑے شہروں تک ہی محدود ہے شہروں میں لوگوں نے ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے اپنی بیٹیوں کو اسکول بھیجنا شروع کر دیا ہے، ان لوگوں میں بھی زیادہ تعداد ان کی ہے جو غیر صوبوں سے یہاں آ کر آباد ہو گئے ہیں۔ خاص سرحدی ابھی تک بھی انہیں دقیانوسی خیالات کے مالک ہیں لیکن چھوٹے شہروں، قصبوں اور گاؤں میں لڑکیوں کی تعلیم کا کوئی خاطر خواہ انتظام نہیں۔ پرائمری اور مڈل کے بعد لڑکیوں کا گھر سے باہر قدم رکھنا عیب میں شمار ہے۔ پھر ایسی حالت میں اگر اسکول قایم بھی ہو جائیں تو وہ ناکامی ہی کا منہ دیکھتے ہیں۔ ہائی اسکول تو گنتی ہی کے ہیں۔ تمام صوبے میں شاید چار زنانہ ہائی اسکول ہونگے کالج کی تعلیم کا تو کچھ پوچھنا ہی نہیں۔ صرف پشاور ہی میں بہت کوششوں کے بعد ایک ڈگری کالج کھولا گیا ہے۔ یہ بھی کانونٹ والوں کی ہمت ہے ورنہ ہندوستانی اور پھر خاص طور پر سرحدی اتنی جراءت کہاں سے لائیں کہ اپنی عورتوں کو تاریکی سے نکلنے کا کوئی موقع دے سکیں۔ نہ جانے یہ جہالت کب دور ہوگی۔ میں اسے جہالت ہی کہوں گی۔ کیونکہ مرد خود تعلیم حاصل کر کے بھی عورتوں کی تعلیمی ضرورت کو محسوس نہیں کرتے تو پھر قومی ترقی کا خواب کس طرح پورا ہوگا؟

خواہان نوکری نہ رہیں طالبان علم
قایم ہوئی ہے رائے یہ اہل شعور کی
کالج میں دھوم مچ رہی ہی پاس پاس کی
عہدوں سے آ رہی ہے صدا دور دور کی

گویم مشکل و نہ گویم مشکل

ترے دریا میں طوفاں کیوں نہیں ہے
خودی تیری مسلماں کیوں نہیں ہے

بے پردگی کے جس سیلاب میں زمانہ آج کل لہرا رہا ہے یہ لائق تحسین ہے یا نفریں یہ بتانے کی ضرورت نہیں، ہر مسلمان اسے اچھی طرح جان سکتا ہے، بے پردہ عورتیں یہ سوچ کر مگن ہیں کہ ہمیں مردوں کے برابر حقوق حاصل ہو گئے۔ کاش کہ ان کی عقلوں سے پردہ اٹھتا۔ تو وہ سمجھتیں مردوں نے ہمیں بے پردہ کرکے ہمارے اوپر کرم گستری نہیں کی بلکہ اس میں بھی اپنے فائدہ ہی کو مدنظر رکھا، کاش وہ سوچتیں کہ اپنے شوہروں کے چند دوستوں کے سامنے آنے سے ان کے حقوق انہیں حاصل نہیں ہو گئے، بلکہ ہمارے مردوں نے ہمیں اس لئے اپنے دوستوں کے سامنے کرنا گوارا کیا تاکہ ان کی بیویوں کے حسن اخلاق سے متاثر ہو سکیں

آپ کہہ سکتے ہیں کہ مرد تو ہزاروں عورتیں دیکھتا رہتا ہے۔ دن رات میں ایسی کتنی ہی عورتیں اس کی نظروں سے گذر جاتی ہیں ہاں یہ ٹھیک ہے لیکن وہ صرف گذر جاتی اور اپنے حسن آرائش کا ایک دھندلا سا نقشہ دیکھنے والے کی آنکھوں میں بسا کر تھوڑی دیر میں محو کر سکتی ہیں یہ نظارہ دیرپا نہیں ہوتا برعکس اس کے کہ ان کی منہ بولی بہنیں اور بھاوجیں ان کی دل بہلائی کا ہر طرح کا سامان مہیا کریں ان کا سامنے بیٹھ کر صرف اپنے طرز کلام سے دلوں کو موہ لینا ہی بہت بڑی تفریح ہے جو مردوں کو آج کل اپنی بیوی کے ساتھ ساتھ بھی نامحرم عورتوں سے حاصل ہو جاتی ہے اور آج کل تو فلمی گانوں کا خدا بھلا کرے اپنے منہ بولے بھائیوں سے ان کی دل بھلائی کے لئے ان طرز و لب کی داد بھی لیجاتی سکتی ہے۔ یہ رہی ہماری شان نسوانیت اور یہ رہی ہمارے بھائیوں کی شان مسلمانیت کہ اپنی بیوی اور بہنوں کو دوستوں کے سامنے گانے پر بھی مجبور کریں اور خود بھی اون کے روح پرور نغموں پر سر دھنیں۔ شرعی پردے کی آڑ لے کر کھڑے ہونے والے کیا یہ بتا سکتے ہیں کہ شرعی پردہ اسی کا نام ہے؟ اپنے حسن کی بے پردہ لباس سے نمائش کرنا اور اپنے آپ کو دوسروں کی نگاہوں کا مرکز بنانا

صغرا عبد السبحان

شاید اسی کو کہتے ہیں اسلامی پردہ ۔ کاش کوئی بہن یا بھائی یہ بتانے کی زحمت گوارا فرمائیں کہ اسلام میں پردے کے متعلق کیا احکام ہیں مشکل یہ ہے کہ بتائے کون؟ نیا زمانہ، نئے فیشن، بے پردگی سب کے دل و دماغ پر چھائی ہوئی، عورتوں کی مردوں سے دوستی کے فوائد پیش نظر۔ کس کو فرصت ہے جو شرعی پردے کا مطالعہ کرے اور اس کو سمجھے بس اتنا تو اچھی طرح معلوم ہے کہ اسلام میں عورتوں کو قید کر کے رکھنا جائز نہیں مگر اس کے معنی یہ کیسے ہوئے کہ اپنے مخصوص دوستوں کیلئے بیوی اور بہنوں کے حسن کی نمائش شرعی پردہ ہے۔ اگر آپ کے دلوں میں یہ جذبہ رحیمانہ بیدار ہو رہا ہے کہ عورتوں کی حق تلفی نہ کریں اور ان کو ہر طرح کی جائز آزادی دیں تو جزاک اللہ، اٹھئے دیر نہ کیجئے سب سے پہلے تو ان کے لئے ایسے لباس رائج کیجئے کہ نظروں کو وہ دعوت نمائش نہ دیں اس کے بعد انہیں باہر نکالئے، اپنے ساتھ دنیا دکھائیے اور انہیں اس قابل بنایئے کہ آپ کے دوستوں کی دلنوازی کے بجائے وہ اپنا کام خود انجام دے سکیں۔ خرید و فروخت، سفر و حضر میں آپ کی محتاج نہ ہوں۔ شادی بیاہ میں ان کا گلا نہ گھونٹا جائے۔ آپ اپنے اوقات فرصت میں بجائے اس کے کہ اپنے دوستوں کی بیویوں اور بہنوں کے دیدار سے مشرف ہوں اپنی بیوی اور بچوں کی تفریح کا خیال کیجئے۔ شرعی پردے کے ساتھ انہیں باہر لیجائیں ان کے ساتھ خرید و فروخت یعنی SHOPING کیجئے۔ اگر میاں بیوی اپنے گھر کو گھر سمجھ کر رہیں تو یقیناً انہیں اپنے محبت کدے سے اتنی فرصت ہی نہ ملے کہ اپنا وقت دوسری جگہ گذارنے کا خیال کر سکیں۔ لیکن چاہے کتنی ہی محبت اور آرزو کی شادی کیوں نہ ہو، یہ ناممکن ہے کہ ساری عمر میاں مجنوں اور بیوی لیلیٰ بنی رہیں مگر انسان کے پاؤں میں انسانیت کی بیڑی ہے یعنی اس کے فرائض۔ ہر انسان اگر اپنے فرائض پر عمل کرے تو رونا ہی کس بات کا؟ بہر حال سوچئے اور پھر سوچئے۔ اور خدا کے لئے صرف سوچئے ہی نہیں کہ آج کل کی بے پردگی کسی طرح بھی جائز نہیں بلکہ اس کی انسدادی تدابیر بھی اختیار کیجئے۔ آپ مسلمان ہیں اپنی شان حمیت اور جذبۂ خودی کو بیدار کیوں نہیں کرتے؟

پردہ اٹھ جانے سے اخلاقی ترقی قوم کی
جو سمجھتے ہیں یقیناً عقل سے فارغ ہیں وہ
سُن چکا ہوں میں کہ کچھ بوڑھے بھی ہیں اس میں شریک
یہ اگر سچ ہے تو بیشک نیز نابالغ ہیں وہ — اکبر

شرمیلا نوجوان

نوجوان جارج کافی دولتمند تھا اور اپنی زندگی نہایت آرام اور چین سے بسر کر رہا تھا وہ تنہا تھا کیونکہ اس کے والدین انتقال کر گئے تھے، چونکہ حد سے زیادہ شرمیلا واقع ہوا تھا اسلئے اس کا کوئی دوست نہ تھا اور وہ سوسائٹی اور اس کے رسم و رواج سے بھی بالکل ناواقف۔

جہاں جارج رہتا تھا اوس کے باپ کا ایک دوست بھی تھا جو اپنی تین نوجوان لڑکیوں کے ساتھ زندگی کے شیریں اوقات بسر کر رہا تھا۔

ایک دن اس کے والد کے دوست نے اسے کھانے پر مدعو کیا وہ سوچ میں پڑ گیا کہ اس کو کیا کرنا چاہئے، کیا باتیں کرنی پڑینگی اور کیونکر میزبان اور اوس کی لڑکیوں سے ملنا ہوگا

مقررہ دن پر وہ راستہ تمام سوچتا ہوا پہنچا یہاں میزبان اور اس کی لڑکیاں پذیرائی کے لئے کھڑی ہوئی تھیں وہ انہیں دیکھ کر اس قدر سٹ پٹایا کہ جو کچھ سوچتا آیا تھا سب بھول بھال گیا اور جلدی سے ہاتھ ملانے کے لئے آگے بڑھا اور گھبراہٹ میں میزبان کے پاؤں پر اس قدر زور سے اپنا پیر رکھدیا کہ وہ بے اختیار چیخ اٹھا نوجوان شرم کے مارے پانی پانی ہوگیا اور معافی مانگنی بھی بھول گیا، جوں توں کر کے دیوان خانے میں پہنچے جب طبیعت سنبھلی تو اس نے کمرہ میں ادہر اُدھر نظر دوڑائی، ایک تابدان میں کتابیں رکھی ہوئی تھیں، اس نے کرسی پر چڑھ کر کتاب نکالنی چاہی کرسی پھسل گئی اور یہ میز پر آرہا اور تمام روشنائی کمرے میں فرش پر پھیل گئی اور غریب نوجوان گھبرا کر جیب سے دستی نکال کر فرش کے دھبوں کو پونچھنے لگا اور دستی جیب میں رکھ لی۔ جب کھانے کیلئے سب میز پر جمع ہوئے تو اس کے ہاتھ پیر کانپ رہے تھے میزبانوں نے اس کی وحشت دُور کرنے کے لئے باتوں کا سلسلہ چھیڑ دیا ایک لڑکی نے اس کی ٹائی کی تعریف کی شکریہ ادا کرنے کیلئے اپنی گردن خم کی تھی کہ سامنے میز پر رکھی ہوئی شوربے کی رکابی الٹ کر اس کے گود میں آپڑی او گرم گرم شوربہ سے یہ تڑپ اٹھا، لڑکیاں ہنسنے لگیں یہ اور بھی محجوب اور شرمندہ ہو کر حواس باختہ ہوگیا۔ جب اس سے نجات ملی تو کھانا شروع ہوا۔ دوران طعام میں ایک لڑکی نے [illegible] میں سے [illegible] چیز

مس ریٹا کرشنا جی

مانگی اس وقت اس کے کانٹے پر گرم گرم کباب تھے اس نے جلدی سے منہ میں ڈال لیا جس سے منہ جل اوٹھا اور وہ بیتاب ہو کر فنگر لول کے پانی سے اپنا منہ بھر لیا پھر بھی سوزش کم نہ ہوئی تو اس نے ہاتھ کی انگلیاں منہ پر رکھ کر فوفو کرنے لگا جس سے منہ کا پانی انگلیوں سے آبشار بن کر چاروں طرف آبپاشی کرنے لگا۔ میزبان نے نوکر سے ایک ہلکی شراب طلب کی کہ اس کے پینے سے شاید منہ کی سوزش کم ہو جائے مگر نوکر نے غلطی سے تیز شراب لا دی، اس کے پیتے ہی منہ کی سوزش اور بڑھ گئی نوجوان بے اختیار ہو کر جیب سے دستی نکال کر منہ میں ٹھونسنے لگا تمام سیاہی سے منہ کالا ہو گیا۔ اب تو لڑکیوں کے ساتھ باپ بھی قہقہہ مار کر ہنسنے لگا یہ اتنا شرمندہ ہوا کہ ایک سرکش گھوڑے کی طرح میز سے بھاگ کر سیدھا اپنے گھر پہنچ کر ہی دم لیا۔

(۵)

آج اور کل

وہ کل کے غم و عیش پہ کچھ حق نہیں رکھتا
جو آج خود افروز و جگر سوز نہیں ہے
وہ قوم نہیں لائق ہنگامہ فردا
جس قوم کی تقدیر میں امروز نہیں ہے

علامہ اقبال

عورت بدترین روپ میں

۱۔ عورت کو اس کی کم فہمی کی وجہ سے معاف کر دینا چاہئیے۔ (سینیکا)

۲۔ عورت شربت شیریں ہے جس میں ہلاہل ملا ہوا ہے۔ (نامعلوم)

۳۔ عورت مکر کی بیٹی اور امن و سلامتی کی دشمن ہے (لیو جنار مشقی)

۴۔ عورت شیطان کا آلہ ہے (قدلیس برنا)

۵۔ عورت کائنات کا ایک معمہ ہے وہ اپنے جذبات کے سامنے دنیا کو دنیا کی برگزیدہ ترین ہستیوں کو ہیچ سمجھتی ہے۔ محبت میں وہ اس طرح محو ہو جاتی ہے کہ وہ مردہ اور زندہ چیزوں میں کوئی امتیاز نہ کرسکے۔ (ماخوذ)

(۶) عورت میں خود ستائی کا مادہ بہت بڑھا ہوا ہوتا ہے۔ (امیڈم ڈی سٹیل)

(۷) عورت کی زبان گو تین انچ کی ہوتی ہے مگر وہ اس سے چھ فٹ لمبے مرد کو ہلاک کر سکتی ہے

(۸) عورت وہ ریت ہے جسے پیاسا آدمی دور سے پانی سمجھتا ہے۔

(۹) عورتیں جوں جوں عمر رسیدہ ہوتی جاتی ہیں ان میں بہانہ سازی بڑھتی جاتی ہے۔ (برزمرہ)

شادی

بیگم نواب لطیف الدین خاں بہادر

(۱)

فریدہ اپنے خوبصورت باغ میں ٹہلتے ٹہلتے اُس حسین حوض کے پاس رُک گئی جو "فرحت منزل" کے پائین باغ کی خوبصورتی میں اضافہ کر رہا تھا اس کی آنکھوں میں لڑکپن کے واقعات پھرنے لگے وہ کنول کے پھولوں کو دیکھنے لگی کہ کس طرح فریدہ اور اس کا چچازاد بھائی نسیم نوزائیدہ غنچوں کو چُنتے اور باہمی کھیلا کرتے تھے۔

نسیم مسٹر عزیز بمبئی کے ایک بڑے تاجر کا بیٹا اور بی۔ اے کا طالب العلم تھا اور تعطیلات میں آکر فریدہ سے مل جاتا تھا۔

(۲)

فریدہ اپنی ہمجولی مارگریٹ سے خوش گپیاں کر رہی تھی جو "فرحت منزل" کے بازو والے بنگلہ میں رہا کرتی تھی فریدہ کی چھوٹی بہن کی آواز نے ان کی باتوں میں خلل ڈالدیا۔ فریدہ نے "بالکونی" سے نیچے کی طرف دیکھا تو زینب اپنے ہاتھ میں ایک خط لئے چلا رہی تھی۔ فریدہ کے خیالات میں ایک ہیجان سا پیدا ہوا۔ اس کا دل بلیوں اچھلنے لگا لکھا تھا کہ نسیم کی صحت ٹھیک نہیں ہے وہ تبدیل آب وہوا کی غرض سے آنیوالا ہے۔ وہ خط ختم کر چکی تھی کہ خادمہ نے آواز دی "بی بی سرکار نے یاد کیا ہے"

فریدہ اپنے والد کے کمرے میں داخل ہوئی، والد نے پوچھا تم نے خط پڑھ لیا "جی ہاں"۔ تم اپنے بازو والے کمرہ کی صفائی کروا دو۔ آخر وہ دن بھی آگیا جس کے دیکھنے کو فریدہ کی آنکھیں ترس گئی تھیں۔ نہ صرف فریدہ ہی نسیم کو دل نذر کر چکی تھی بلکہ نسیم کے دل میں بھی فریدہ کی محبت نقش تھی۔ ہر روز فریدہ اور نسیم باغ میں چہلقدمی کیا کرتے اور محبت بھری باتوں سے جی بہلاتے۔ ایک روز نسیم نے کہا "فریدہ میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔

نسیم نے اپنی درخواست پیش کردی، قدرت کی ستم ظریفی کو کیا کہیئے جواب نفی میں ملا اپنے ایک دوست کے لڑکے اصغر سے فریدہ کی شادی طے ہو چکی ہے"۔ نسیم پر بجلی سی گری وہ سیدھے اپنے کمرے میں گیا اور بمبئی جانے کی تیاری کرنے لگا

فریدہ بھی فوری کمرے میں داخل ہوئی اور نسیم سے پوچھا۔ نسیم نے حسرت بھری آنکھوں سے فریدہ کو دیکھتے ہوئے کہا "فریدہ اب تم میری نہیں ہو سکتیں اور نہ میں تم کو بھول سکتا ہوں۔ اب میں تمہاری

یاد دل میں لئے ہمیشہ کیلئے جارہا ہوں ...
وہ کمرے سے باہر چلا گیا۔ فریدہ نے ہزار منت سماجت کی مگر سب بیسود۔

آج فریدہ کے بیاہ کا دن ہے مہمانوں کی چہل پہل ہے۔ شادیانے بج رہے ہیں، بچے زرق برق لباس پہنے اِدہر اُدہر دوڑے پھر رہے ہیں فریدہ کی ہمجولیوں کے قہقہے پر قہقہے بلند ہو رہے ہیں غرض جدہر دیکھئے خوشی ہی خوشی نظر آرہی ہے مگر فریدہ کے اضطراب کی حالت ناقابل بیان ہے کسی پہلو چین نہیں۔ وہ بار بار اپنی سہیلیوں کو چھوڑ کر تنہائی میں چلی جاتی ہے مگر گردش فلک بھی کسے چین لینے دیتی ہے آخر وہ وقت آگیا جب دلہن میکہ سے اپنی سسرال کو روانہ ہوتی ہے۔ فریدہ موٹر میں سوار ہونے سے پہلے اپنے کمرہ میں گئی۔ اور نسیم کی تصویر کے سامنے سرنیاز خم کیا اور تکیہ کے نیچے سے کوئی پڑیا نکال کر کھالی۔

دلہا کمرے میں داخل ہوا۔ سب نے الوداع کہا برات جارہی ہے۔ باجے بج رہے ہیں راستوں پر لوگ جوق درجوق برات دیکھنے کو دوڑ رہے ہیں، دلہا میاں خوش خوش بیٹھے لوگوں کو سلام کر رہے ہیں ... کسی کو یہ خبر نہیں کہ دلہن کس عالم میں ہے۔

راستہ میں براتیوں نے دیکھا کہ سڑک کے کنارے ایک نعش پڑی ہوئی ہے پولیس پنچنامہ مرتب کر رہی ہے لوگوں کا ہجوم ہے۔ مختلف خیال آرائیاں ہو رہی ہیں، کوئی کہتا ہے "ایک دیوانے کی نعش ہے جو اِدہر اُدہر شہر میں پھرا کرتا تھا۔ لیکن بعض لوگوں نے کہا کہ "نہیں یہ نسیم ہے دماغی خلل سے شہر میں خستہ حال پھر رہا تھا۔

آہ! کاش والدین باہمی رضامندی کی شادی کو پسند کرتے۔"

محمود یہ مشین پریس چارمینار میں چھپ کر دفتر شہاب بیرون پڑحیدرآباد سے شائع ہوا

ماہنامہ

شہاب

شہاب

جلد ۱۲ آبان ۱۳۵۳ف م ستمبر ۱۹۴۴ء نمبر (۱۲)

(مرتبہ)
محمد عبدالرزاق بسمل

عوام سے سالانہ چندہ (للعہ) گورنمنٹ سے (عہ ۵)

غزل

جناب جگرؔ مرادآبادی

کل ہند اردو کانگریس حیدرآباد میں جب کہ شرکت کیلئے بہت سارے

حضرات تشریف لائے تھے ہم نے مہمانانِ محترم کی خدمت میں اپنا آٹوگراف البم

بھجوایا تھا جس میں دو شعر لکھنے کی شرط تھی۔ لیکن جناب جگرؔ نے اپنی عنایت سے

پوری غزل البم میں تحریر فرمائی ہے جس کو آج ہم شائع کر رہے ہیں۔

(مدیر)

کہاں کے غنچہ وگل۔ کیا بہار توبہ شکن ‌‌‌ کھلے ہوئے ہیں دلوں کی جراحتوں کے چمن

خلوص عشق، نہ جوش عمل، نہ دردِ وطن ‌‌‌ یہ زندگی ہے الٰہی کہ زندگی کا کفن

غضب ہے قہر ہے انساں کی یہ بوالعجبی ‌‌‌ خود اپنا دوست بہت کم۔ زیادہ تر دشمن

جہاں حُسن کو بھی جس نے کر دیا بیدار ‌‌‌ خوشا وہ سینۂ اہلِ فراق کی دھڑکن

خرد حقیقت چالاک و چست سست خرام

جنوں صداقت بیباک و مصلحت دشمن

"سب رس"

جناب خواجہ محمد عباد اللہ صاحب اختر۔ بی۔ اے (امرت سری)

ماہنامہ شہاب بابتہ جولائی ۱۹۴۴ء میں "نقد و نظر" کے تحت حضرت "عطارد" نے جناب "جگر" مراد آبادی کی ایک غزل پر تنقید فرمائی جو رسالہ "سب رس" بابتہ ماہ مئی ۱۹۴۴ء میں زیر عنوان" وار دات جگر" شایع ہوئی۔ ماہنامہ شہاب کی کسی گذشتہ اشاعت میں ہم نے وعدہ کیا تھا کہ حضرت عطارد نثر میں جو کچھ ارشاد فرمائیں گے وہ ہم نظم میں واضح کردیں گے، چنانچہ ہم نے ایک دفعہ ایسا کیا حضرت عطارد نے تنقید زیر نظر میں پیش دستی کی اور اصلاح بھی فرمائی۔

حضرت عطارد تنقید زیر نظر کی تائید میں یہ اصول واضح فرماتے ہیں کہ "نثر ہو یا نظم ادب کی پہلی شرط یہ ہے کہ معیار علم صرف و نحو و معانی و بیان اور محاورہ زبان پر پوری اترے اور یہ کہ روزمرہ اور لغت کے خلاف نہ ہو، دوسری شرط یہ ہے کہ ادائی مطالب کے لئے مناسب اور موزوں الفاظ ہوں جو شاعر کے مافی الضمیر کو من و عن واضح کر سکیں۔ مضمون بلند، تخیل ارفع، بندش چست، ترکیب درست ہونی چاہیئے۔ اس کے بعد عامیانہ مذاق اور مذاق سلیم پر بحث کیگئی ہے۔

حضرت عطارد کی یہ رائے ہے کہ اگر اصول موضوعہ یا متعلقہ متقدین کو پیش نظر نہ رکھا جائے اور نثر و نظم اس معیار پر صحیح ثابت نہ ہو تو وہ بےمعنی ہوگی، کیونکہ کلام کلام کی تعریف میں نہیں آتا، اگر بے معنی ہو، ہم کہتے ہیں کہ یہی امتیازی خوبی تو جدید اردو شاعری کی ہے جس سے متقدمین کا کلام بالکل معرا ہے، ترقی یافتہ اردو علم ادب ہر ایک قید و بند سے بالکل آزاد ہے، اور صحیح معنی یا بے معنی میں آزاد ہے اس کی خوبی اور اس کی قدر و قیمت کا اندازہ اس وقت ہو سکتا ہے جب کوئی شخص حضرت جگر اور اب ہماری طرح کوشش کرے کہ بے معنی کلام موزوں کرے، حضرت جگر کا کلام آپ کے سامنے ہے اور آپ خود تسلیم کر چکے ہیں کہ بے معنی ہے، انتہائی ناانصافی ہوگی اگر آپ ہمارے کلام کو بامعنی قرار دیں جو ارادۃً حضرت جگر کے تتبع میں اسی کی زمین شعر میں لکھا گیا ہے۔ ہم پختہ عہد کر چکے ہیں کہ بھولے سے بھی بامعنی نظم نہیں لکھیں گے، بامعنی کلام تو ہر کس و ناکس کا ہوتا ہے بے معنی کلام حضرت جگر کا یا اب ہمارا حصہ ہے۔

ترقی یافتہ بلکہ جدید اردو شاعری کا تقاضا ہے کہ وہ تمام محاورات جو متقدمین نے ہمارے دماغ میں

ٹھونس رکھے تھے، ایک ایک کر کے زبان سے خارج کئے جائیں۔ اس کی واضح مثال "واردات جگر" ہے جس کے تحت غزل زیر نظر لکھی گئی۔ آپ نے آج تک "واردات قلبی" اکثر سنا ہوگا، آئندہ آپ "واردات جگر" ہی سنا کریں گے۔ لیکن "جگر" سے مراد وہ ممتاز شخصیت ہے جو بحیثیت شاعر مراد آبادی مشہور ہے، آپ کہیں گے یہ ترکیب بھی بے معنی ہے، یہی وہ بات ہے جو ہم اپنے دعویٰ کے ثبوت میں آپ کے منھ سے کہلوانا چاہتے ہیں

ترقی یافتہ اردو کی دوسری واضح مثال "سب رس" ہے، آپ نے "نورس" جو موسیقی کی خاص اصطلاح ہے سنی ہوگی، جسے مولانا ظہوری نے شہرت دوام دی ارتقاء کا تقاضا تھا کہ "نو" پر اکتفا نہ ہو جو جمع قلت ہے، اگر نو سے زیادہ دس بیس "رس" ایجاد یا دریافت ہوتے تو جہاں تک اعداد کا تعلق ہے، "رس" محدود ہی رہتا۔ دکنی تخیل نے اسے معراج ترقی پر پہنچا دیا اور "سب رس" اختراع کیا، "نو" عدد ہے، ایک کم دس بر وزن "رس" اور ایک جمع آٹھ کے برابر، اس کے ایک اور معنی "نیا" بھی ہیں۔ "از شاخ کہنہ میوہ نورس غنیمت است"۔ "سب رس" میں لفظ "سب" کا مفہوم "بدزبانی، دشنام، گالی گلوج بھی ہے اور یہ ایسا لذیذ "رس" ہے کہ خواجہ حافظ جیسے ثقہ مزے مزے لے لے کر فرماتے ہیں۔

"بدم گفتی و خرسندم، عفاک اللہ نکو گفتی　　جواب تلخ می زیبد لب لعل شکر خارا"

اور شاید ہی کوئی اردو فارسی کا بدمزہ شاعر ہوگا جو اس "رس" کی تعریف میں رطب اللسان نہ ہو، عوام الناس کیلئے کھلے بندوں بازاروں اور محفلوں اور اکثر گھروں میں اس کا استعمال کرتے ہیں، دوسرا مفہوم "سب" کا تمام، کافۃ الناس ہر ایک ہے، یعنی یہ ایسا "رس" ہے جو ہر ایک مرد ہو یا عورت پسند کرتا ہے یا کرے گا، یا ایسا رس ہے جس میں ہر ایک رس کڑوا ہو یا میٹھا شامل ہے اور اس کی ایجاد کی غرض و غایت یہی ہے کہ مذاق میں اختلاف کثرت سے ہے یہ رس ہر ایک مذاق تک رسا ہے، یہ صرف دعویٰ ہی دعویٰ نہیں، "واردات جگر" اور "سب رس" میں جو مناسبت صوری اور معنوی ہے اس کے ثبوت میں پیش کی جاتی ہے :-

حضرت جگر ارشاد فرماتے ہیں :-

"شعر و نغمہ، رنگ و نکہت جام و صہبا ہوگیا　　زندگی سے حسن نکلا حسن رسوا ہوگیا"

حضرت عطار دبجا ارشاد فرماتے ہیں کہ یہ مطلع ہے اور دو مختلف المفہوم کا جامع ہے۔ جو مطلع میں مذموم امر ہے، ہم بھی صاد کرتے ہیں اس سے بڑھ کر جدید اردو شاعری کی خوبی نہیں ہوسکتی جسے نقاد نے نادانستہ تسلیم

کرلیا ہے، جس کا مفہوم نظم میں یوں ادا ہوسکتا ہے۔

حرف مطلب شعر میں اب لفظ عنقا ہوگیا بطن شاعر میں ہے یا معنی معما ہوگیا

حضرت جگر کا مطلع چونکہ سب رس کا حامل ہے اس لئے آپ کی ضیافت طبع دو تین رس پیش کیجاتی ہے جو اس کے لفظوں کا نچوڑ ہیں۔ آپ جانتے ہی ہیں کہ جب تک کسی شئی کو نچوڑا نہ جائے رس ہاتھ نہیں آتا۔

(۱) مطلع کے مصرع اولی میں ردیف " ہوگیا " کا مطلب ہے گیا گزرا، رفت گذشت، یعنی شعر و نغمہ وغیرہ میں اب کوئی " رس " نہیں رہا، اور یہی حسن زندگی تھا جب یہ نکلا یعنی جاتا رہا تو اب رسوائی اور بدمزگی کے سوا رہ کیا گیا ہے۔ آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ الفاظ اس مفہوم کے متحمل نہیں ہوسکتے۔ نہ ہوں بطن شاعر میں تو ہے

(۲) دوسرا رس یہ ہے کہ اگر واؤ عاطفہ کو اڑا دیا جائے جو بظاہر کتابت کی غلطی ہے تو شعر نغمہ میں یا نغمہ شعر میں بدل گیا اور علی ہذالقیاس سب کی کایا پلٹ ہوگئی یا یوں کہئے کہ ان میں کچھ امتیاز نہ رہا جس کی وجہ یہ ہے کہ بطن زندگی سے حسن پیدا تو ہوا جو شعر و نغمہ وغیرہ میں مشاہدہ ہوتا ہے لیکن اس طوفان بے تمیزی میں رسوا ہو رہا ہے۔ چنانچہ اس مفہوم کو ہم نے اس طرح ادا کیا ہے۔

انقلاب دہر سے دنیا میں کیا کیا ہوگیا شعر نغمہ، رنگ نکہت، جام صہبا ہوگیا۔

آپ ضرور کہیں گے کہ ایسا انقلاب کہاں اور کب ہوا، شعر کا نغمہ میں مبدل ہونا تو ہم ہر ایک بزم ادب میں دکھا سکتے ہیں اور سچ پوچھو تو ہمارا تعلق انہی دو کے ساتھ ہے، باقی امور حضرت جگر بتا سکتے ہیں۔

(۳) آپ مطلع کے ہر ایک لفظ پر غور کریں، نغمہ، شعر، رنگ، نکہت، جام، صہبا، زندگی، حسن اور سب سے بڑھ کر رسوائی، ہر ایک میں رس کوٹ کوٹ کر بھر گیا ہے، اگر ہم ہر ایک رس علیحدہ علیحدہ پیش کریں تو ایک طویل نظم تیار ہوجائے گی اس لئے دو چار رس سردست قبول فرمائیے۔ ہم " صہبا " کے " رسیا " تو نہیں لیکن نقل عیش بہ از عیش

فتوئ واعظ یہ ہے کہ بادۂ عشرت حرام نشہ تھا جو اس کا سر میں وقف صہبا ہوگیا

رسوائی پسندیدہ امر نہیں، لیکن بقول حضرت جگر یہ اب عام ہوچکی ہے۔

حسن بے پردہ ہوا اور سخت رسوا ہوگیا عشق آوارہ ہوا اور خوب چرچا ہوگیا

ثبوت ملاحظہ ہو۔

مصر کے بازار میں جو حسن رسوا ہوگیا باعث بدنامی عشق زلیخا ہوگیا

حضرت جگر فرماتے ہیں کہ :۔

"اور بھی آج اور بھی یہ زخم گہرا ہو گیا بس کر اے چشم پشیماں کام اپنا ہو گیا"

حضرت عطارد فرماتے ہیں کہ یہ مہمل ہے، یہ عام خوبی نظم جگر میں ہے۔ لیکن ہمیں غصہ اس بات پر آتا ہے کہ اس مطلع میں متقدمین کا ایک پامال شدہ مضمون نہایت بھونڈی صورت میں بامعنی لفظوں میں جن کی ترتیب اور ترکیب بے معنی ہے پیش کیا گیا ہے، اگر ہمارے بس کی بات ہوتی تو حضرت جگر کو جدید شعرا اردو کی فہرست سے حرف غلط کی طرح خارج کر دیتے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ اس مطلع میں ایک رس ضرور ہے اور اس میں بھی کچھ شک نہیں کہ ہر ایک نفس اس کا ذائقہ شناس ایک نہ ایک دن ضرور ہوگا۔ کام اپنا ہوگیا" میں ایک مزے کی بات یہ بھی ہے کہ مطلب براری ہوگئی۔ لیکن مصرع اولیٰ میں زخم اور گہرا زخم ایسا کاری لگا ہے کہ جانبر ہونا مشکل ہے اس لئے اسی ایک "رس" پر قناعت فرمائیے جو مطلع کا مفہوم ہے۔ ہم آپ کو ایسے خوفناک وقت کی یاد حضرت جگر کی طرح دلانا پسند نہیں کرتے آپ خوش ہوں۔

مرے پہلو میں وہ بیٹھے ہیں مرے دل کی طرح جس کو میں سمجھا تھا بیگانہ وہ اپنا ہوگیا

حضرت جگر فرماتے ہیں :۔

"اس کو کیا کیجئے زبان شوق کو چپ لگ گئی جب یہ دل شائستہ عرض تمنا ہوگیا"

حضرت عطارد فرماتے ہیں کہ چپ لگنا محاورہ ہے جس کے معنی ہیں کہ زبان بند ہوگئی، زبان کی زبان کیا بند ہوگی، اور یہ کہ دوسرے مصرعہ میں "یہ" حشو اور شائستہ غیر محل ہے اس کی جگہ آمادہ ہونا چاہیئے ہماری طرف سے اس کا جواب ملاحظہ ہو جو "سب رس" میں ڈوبا ہوا ہے۔

لب چمٹ کر رہ گئے جب منھ پہ آیا لفظ وصل کتنی میٹھی خامشی حرف تمنا ہو گیا

قند مکرر کے مزہ سے محروم نہ رہیں :۔

جو خیال خام میرے دل میں پیدا ہوگیا پختہ جب ہونے لگا خون تمنا ہوگیا

حضرت جگر فرماتے ہیں :۔

"میں نے جس بت پر نظر ڈالی جنون شوق میں دیکھتا کیا ہوں وہ تیرا ہی سراپا ہوگیا"

حضرت عطارد فرماتے ہیں۔

"کہنا یہ تھا کہ جنون شوق یا دور شوق میں جس پر نظر ڈالتا ہوں تو ہی نظر آتا ہے۔ جدھر دیکھتا ہوں

ادہر تو ہی تو ہے، مگر ردیف کی خاطر کہہ گئے، وہ تیرا ہی سراپا ہو گیا، جو مہمل ہے، اس کا یا پلٹ یا قلب ماہیت کو نظر کی کرامت کہیں یا جنون شوق کا اعجاز "

ہماری جانب سے جواب ملاحظہ ہو:۔

اٹھ نہیں سکتا حجاب صورت حسن ازل جلوہ تو اس کا ہے، لیکن بت سراپا ہو گیا

یہ خاص علمی رس ہے، عام کے لئے نہیں۔ حقیقت مجردہ کا تصور محال ہے۔ اس کا احساس صو ممکنہ محسوس ہی نہیں ہو سکتا۔

حضرت جگرؔ ارشاد فرماتے ہیں:۔

" اس کو شاید ہی میسر ہو کبھی توفیق دید جو اسیر حلقہ امروز و فردا ہو گیا"

حضرت عطارد فرماتے ہیں کہ " توفیق دینا یا ہونا تو کہتے ہیں، توفیق میسر ہونا نہیں بولتے، یہ موقع توفیق دید کہنے کا نہیں دولت دیدار یا دید کہنا چاہیئے۔ مصرعہ ثانی میں "اسیر حلقہ" بے معنی ہے، "اسیر پنجہ" کہتے تو مصرع با معنی ہوتا"

شیخ سعدی فرماتے ہیں کہ

" ہر کہ امروز نہ بیند اثر قدرت او غالب آنست کہ فراموش نہ بیند دیدار"

اس لئے شعر زیر نظر میں لفظ " امروز " بھی بے معنی ہے، ہم تو اس بات کے قائل ہیں کہ نو نقد و تیرہ ادھا

کیا قیامت ہے کہ ضایع ہو رہا ہے نقد وقت اس نے جو وعدہ کیا امید فردا ہو گیا

حضرت جگر فرماتے ہیں:۔

" اٹھ سکا تم سے نہ بار التفات ناز بھی مرحبا وہ جس کو تیرا غم گوارا ہو گیا"

حضرت عطارد فرماتے ہیں کہ مصرعہ اولی میں "تم" اور ثانی میں " تیرا " شتر گربہ ہے ایسی غلطی قابل افسوس ہے، "مرحبا وہ" صحیح نہیں مرحبا اس کو یا اس پر کہنا چاہیئے"

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت جگر یہ کہنا چاہتے ہیں کہ معشوق کی انتہائی نزاکت بار التفات ناز کی بھی متحمل نہیں ہو سکتی، آفریں ہے عاشق پر کہ وہ اس غم کے بوجھ کے نیچے دبا ہوا ہے، بلکہ بخوشی گوارا کر رہا ہے غم کی دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ اگر معشوق بار التفات ناز" اٹھا لیتا تو اس کا کیا حال ہوتا، اس غم میں خطرہ کا احساس بھی ہے، دوسری صورت یہ ہے کہ عاشق کو یہ غم کھائے جاتا ہے التفات ناز سے محروم رہا

یہ مفہوم کسی حد تک اس طرح واضح ہو سکتا ہے ۔

اٹھ سکا نہ آپ سے بار نگاہ التفات ایک میں ہوں جس کو اس کا غم گوارا ہو گیا

میں نے " التفات ناز " کو اس لئے نظر انداز کر دیا کہ غالب کی نازک خیالی تک پہنچنا مشکل ہے ۔

" ہماری سادگی تھی ، التفات ناز پہ مرنا ترا آنا نہ تھا ظالم ، مگر تمہید جانے کی "

مگر سچے عاشق اور ہوتے ہیں ، آں عزیزاں را نشانے دیگر است ۔

رنج و غم ، ظلم و ستم ، جور و جفا کا کیا گلہ آپ کی یوں ہی خوشی تھی سب گوارا ہو گیا

ذہن خود بہ خود لفظ " یار " کی وجہ سے ایک اور طرف منتقل ہو گیا ۔

جس کے متحمل نہیں ہو سکتے ہیں ارض و سما صدقہ ظلم و جہل کا یہ بوجہ ہلکا ہو گیا

حضرت جگر فرماتے ہیں ۔

اپنی اپنی وسعت فکر و یقیں کی بات ہے جس نے جو عالم بنا ڈالا وہ اس کا ہو گیا

حضرت عطارد فرماتے ہیں کہ " عالم بنا ڈالنا معلوم نہیں کہاں کی زبان ہے اور اس کا کیا مفہوم ہے اگر حسن نے اپنے کو مٹا ڈالا کہتے تو مصرعہ با معنی ہوتا " ـــــ حضرت عطارد کا یہ ارشاد ہے کہ شعر پھر بھی بے معنی ہی رہتا ، اس کا جواب یہ ہے کہ یہ زبان ہے مراد آباد کی اور یہی کچھ حضرت جگر واضح کرنا چاہتے ہیں کہ یہ عالم زبان میرا بنایا ہوا ہے ۔ اس لئے میرا ہے ۔ ہم تو حضرت جگر کی وسعت قلب کی داد ضرور دیں گے جس میں فکر و یقین کے علاوہ جدت وغیرہ بھی شامل ہیں ، قافیہ " اس کا " ملاحظہ ہو ۔

حق تو یہ ہے جب انانیت ہوئی میری فنا وہ تو میرا ہو نہیں سکتا ، میں اس کا ہو گیا

حضرت جگر کا ارشاد ہے ۔

" وہ چمن میں جس روش سے ہو کے گزرے بے نقاب دیر تک ہر ایک گل کا رنگ گہرا ہو گیا "

حضرت عطارد فرماتے ہیں کہ " ہو کے گذرے ، یا بے نقاب گذرے ، بول چال کے خلاف ہے ' دیر تک ' کے الفاظ بھی بھرتی کے ہیں ، رنگ گہرا ، ہو گیا مفید معنی نہیں ، پھیکا ہو گیا ، کہنا چاہئے تھا " ـــــ اس شکستہ زبانی اور آشفتہ بیانی سے جو کچھ سمجھ میں آ سکتا ہے وہ یہ ہے کہ گلوں کے رنگ میں جو یہ شوخی پائی جاتی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ حسن بے حجاب کا سایہ ان پر پڑ گیا ۔ اس کا سطحی رنگ اب گہرا ہو گیا ۔ اور دیر تک قائم رہے گا ، یا یہ مطلب ہے کہ رنگ گہرائی میں ڈوب گیا اور جب تک حسن پھر پردہ میں نہ ہو ابھر نہیں سکتا ۔

شاید کچھ اور بھی نکتہ آفرینی کی ہو، کوئی کہاں تک کسی کے دل کی کہے۔

گوہر معنی تھا مطلب، اور یہ نایاب ہے — قعرِ بحرِ نظم میں مضمون گہرا ہو گیا

حضرت جگر مقطع میں ارشاد فرماتے ہیں۔

شش جہت آئینہ حسنِ حقیقت ہے جگر — قیس دیوانہ تھا محوِ روئے لیلیٰ ہو گیا

حضرت عطارد فرماتے ہیں "حسن حقیقت" مہمل مصرعہ اولیٰ میں ہے۔ آئینہ نہ خود حسن اور نہ حقیقت البتہ حسن نما ہے مصرعہ ثانی میں دیوانہ تھا کے بعد لفظ "جو" کی ضرورت ہے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت جگر یہ کہنا چاہتے ہیں کہ حسن مطلق شش جہت میں مشاہدہ ہو رہا ہے حسن متقید یا مجاز کے پیچھے مارے مارے پھرنا دیوانگی ہے۔ اہل علم سے یہ حقیقت پوشیدہ نہیں کہ حقیقت مجردہ یا حسن مطلق کا تصور محال ہے اس کا احساس کسی نے کسی صورت متعینہ مشخصہ میں ہی ممکن ہے۔ قیس خواہ دیوانہ ہو لیکن بکار خویش ہشیار ضرور تھا۔

دیکھنا اہل نظر عشق بتاں کا معجزہ — محوِ حسنِ روئے لیلیٰ آپ لیلیٰ ہو گیا

غالب مرحوم کا تخیل بہت بلند ہے۔

آزردہ تا بہ مہر ہے دل، دل ہے آئینہ — طوطی کو شش جہت سے مقابل ہے آئینہ

کائنات عالم دل یا عالم خیال ہے، عالم تمام حلقہ دام خیال ہے، لیکن جاوید درو حقیقتی جلوہ گراست (جامی) یہ عالم دل یا خیال آئینہ ہے جو طوطی کے سامنے رکھا ہے۔ طوطی سے مراد انسان ہے، اس میں عکس طوطی کا رہتا ہے جسے وہ اپنا غیر سمجھ کر ہم کلام ہوتا ہے۔ پس آئینہ استاد ازل بول رہا ہے۔

درپس آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند — آنچہ استاد ازل گفت ہماں می گویم (حافظ)

اس لئے اگر بر نبوت ایمان داری با خطرات دل جز بہ تعظیم پیش میا (بیدل)

اس حد تک ہم حضرت جگر کے ہمسفر رہے، وہ اس منزل پر ٹھیر گئے اس لئے ہم بھی اتنا کہہ کر رخصت ہوتے ہیں۔

کتنا خواب آور ہے افسانہ جگر کی واردات — وہ تغافل کیش بھی سن سن کے رسیا ہو گیا

میرے دل کی آئینہ میں بن گئی روشن مثال — خود نمائی آپ کی آخر تماشا ہو گیا،

خواہشات نفس ڈوبی اشک حسرت میں تمام — لشکر فرعون یکسر غرق دریا ہو گیا،

دامن وحدت نہیں گرد دوئی سے داغدار — چشم احول میں مگر کثرت سے میلا ہو گیا

آسماں پر مشتری اس کا عطارد ہو تو ہو — شعر اختر کا زمیں میں نرخ بالا ہو گیا۔

علامہ اقبال کا ایک شعر

جناب محمد قطب الدین صاحب ایم - ایس سی

ہر کہ بر خود نیست فرمانش رواں
می شود فرمان پذیر دیگراں! اقبال

جب سر عبد القادر چیف جسٹس بہاولپور اسٹیٹ قانونی کانفرنس اور اردو کانگریس کے سلسلہ میں حیدرآباد تشریف لائے تو انھوں نے ایک جلسہ میں علامہ اقبال کے کلام و پیام پر تقریر کرتے ہوئے فرمایا " میری نصیحت یہ ہے کہ بجائے اس کے کہ علامہ اقبال کے سارے کلام و فلسفہ کو ایک ہی صحبت میں بیان کیا جائے یا اس پر ایک بسیط مقالہ سپرد قلم کیا جائے بہتر یہ ہے کہ ایک وقت میں کسی ایک شعر کو لے کر اوس کے معنی و مضمرات پر مدلل بحث کر کے اون کے پیام کو سمجھایا جائے " چنانچہ موصوف نے علامہ مرحوم کے اس شعر پر ؎

میں تجھ کو بتاتا ہوں تقدیر امم کیا ہے
شمشیر و سناں اول طاؤس و رباب آخر

نہایت ہی بصیرت افروز تقریر کی اور اس حقیقت کو جو علامہ مرحوم نے انتہا درجہ شاعرانہ ملکہ کیساتھ صرف دو مصرعوں میں بیان کیا ہے تاریخ عالم کی روشنی میں مختلف شہادتیں پیش کر کے ثابت کیا

اسی سلسلہ میں سر عبد القادر نے انگلستان کی کسی آرٹ گیلری میں شاہان اودھ کی زمانیاتی ترتیب (CHRONOLOGICAL ORDER) سے لگی ہوئی تصاویر کا ذکر کیا اور اس بات کو واضح کیا کہ اودھ کے پہلے اور دوسرے بادشاہوں کی تصویروں سے جو جاہ و جلال، شان و شوکت، دبدبہ و طنطنہ مترشح تھا آخری زمانہ کے بادشاہوں کی تصاویر میں اس کی بتدریج کمی ہوتی گئی اور آخری شاہ اودھ کی تصویر سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ یہ صاحب شمشیر و سناں نہیں بلکہ ارباب طاؤس و رباب میں سے ہیں -

حقیقتاً ڈاکٹر اقبال نے اِس شعر میں اقوام و ملل کی ترقی و تنزل . زمانہ کے نشیب و فراز - امتوں کی رفعت و پستی کی داستان کو اس درجہ بلاغت سے بیان کیا ہے کہ یہ صرف اون ہی کو نصیب ہوتا ہے جو آرٹ کے بلند ترین زینہ پر پہنچ چکتے ہیں اور لطف یہ ہے کہ اِس خشک مضمون کے بیان میں بھی علامہ مرحوم نے آرٹ کی نزاکتوں کو اس خوش اسلوبی سے پیش نظر رکھا ہے کہ دور حاضر کے "جدت پسند" شعرا اور BLANK VERSE

کے مقلدین اور حامیوں کے لئے پیام بصیرت ہے
اس ایک شعر پر ہی منحصر نہیں اقبال کا سارا کلام
اس طرح کے اَن مول موتیوں سے مالا مال ہے۔
علامہ مرحوم نے حیات انسانی کے دقیق سے دقیق
مسئلہ پر بھی اظہار خیال فرمایا ہے تو اوسی گل و بلبل
ساقی و میخانہ، حرم و بت خانہ، بستان و چمن، لالہ
و نسترن، ساغر و سبو، صراحی و مینا والی زبان میں
یعنی تلخ سے تلخ دارو کو میٹھے سے میٹھا شربت
بناکر حلق کے نیچے اتار دیا ہے۔ نطشے کے فلسفہ
کے لب لباب کو ایک شعر میں لطیف سے لطیف
پیرایہ میں سنئے

خوگر بہ خار شو کہ سراپا چمن شوی
درماں را درد ساز اگر خستہ تن شوی

اقبال کے کلام سے اس طرح کے جواہر پاروں
کی سیکڑوں مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ لاک
Lock کانٹ kant
برگسان Bergson.
براوننگ Browning.
BYRON بائرن اور رومی وغیرہ کے
خیال و فلسفہ کو صرف ایک ایک شعر میں جس طرح
بیان کیا گیا ہے اہل نظر سے پوشیدہ نہیں یہاں
ان کو اس لئے ترک کیا جاتا ہے کہ اولاً اس کے
قبل سیکڑوں مقالہ نگاروں نے اس کو پیش کیا ہے

ثانیاً اصل بحث سے کہیں ہم بہت دُور نہ جا پڑیں
ہاں تو میری بحث کا موضوع سر عبد القادر کی
نصیحت تھا۔ فی الحقیقت اقبال کو سمجھنے سمجھانے
اوس کے کلام کی تعلیم و تعلم اور اوس کے خیال کی
بلندی و رفعت کو پہنچنے، اور اوس کے نقطۂ نگاہ کو
حیطۂ فہم و ادراک میں محصور کرنے کے لئے نہایت
احتیاط برتنی لازم ہے اس لئے کہ اقبال کا کلام
میر و سودا، ناسخ و آتش، غالب و مومن، داغ
و امیر اور حسرت و جگر کے کلاموں کی طرح محض سننے
سنانے کے لئے نہیں بلکہ سمجھنے اور سمجھ کر عمل کرنے
کے لئے ہے۔ جب وہ کبھی محض زیب مشاعرہ ہوکر
آہ اور واہ کی صورت میں خراج تحسین حاصل نہ
کیا تو اوس کو زیب گلوئے مطرب بھی نہ بنایا جائے
تو بہتر ہے۔ اقبال کا کلام نتیجہ ہے مشرقی و مغربی
علوم و تمدن اور مکاتب خیال کے غائر مطالعہ کا۔
اوس کا نطق حاصل ہے۔ صدیوں کے ارتقاء خیال
اور فلسفہ حیات پر کامل غور و تامل کا۔ اقبال نے
سماجی۔ عمرانی، سیاسی معاشرتی، مذہبی اور مابعد الطبیعاتی
غرض تمام امور پر علوم قدیم و جدید اور عصر نو کی
تحریکات کی روشنی میں اظہار رائے کیا ہے لیکن
علامہ مرحوم نے اس میں غایت درجہ احتیاط سے
کام لیا ہے۔ پہلے انسانی حیثیت کے تمام پہلوؤں کے
تاریخی پس منظر اور موجودہ تحریکات و تصورات

اور بڑھتی ہوئی ضروریات کا غور سے مطالعہ کیا ہے اس کے بعد خود کا ذاتی ردعمل اور معتقدات کو ایک اعلیٰ دماغ مفکر کی حیثیت سے بہتر سے بہتر انداز میں پیش کیا ہے۔ میں بلا خوف تردید کہہ سکتا ہوں کہ علامہ اقبال جیسی جامع العلوم ہستیاں معدودے چند ہیں۔ لہٰذا اس عالم شاعر کے امور و مضمرات کو سمجھ کر کما حقہ داد دینے کے لئے مشرقی اور مغربی علوم پر کافی عبور کی ضرورت ہے پس ظاہر ہے کہ اقبال کے سارے کلام پر ایک سانس میں کہہ جانا نہ صرف ایک سنگین جرم ہے بلکہ ایک عمل بے سود اور سعئی لاحاصل۔ اس کو ایک مثال سے واضح کیا جا سکتا ہے۔ قدیم زمانہ میں ہندوستان میں جب کسی پنڈت یا نائک صاحب کو یہ منظور ہوتا تھا کہ اپنے کسی شاگرد کو موسیقی میں مکمل درس نہ دیا جائے تو وہ یہ کرتے تھے کہ اوس کو ایک وقت میں دس بیس راگنیوں کی آروہی اور وبہی، وادی سمود روی، اتار چڑھاؤ سنانے اور سکھاتے جس کا صاف نتیجہ یہ ہوتا کہ ان میں سے کسی ایک راگ کا بھی روپ اور رنگ شاگرد کے ذہن نشیں نہ ہوتا اور وہ جہاں تھا وہیں رہتا۔

اتنی تمہید و تفریط کے بعد میں اقبال کے شعر ؎

ہر کہ بر خود نیست فرمانش رواں
می شود فرماں پذیر دیگراں!

کی طرف متوجہ ہوتا ہوں۔

اس شعر کا مطلب یہ ہے کہ ہر وہ شخص جو خود پر حکومت نہیں کر سکتا۔ اوس پر دوسرے حکومت کرنے لگتے ہیں۔ لیکن اگر اس پر کسی قدر تدقیق و تحقیق کے ساتھ غور و تامل کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس کے بہت ہی نتیجہ خیز کار آمد اور دور رس مطالب ہیں۔ ہر وہ شخص جو خود پر حکومت نہ کر سکے یعنے خود پر قابو نہ پا سکے دوسروں کی حکومت اور قابو میں آجاتا ہے۔ خود پر حکومت کا مطلب ایسے رجحانات پر قابو پانا ہے جس کی تعمیل سے انسان کو ہلاکت و مضرت میں پڑنے کا اندیشہ ہو فلاطون کا درس صرف یہیں تک ختم ہو جاتا ہے کہ خود کو پہچانو، لیکن اقبال خود پر حکومت کرنے کی تلقین کرتا ہے۔ فرض کیجئے ایک طالبعلم کو خود پر اتنا قابو نہیں کہ وہ علی الصبح اٹھ کر مدرسہ کو پابندی سے جائے تو وہ ضرور اپنے استاد کے پاس مطعون اور اپنے ہم چشموں میں نیچی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔ یا یہ کہ ایک طالب علم کا دل یہ چاہتا ہے کہ آج کا سبق یاد نہ کیا جائے۔ بلکہ کھیل کود میں وقت کاٹا جائے۔ ایسے میں

اگر وہ خود پر قابو پاکر کھیلنے سے باز رہتا ہے اور سبق یاد کرتا ہے تو وہ مدرسہ میں اپنے ہم جماعتوں میں سربلند اور استاد کے نزدیک سرخرو ہوتا ہے۔ اگر ایک کاریگر یا مزدور اپنی طبیعت اور فطری سستی و کاہلی پر قابو پاکر خود کو اپنے کام میں منہمک کردیتا ہے تو اس کو اس کا اچھا نمبر ملتا ہے ورنہ اوس کی زندگی دوسروں کے رحم و کرم کی محتاج ہوجاتی ہے۔ ہر انسان کو خواہ وہ کسی گروہ و طبقہ سے تعلق رکھتا ہو عمر کے کسی نہ کسی حصہ میں مصائب و شدائد نہیں تو کم از کم دشواریوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ فطری تقاضا تو یہ ہے کہ ایسے وقت میں برداشتہ خاطر ہوکر ناسازگار حالات کے سامنے اپنا سر جھکا دے۔ لیکن وہ شخص جو اس آزمائش کے وقت خود پر قابو پالیتا ہے اور فطری رجحان اور انسانی جبلی کمزوریوں کے سامنے سر نہیں ٹیکتا بلکہ عزم صمیم کے ساتھ حالات کا مطالعہ کرتا ہے آخرکار کامیاب و کامران ہوتا ہے۔

غیظ و غضب انسانی کمزوریوں میں سب سے بڑی کمزوری ہے۔ ایسی حالت میں قابو پانا حقیقت میں بڑی جوان مردی اور بہادری ہے کسی قوم کا ایک قائد ہے ایک وقت ایسا آتا ہے کہ اوس کے سامنے صرف ایک ہی صورت رہتی ہے کہ وہ ذاتی مفاد کو قوم کی اجتماعی فلاح پر قربان کرے یا اس کے بالعکس ایسے میں اگر وہ خود کی ذاتی کمزوریوں پر خود کو مطعون کرتا ہے تو ایک عالم کی طعن و تشنیع سے بچتا ہے۔

اس شعر کے ذریعہ علامہ اقبال نے صرف افراد کو نہیں بلکہ اقوام کو بھی درس دیا ہے اس لئے کہ جس قوم کے افراد میں یہ صلاحیت ہو کہ وہ خود پر حکومت کرسکیں، قانون کی عزت، وقت کی پابندی، فرائض کی انجام دہی، ہمسایہ کے حقوق کی ادائیگی پوری پوری طرح کرتے ہوں۔ تو وہ قوم بحیثیت مجموعی خود پر حکومت کرنے کی مستحق و حقدار ہوتی ہے، ہمسایہ اقوام اوس پر نظر اٹھاکر بھی دیکھنے ڈرتے نہیں۔ تاریخ کے اوراق سے اس قسم کی صدہا مثالیں ملتی ہیں کہ جس قوم و ملک میں ضبط ڈسپلین —— باقی نہ رہا خانہ جنگیاں اور طوائف الملوکی نے اپنا سکہ جمالیا وہ قوم و ملک بہت جلد اغیار کے پنجہ میں پھنس گئے اور اپنی آزادی کھو بیٹھے۔

افراد و اقوام کا باہمی رشتہ میرے خیال میں MONISTIC نظریہ کے سپرد ہے اور نہ MONADNISTIC. مکتب خیال کے حامیوں نے صحیح طور پر سمجھا ہے۔ بلکہ ORGANISMIC —— (عضویاتی نظریہ) نے اس کی سچی تعبیر کی ہے۔ یعنے ہر فرد قوم کے عضو کا حکم

رکھتا ہے۔ عضو اور عضویہ ORGANY ORGANISM (ایک دوسرے کے لئے ضروری ہیں۔ عضو کے لئے عضویہ کا وجود لابدی ہے تو عضو بھی عضویہ کا جز لاینفک ہے۔ لہٰذا نہ SIR STVRRT MILL کی انفرادیت Individualism سے اعتدال میں ہے۔ اور نہ اشتراکی Socialists مکتب خیال کے ائمہ کا خیال درست۔

لہٰذا ہر وہ شخص جو یہ چاہتا ہے کہ اپنی قوم و ملک دوسروں کے زیر نگیں نہ رہے اس کو چاہیئے کہ پورے ضبط کے ساتھ خود پر حکومت کرنا سیکھے۔ اور قوم کے محاسن و محامد کے ساتھ ساتھ اوس کی برائیوں کا بھی خود کو مبادی کا ذمہ دار سمجھے ورنہ غلامی کرے۔

ہر کہ بر خود نیست فرمانش رواں
می شود فرماں پذیر دیگراں!

(اقبال)

براہ کرم تبدیل مقام سے دفتر کو مطلع کیجئے
کہ پرچہ آپ کو ملا کرے
ورنہ دفتر اس کا ذمہ دار نہ ہوگا۔

غزل

دور ہی دور ہے گرداب میں کیا رکھا ہے
شورش عالم اسباب میں کیا رکھا ہے

چندروزہ گل شاداب میں کیا رکھا ہے
خواب ہے رنگ چمن، خواب میں کیا رکھا ہے

حسن سادہ، نہیں منت کش دیبا و حریر
تابش اطلس و کمخواب میں کیا رکھا ہے

حسن منظر شب مہتاب کا منظر تجھ سے
تو ہی تو ہے شب مہتاب میں کیا رکھا ہے

ہیں نظر میں تیرے دامن کے ستارے رقصاں
جلوۂ کرمک شب تاب میں کیا رکھا ہے

میں تو قائل ہوں پرستش کا خدا کی اے شیخ
مسجد و منبر و محراب میں کیا رکھا ہے

دل میں کر حافظ و خیام کی مستی پیدا
گردش جام و مئے ناب میں کیا رکھا ہے

جذبۂ دل کی ہے کیوں حسن پشیماں کو تلاش
خاک ہے اب دل بیتاب میں کیا رکھا ہے

دوستی نام ہے اس دور میں عیاری کا
بے خبر محفل احباب میں کیا رکھا ہے

خواب وہ خواب ہے جس خواب کی تعبیر ہو تم!
ورنہ الفت کے حسیں خواب میں کیا رکھا ہے

سوہنی اور مہنیوال نہ ہیر اور رانجھا
آج معمورۂ پنجاب میں کیا رکھا ہے۔

(امرت سر)

”زندگی“

جناب محمد عبدالرحمن صاحب تبسم

زندگی اور موت، غم اور خوشی، کتنے پیچیدہ سوالات اف، کل جسے چاہوں سے پالا اسی کو اپنے ہاتھوں دفن کر دیا، آہ، میں کتنا سنگ دل و بیرحم باپ ہوں، رمنی اکیلی چلی گئی۔ مجھے اور اس کی ماں مالتی کو ہمیشہ آنسوؤں سے کھیلنے کے لئے چھوڑ گئی۔ کیا اب مالتی زندہ رہے گی؟ اکلوتی بیٹی ہی تو ہم دونوں کا سہارا تھی، اب میں کیسے گھر جاؤں۔ جینے سے زیادہ موت پیاری ہے، آہ، آج وہ موت کے گہوارہ میں سو گئی میں مرد ہوں مالتی عورت، پھر ایک کمزور عورت ماں بن کر کیسے بھلا سکیگی۔ یہی خیالات لئے گھر آیا۔ کیا دیکھتا ہوں ماتم بپا ہے، گھر دیکھتے ہی گذری ہوئی زندگی کا دھندلا سا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھرنے لگا۔ میرے کانوں میں آواز آنے لگی۔ رام لنگ تو بہت ہی بدقسمت باپ ہے، اب تو دنیا میں رہ کر کیا کرے گا۔ ایک لڑکی چودہ سال کے بعد ہوئی، وہ بھی نہ رہ سکی۔ بھگوان تو نہ دیتا تو یہ غم بھی نہ ہوتا۔ تو نے ہماری زندگی کا سہارا لے لیا۔ ہماری دلچسپیاں چھین لیں۔ وہ رو رہی تھی مجھے دیکھ کر اور رونے لگی۔

میں نے اسے سمجھا دیا۔ ہر چیز فنا ہونیوالی ہے وہ کب مانتی۔ ماں کا دل۔ آخر ماں ہی تو ہے، وہ بھولے کیسے؟—

دن جیسے جیسے گزرتا یہ اور پریشان ہوتی، روتی پلاتی، غش کھا کر گر جاتی۔ میں سمجھا وہ دیوانی ہوئی۔ اور مجھے دیوانہ کرے گی۔

شام آئی۔ رات ہوئی۔ گھر مسان معلوم ہونے لگا آج اسے نیند کیسے آئے۔ ہر روز اس کے گود میں رمنی سوتی تھی۔ آج وہ کہاں۔ آہ، رات بہت دیری کے ساتھ اپنا دورہ ختم کر رہی تھی۔

صبح ہوئی۔ کیا دیکھتا ہوں وہ ابھی تک سو گئی ہے میں اور پریشان ہو گیا۔ وہ تو صبح صبح اٹھنے والی۔ میں بستر کے قریب گیا۔ آواز دی۔ اسے بالکل خاموش پایا۔ میری آنکھوں کے سامنے دنیا پھرنے لگی۔ آہ، میری دنیا لٹ گئی۔ میں بیہوش ہو کر گر پڑا۔ کیا دیکھتا ہوں یہ شور۔ میرا گھر ماتم کدہ بنا ہے۔ مالتی بھی مجھے چھوڑ کر گئی۔ آہ، .... مالتی .... مالتی .... مجھے چھوڑ کر گئی۔ کل رمنی چل بسی۔ آج تو .... میرے لئے دنیا میں کون ہے کس کیلئے زندہ رہوں۔

میں بہت پریشان تھا۔ وحشت ہو رہی تھی۔ زندگی سے گھبرا رہا تھا۔ جنون طاری ہو گیا تھا۔ میری بے چینی دن بدن بڑھ رہی تھی۔ دنیا والوں نے مجھے سمجھایا۔ دلاسا دیا۔ دن بیت گئے۔ زمانہ ہوا میں سب کچھ بھول گیا۔ دوبارہ شادی کی آج پھر میرے گھر بچے کھیل رہے ہیں یہ میری تمناؤں و مسرتوں کا گہوارہ ہے میں خوش ہوں۔ زندگی کے جھمیلوں نے مجھے سب کچھ بھلا دیا ہے۔ ”غم اور خوشی“ ”زندگی اور موت“ یہ دونوں ایک دوسرے کے جیون ساتھی ہیں زندگی کانٹوں کا مسکن ہی نہیں پھولوں کا سیج بھی ہے۔

شعلے

رات بھیگ چلی تھی۔ سارا گاؤں محو خواب تھا۔ بوڑھا نرسنگ جھونپڑی کے سامنے گوبر سے لیپی ہوئی آنگن میں ٹاٹ کے چیتھڑوں پر لیٹا ہوا تھا ایک موٹا پتھر اس کے سرہانے تکیہ کا کام دے رہا تھا۔ بہت دیر تک وہ تاروں کو گھورتا رہا اور جب نیند سے اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں تو اس پر کھانسی کا ایک زبردست دورہ پڑا۔

" باپو "

اس کی بیٹی نے اندر سے آواز دی۔

" تو اب تک جاگ رہی رادہا ؟ بوڑھا اپنا بالوں بھرا سینہ رگڑتے ہوئے بولا۔

" نہیں تو تمہاری آواز سن کر اٹھ بیٹھی"

بوڑھے کے سینہ پر گویا آرے چل گئے۔

" سوجا بیٹی میری اس کہاؤں کہاؤں سے تیرا ابھی ناک میں دم ہو گیا ہے " نرسنگ نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا " چنگی بھرا جوان کھاؤ گے "

" ہونہہ یہ تو جیتے جی کا روگ ہے پگلی۔ نہ جانے بھگوان اس ناؤ کو کب پار لگاتے ہیں ہے "

" باپو ـــــ ایسی باتوں سے دھڑکن ہوتی

رادہا خاموش ہو گئی اور نرسنگ کو بھی نیند آگئی۔ رادہا کے من میں ترنگیں اٹھ رہی تھیں۔ نہ جانے کس کا تصور ناچتا ہوا آیا کہ اس کی آنکھیں سرور سے بند ہو گئیں۔ اس نے سرہانے کا تکیہ ٹانگوں میں دبالیا اور مزے لے لیکر کروٹیں بدلنے لگی۔ جھونپڑی کے اندھیارے میں اس کی آنکھوں کے سامنے ننھے ننھے تارے ناچ رہے تھے۔ اس نے تکیہ کو ٹانگوں کی گرفت سے نکال کر ہونٹوں سے لگایا اور چپکے سے بولی۔

" گردھاری "

گردھاری گاؤں کا ایک کڑیل جوان تھا چوڑا چکلا سینہ، مسکراتے ہوئے ہونٹ، بڑی بڑی کالی آنکھیں، ان پر گہری بھویں تنی ہوئیں کشادہ پیشانی، پیشانی پر ایک گہرے زخم کا داغ اور اس پر جھومتے ہوئے بال ـــــ جب وہ بنسری کی تانیں اڑاتا ہوا جنگل میں نکل جاتا تو پرندے پھڑ پھڑانا چھوڑ دیتے، خوشی سے درخت جھومنے لگتے۔ جھرنے کا پانی دھیمے سروں میں گنگنانے لگتا۔ پنگھٹ پر پنہاریوں کے ہاتھوں سے گاگریں چھوٹ جاتیں اور ان کے دل زور زور سے دھڑکنے لگتے، یہی گردھاری رادہا کا من موہن تھا۔

"میرے گردھاری"۔

اندھیرے میں اس نے جھونپڑے کے چاروں
کونوں پر نگاہ دوڑائی۔ آنکھیں پھاڑ کر ادھر ادھر
دیکھا اور یوں شرمائی جیسے کسی نے اس کی اس
مجنونانہ حرکت کو دیکھ لیا ہو۔ ہاتھ ٹھنڈے ہو گئے
گالوں میں ہولے ہولے حرارت پیدا ہونے لگی۔
کانوں پر جیسے چیونٹیاں رینگنے لگیں۔ اتنے میں جھونپڑی
کے پچھلے حصہ سے آواز آئی۔

"رادھا"

وہ چونک کر اٹھی۔ جھک کر چھوٹے دروازے
کے باہر دیکھا۔ نرسنگ گہری نیند سو رہا تھا۔ مزید
اطمینان کی خاطر اس نے بلند آواز میں کہا۔

"بابو"

نرسنگ ویسے ہی سو رہا تھا۔ وہ دبے پیر
باہر آئی۔ تاروں کی ٹھنڈی چھاؤں میں اسے ایک
سایہ کھڑا ہوا نظر آیا —— یہ گردھاری تھا۔ دونوں
چپ چاپ ایک پگڈنڈی پر چلنے لگے۔ کچھ دور
جا کر کھیت کی مینڈ پر بیٹھ گئے۔ ہواؤں میں خوشبو
پھیلی ہوئی تھی۔ گردھاری معمول سے زیادہ خوش
تھا۔ اس نے رادھا کی کمر میں ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا

"میری کل فوج میں بھرتی ہو جائیگی"۔

"تم بھی لڑائی پر جاؤ گے؟ کیا تمہارے بغیر
لڑائی نہیں جیتی جا سکتی؟"

"اگر ہر نوجوان یہی سوچ کر گھر بیٹھ رہے
تو پھر کیا ہو"۔

"یہی کہ لڑائی ختم ہو جائیگی اور سنسار کو شانتی
ملے گی"۔

"یہ تیری بھول ہے رادھا۔ لڑنا جھگڑنا تو ہماری
گھٹی میں پڑا ہے۔

"تو پھر لڑائی کو روکنے کی کوشش سے کیا حاصل"

گردھاری سے کوئی جواب بن نہ پڑا۔ کہنے لگا۔

"گھر میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرنے سے تو جنگ کے
میدان میں مرنا اچھا ہے۔ جو حق اور انصاف کے لئے
لڑ کر مرتا ہے وہ مرتا نہیں ہمیشہ کے لئے زندہ ہو جاتا ہے"

رادھا گردھاری کی باتیں سنتی رہی۔ اس کو
گردھاری کی گفتگو کچھ عجیب سی معلوم ہو رہی تھی بہکی
بہکی باتیں کرنیوالا آج کیسی پکی باتیں کر رہا ہے۔
اس کو ضرور کسی نے سکھایا پڑھایا ہوگا ورنہ اس میں
اتنی تمیز کہاں۔ پھر اس کے سامنے بھرتی کا سپاہی
آگیا جو کچھ دنوں سے گاؤں میں گشت لگا رہا تھا
رادھا کو زیادہ سوچنے کا موقع نہ ملا۔ گردھاری نے
پھر بکواس شروع کر دی۔

"جب بھرتی کے جوان نے سیٹھ کندن لال کے
سامنے کہا۔ گردھاری جیسا بانکا جیوٹ گاؤں بھر
میں نہیں تو میری گردن غرور سے اکڑ گئی۔ سیٹھ جی بولے
اس میں کیا شک۔ میں اور پھول گیا۔

کندن لال کی گاؤں میں ایک اناج کی دکان تھی بالکل چھوٹی سی دکان لیکن اجڑے گاؤں میں گدھی سہاگن سیٹھ جی کی ہر جگہ آؤ بھگت ہوتی تھی شام کو جب وہ چاوڑی میں آکر بیٹھتے تو ان کے ارد گرد ایک ہجوم رہتا۔ جب وہ اپنی چھلکتی ہوئی توند کو تھپکتے ہوئے ایک ایک لفظ تول تول کر بولتے تو سب ہمہ تن گوش ہو جاتے۔ سیٹھ جی اکثر جنگ اور اس کے تباہ کن اثرات پر خیال آرائی کرتے تھے۔ انھوں نے لوگوں کے دلوں میں یہ بات اچھی طرح بٹھا دی تھی کہ اب لڑائی اس نوبت پر پہنچ چکی ہے کہ فاقوں مرنا ہو اشیاء کی قیمتیں اس قدر بڑھ جائیں گی کہ غریب منہ کھولے ہی رہ جائیں گے۔ گاؤں کے بھولے بھالے لوگ گھبرا کر پوچھتے۔

"ہمارا کیا حال ہوگا مہراج"؟

تو وہ ایک ظالم تبسم کے ساتھ کہتے۔

"فکر نہ کرو۔ میری دوکان تمہاری ہی ہے"۔

کندن لال گاؤں میں بہت مقبول ہو گئے تھے۔ ہر ایک ان کو اپنا ہمدرد و غمگسار سمجھتا تھا کیونکہ انھوں نے یہ بات سب کے ذہن نشیں کرا دی تھی کہ قرب وجوار کے دیہات میں نرخیں ان کی نرخ سے سوگنی زیادہ ہیں۔ سیٹھ جی میلی کچیلی دھوتی کی بجائے اب ریشمی حاشیہ کی دھوتی باندھنے لگے تھے ان کے قمیص میں اب سونے کی گنڈیاں جھلمل کرتی تھیں۔ ان کے کالے کانوں میں سونے کی بالیاں چمکنے لگی تھیں۔ ان کی خوشحالی کو دیکھکر کوئی گمان تک نہ کرتا کہ وہ غریبوں کو لوٹ کر اپنی دنیا سنوار رہے ہیں۔ سب یہی سمجھتے کہ ایمانداری کی کمائی میں ایسی ہی برکت ہوتی ہے۔ گرد ہاری کو بھی اسی طرح ان پر کامل اعتماد تھا۔ اسی لئے جب انھوں نے بھرتی کے سپاہی کے سامنے اس کی تعریف کی تو اس کی باچھیں کھل گئیں۔

مستقبل کے نقشے بنا بنا کر وہ رآدہا کے سامنے رکھنے لگا۔

"جب دشمن ہار جائیگا تو جانتی ہو در اصل جیت کس کی ہوگی —— مزدوروں اور کسانوں کی۔ وہ پھندا جو مہاجن ہمارے پیچھے پیچھے لئے پھرتے ہیں ایک روز خود ان کے گلے میں پڑ جائے گا ہمارے ہاتھ پاؤں کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑنے والے زمیندار بھی ختم ہو جائیں گے اور ہم ان کے محلوں میں راج کریں گے۔ رآدہا ہم کو آرام اسی وقت ملے گا جب ہم ایک مرتبہ جان پر کھیل جائیں، جو ہمیشہ آرام ڈھونڈتا ہے اسے مصیبت کے سوا کچھ نہیں ملتا"۔

"کب جا رہے ہو؟"

"کل"

رآدہا بچوں کی طرح ہچکیاں لے کر رونے لگی۔

"ارے یہ کیا ؟ لڑائی پر جانیوالوں کو آنسوؤں کی نشانی نہیں دیا کرتے"

گردہاری کے ہونٹ رادھا کے لبوں سے پیوست ہوگئے۔

جب رادھا اپنی جھونپڑی کے قریب پہنچی تو نرسنگ کو پھر کھانسی کا دورہ پڑا۔

"باپو" وہ گھبرائی ہوئی آواز میں بولی۔

"جاگ رہی ہے تو" بوڑھا جھونپڑی میں جھانکتے ہوئے بولا۔

"پیشاب کو اٹھی تھی ذرا" نرسنگ نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا اور کہا۔

"اری میں سمجھا تو اندر سے بول رہی ہے، مجھے کیوں نہ جگایا۔ رات کے وقت جنگل میں سانپ بچھو نظر آتے ہیں"

"خیر اب سو جاؤ۔ تمھیں سویرے اٹھنا ہے باپو"

نرسنگ تھوڑی ہی دیر میں خراٹے لینے لگا رادھا کو بالکل نیند نہ آئی۔ وہ سوچ رہی تھی۔ گردہاری کے جانے کے بعد میری دنیا کتنی ویران اور سنسان ہو جائے گی۔ اس کے بغیر ندی کا کنارہ، ہرے ہرے لہلہاتے کھیت، چاندنی راتیں، تاروں کے گیت سب اداس ہو جائیں گے۔ چند آنسو گالوں پر بہتے ہوئے اس کے ہونٹوں کے کونوں میں گھس گئے۔ روتے روتے اس کی آنکھ جھپک گئی۔

پھر وہ ہڑبڑا کر جاگ اٹھی۔ باہر جھانک کر دیکھا۔ صبح کا ستارہ پہاڑ کی چوٹی پر ناچ رہا تھا۔ نسیم کلیوں کا منہ چومتی پھر رہی تھی۔ ہر طرف گہری خاموشی تھی جو پو پھٹنے سے پہلے چھا جاتی ہے۔ دوبارہ اس کی آنکھ لگ گئی۔ جب وہ بیدار ہوئی تو نرسنگ کھیت کو جا چکا تھا اور گردہاری بھی گاؤں سے بہت دور نکل گیا تھا ——

دن گزرتے گئے لیکن گردہاری کی کوئی خبر نہ آئی۔ کندن لال چاوڑی میں بیٹھ کر لڑائی کی خبروں پر تبصرہ کرتے رہتے۔ اب ان کے مشتاق سامعین میں ایک اور اضافہ ہوگیا تھا۔ وہ رادھا تھی۔ سیٹھ جی کے آنے سے پیشتر ہی وہ یہاں آکر بیٹھ جاتی اور اس وقت تک بیٹھی رہتی جب تک کہ سب کو برخواست کرنے کا حکم نہیں مل چکتا۔ اس کو نہ کندن لال کی باتوں سے دلچسپی تھی اور نہ جنگ کی خبروں سے۔ اس کے کان تو صرف یہ سننا چاہتے تھے گردہاری کہاں ہے اور کیسا ہے، ہر روز اسے روح فرسا مایوسی ہوتی اسی طرح ایک سال گزر گیا اور گردہاری کے پاس سے کوئی اطلاع نہ آئی۔

اس عرصہ میں گاؤں کی چھوٹی سی دنیا میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی، وہی کھیت، وہی جھونپڑے۔ وہی تالاب، وہی پربت، وہی چاوڑی اور وہی سیٹھ کندن لال

کی دکان۔ لیکن راَدھا کی دنیا بالکل بدل گئی تھی۔ وہ گردھاری کی واپسی سے مایوس ہو چکی تھی۔ روزآنہ شام کو وہ امید کا جھلملاتا چراغ لے کر اس مقام پر جاتی جہاں سیٹھ جی جنگ کی خبریں سنایا کرتے تھے اور روز ایسی مغموم واپس ہوتی جیسے کوئی گھر سے لوٹتا ہے۔

ایک روز کندن لال اس کی کٹیا پر آئے اور مشفقانہ انداز میں بولے۔

"راَدھا"

وہ چونک پڑی۔ طرح طرح کے وسوسے دل میں پیدا ہوئے۔ کہیں گردھاری کے متعلق بری خبر تو نہیں لائے؟ وہ جلدی سے باہر آئی۔

"نرسنگ۔ میں؟"

"کھیت پر ہیں!"

"ایک ضروری بات کہنی تھی ان سے"

"مجھ سے کہہ دیجئے۔ آنے پر سنا دوں گی"

"تو ابھی بچی ہے"

سیٹھ جی نے محبت سے اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھے اور آہستہ آہستہ اس کے گداز شانوں کو دبانا شروع کیا۔ راَدھا پیچھے ہٹ گئی۔ اس کو کندن لال کی آنکھوں میں ایک عجیب قسم کی چمک نظر آئی۔ وہ ڈر گئی۔ گھبرا کر سلام کیا اور جھونپڑی میں گھس گئی۔ سیٹھ جی نے مڑ کر چاروں طرف دیکھا کوسوں کسی کا پتہ نہ تھا۔ راَدھا کی طرح اس کی جھونپڑی بھی درختوں کے جھنڈ میں تنہا کھڑی تھی۔ کچھ دیر تک وہ کھڑے سوچتے رہے۔ پھر پلٹ کر گھر کی طرف چل دیئے۔

شام کو نرسنگ گھر آیا تو راَدھا بولی

"باپو ـــــ سیٹھ جی یہاں آئے تھے آج"

"کیوں"

"کہہ رہے تھے تم سے کچھ کام ہے"

"تو میں ان کے گھر جاتا ہوں ابھی"

"کنواں پیاسے کے پاس نہیں جاتا"

"راَدھا" نرسنگ ایک سرد آہ کھینچ کے بولا "فقیر کے گھر آ کے کوئی بھیک نہیں دیتا۔ اسے جھولی لٹکا کر گلی گلی پھرنا پڑتا ہے"

"ہم غریب ہیں۔ بھکاری نہیں ہیں۔"

"دونوں میں فرق ہی کیا ہے"

جب نرسنگ کندن لال کے پاس پہنچا تو کندن لال نے کہا۔

"کالی کے مندر کے پچھم میں تمہارے جو کھیت افتادہ پڑے ہیں ان پر ہل کیوں نہیں چلاتے، کاشت کیوں نہیں کرتے۔ ہندوستان کی زمین سونا اگلتی ہے اور تم کسان بھوکوں مرتے ہیں۔ اس کا کیا مطلب؟"

"ہمیں دھرتی سے گلہ نہیں مہراج۔ شکر اس کا ہے کہ مرنے کے بعد وہ ہمیں اپنی گود میں تو جگہ دیتی ہے" زمین کو گھورتے ہوئے بولا۔

"میں جانتا ہوں تمھیں روپیوں کی ضرورت ہے
کندن لال اپنے بھائی نرسنگ کی مدد کے لئے کوئی
کسر اٹھا نہ رکھے گا۔"
نرسنگ ان کے قدموں پر جھک گیا سیٹھ
جی نے اسے اٹھاکر اپنے سینہ سے لگا لیا۔
چند ہی روز میں نرسنگ کے سوکھے کھیت
ہرے ہو گئے۔ اس کے گھر بیلوں کی تین نئی جوڑیاں
بھی آ گئیں۔ اس کی گردن کندن لال کے بیشمار
احسانات سے جھک گئی۔ وہ آدمی نہیں فرشتہ
ہیں، وہ دھن وان ہیں لیکن ان کے سینہ میں
ایسا دل ہے غریبوں کے دکھ سکھ کو پہچانتا ہے
نرسنگ کی زندگی کا بجھتا ہوا چراغ دوبارہ
روشن ہو گیا ——
ایک روز گنیش اس کے گھر آیا۔
"بھولے بھٹکے کدھر آ گئے"۔ نرسنگ نے
تعجب سے پوچھا۔
"کیا کروں فرصت نہیں ملتی۔ آج کل روپئے
اولوں کی طرح برس رہے ہیں۔ جلد جلد سمیٹ
رہا ہوں۔"
"سنبھل کر بھیا۔ اولوں سے بعض وقت
چوٹ بھی لگتی ہے"۔ نرسنگ بولا۔
"اسی ڈر سے تمھارے پاس دوڑا آیا۔
بات یہ ہے کہ میرے پاس اناج بہت جمع
ہو گیا ہے۔ مجھے چوری کا کھٹکا ہے۔ چاہتا
تھا کہ دس بیس تھیلے تمھارے پاس رکھوا دوں"۔
"نہ بابا —— یہاں سے چوری گئے تو منھ کو
کالک لگ جائے"۔
"مفلس کے گھر ڈاکو نقب نہیں لگاتے
نرسنگ"۔
نرسنگ خاموش ہو گیا اور گنیش اسی روز
بنڈی میں تھیلے لاد کر لایا۔ نرسنگ کو ایک
طرف فکر اس کی تھی کہ اب ان کی حفاظت کون
کریگا تو دوسری طرف خوشی اس کی تھی کہ گنیش نے
اس پر بھروسہ کیا ورنہ آج کل دنیا کا خون
اس قدر سفید ہو گیا ہے کہ بھائی بھائی کا بھروسہ
نہیں کرتا۔
ایک روز نرسنگ رادھا سے گپیں ہانکتا
بیٹھا تھا کہ گاؤں کا تھانیدار ادھر آ دھمکا اور
کڑک کر بولا۔
"ہم تیری خانہ تلاشی لیں گے"۔
"دیکھ لو۔ میرے پاس کون سے خزانے
دھرے ہیں"۔
تھانیدار جھونپڑی میں داخل ہوا۔
"ابے ان تھیلوں میں کیا ہے"۔
"چانول ہیں —— سونے کی اینٹیں نہیں"۔
"اچھا بیٹا اب دن دہاڑے ڈاکے مارنے لگے

" کیوں الجھ رہے ہو یہ تھیلے گنیش کے ہیں "

" عذر گناہ بدتر از گناہ "

" تم سمجھتے ہو میں جھوٹا ہوں ؟ رادھا سے پوچھو "

" اہاہا ——— ٹین گر کو صیقل گر کی گواہی "

رادہا کا خون کھول گیا۔ گرج کر بولی۔

" اب جاتا ہے یہاں سے یا ——— "

" اچھا جی چیونٹی کے بھی پر نکل آئے۔ یوں مسل دوں گا " اس نے چیونٹیوں کی لمبی قطار کو رگڑتے ہوئے کہا اور جھونپڑی سے بھاگ نکلا۔

دوسرے ہی روز نرسنگ پر بغیر اجازت غلہ جمع کرنے کے الزام میں دو سو روپیہ جرمانہ عائد کیا گیا۔ بصورت عدم ادائی اس کے کھیتوں کو نیلام کرنے کا بھی قطعی تصفیہ ہو گیا۔ اس پر مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ اس روز وہ کھیت پر نہیں گیا۔ اس کا ہل مردہ کی طرح نیم کے درخت کے نیچے پڑا رہا اور اس کے بیل بھی پیڑ سے بندھے رہے۔ نرسنگ سیدھے گنیش کے گھر پہنچا۔ اس کو یقین تھا کہ گنیش ضرور اقرار کریگا کہ چانول کے تھیلے اسی کے تھے۔ تھانیدار کے دانت جب کیسے کھٹے ہو جائیں گے وہ شرم سے زمین میں گڑھ جائے گا۔ یہی سوچتے سوچتے وہ گنیش کے دروازے پر پہنچا تو قفل لگا ہوا تھا۔

دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ کسی ضروری کام پر شہر گیا ہے۔ وہاں سے وہ کندن لال کے پاس گیا۔ سیٹھ جی کہنے لگے۔

" میں جانتا ہوں تم نردوش ہے۔ کسی کے برا بھلا کہنے سے غم نہ کھانا۔ من صاف ہے تو پھر کس کا ڈر۔ کوئی دن کو رات کہے تو اندھیرا نہیں ہوتا ——— میں تمہارا جرمانہ ادا کر دوں گا "

نرسنگ بیٹھے بیٹھے مسکرا دیا۔ دکھی انسان کی مسکراہٹ اس کے آنسوؤں سے زیادہ دردناک ہوتی ہے۔ اس نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔

" بڑے دیالو ہیں مہراج۔ بڑے دیالو ہیں آپ "

سیٹھ جی کی فیاضی کا گاؤں بھر میں چرچا ہو گیا۔ وہ اوتار بن گئے تھے۔ جب وہ چاوڑی میں آکر بیٹھتے تو ان کے عقیدت مندوں میں روز بروز اضافہ ہی ہوتا جاتا۔ اب نرسنگ بھی ادہا کے ساتھ آنے لگا تھا۔ اسے جنگ کی خبروں سے مطلق دلچسپی نہ تھی وہ صرف اس لئے سنتا تھا کہ سیٹھ جی انھیں سنایا کرتے تھے۔ ایک روز شام کو جب کندن لال حسب معمول چاوڑی میں آکر بیٹھے تو ان کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ مجمع میں ایک سنسنی دوڑ گئی۔ چاروں طرف سناٹا چھا گیا۔

" بھائیو اور بہنو ——— مجھے آج تمہاری

بہادری کا امتحان لینا ہے۔ پہاڑوں کے اپنے
مضبوط ہاتھوں سے پرزے اڑانے والو آج
مجھے یہ بتا دو کہ تمہارے دل پتھر سے زیادہ مضبوط
ہیں۔ ناکام زندگی پر لعنت بھیجنے والے ہونٹوں
کو یہ سکھا دو کہ کسی کی کامیاب موت کی خبر سن کر
مسکرا دیں"

سیٹھ جی فرطِ جذبات سے خاموش ہو گئے
ہر ایک اس معمہ کو حل کرنے لگا ـــــ نرسنگ بھی
سوچ رہا تھا اور رادہا بھی سوچ رہی تھی۔

نرسنگ سوچ رہا تھا۔

"کون مرا ہوگا؟ گنیش تو نہیں۔ دو روز میں
شہر سے واپس آنیوالے ابتک نہیں آیا۔ کیا
بات ہے؟ گنیش ہی ہوگا اسی لئے تو کندن لال
اتنے اداس ہیں ـــــ اچھا ہی ہوا جو چتا اس نے
میرے لئے تیار کی تھی خود اس کے کام آئی"

رادہا سوچ رہی تھی۔

"کون ہوگا بیچارہ؟ گردہاری تو نہیں؟
نہیں نہیں!! مریں اس کے دشمن وہ مر نہیں سکتا
کندن لال نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"گردہاری مر گیا!"

سننے والوں کو سانپ سونگھ گیا۔ ان کے
ہونٹ کھلے رہ گئے آنکھیں زور زور سے جھپکنے
لگیں۔ سانس پھول گئی۔ نرسنگ رادہا کی طرف
پلٹ کر بولا۔

"ہونہہ! اس کے مرنے کے دن تھے اور ہمارے
جینے کے دن ہیں۔ واہ ری قسمت واہ"

"باپو چلو اب گھر چلیں" رادہا اس کو
اٹھاتے ہوئے بولی۔

گھر پہنچنے کے بعد نرسنگ پھوٹ پھوٹ کر
رونے لگا۔

"اے بھگوان ـــــ اے بھگوان۔ ان آنکھوں
سے اور کیا کیا تماشا دکھائے گا"

رتنا کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"مجھے دیکھو ـــــ کیا میں بھی تمہاری طرح
رو رہی ہوں۔ اور گردہاری اپنا لگتا بھی کون تھا؟"

نرسنگ جانتا تھا کہ اس کے آنسوؤں سے
بہت زیادہ آنسو رادہا کے الفاظ میں کانپ رہے
تھے۔ اس کو معلوم تھا کہ رادھا کے قہقہوں میں
دہکتی ہوئی آہیں چھپی ہوئی تھیں ـــــ

دن گذرتے گئے اور گاؤں کا ایک شگفتہ
پھول تیزی سے کمہلانے لگا۔ نرسنگ نے ایک
روز کندن لال سے کہا۔

" نہ جانے رادہا کو کیا ہو گیا ہے۔ سوکھ کر بانس
کی نلی ہو گئی ہے۔"

"گھبراؤ مت۔ بانس کی نلی سے بنسری بنائی
جا سکتی ہے"

"کیا مطلب؟" نرسنگ اپنی دھنسی ہوئی آنکھیں گھما کر بولا۔

"شادی کر دو۔"

"کرنے کو تو آج کر دوں مگر اچھا بَر نہیں ملتا ایک گردہاری تھا سو وہ بھی ——— !"

مرنے والوں کے لئے کوئی کب تک روتا ہے جینے والوں کی فکر کرنی پڑتی ہے۔"

"یہ سچ ہے لیکن بیاہ رچانے کے لئے روپے بھی تو نہیں۔"

"کسی امیر کو ڈھونڈو۔ امیروں پر جب شادی کی دھن سوار ہوتی ہے تو حسن نہیں دیکھتے حسن دیکھتے ہیں۔"

"لیکن امیروں سے ہمارا کیا جوڑ۔ نہیں مہراج کمبل میں ریشم کا پیوند اچھا نہیں لگتا۔"

کندن لال کو اس کے آگے کچھ کہنے کی ہمت نہ ہوئی۔

رادھا رات کو بہت دیر تک روتی رہی۔ نرسنگ سو رہا تھا۔ اس کے خراٹوں سے جھونپڑی کی خاموش فضا لرزہ بر اندام تھی۔ آہستہ سے کسی نے پکارا۔

"رادھا!"

وہ چونک پڑی۔ اسے معاً سیٹھ جی کا خیال آیا، مگر آواز ان کی نہ تھی۔ گردھاری کی آواز تو نہیں ——— مگر وہ تو سورگ باش ہو چکا ——— نہیں نہیں ——— وہ لڑائی سے ضرور واپس آئیگا ——— انہی اُلجھے ہوئے خیالات کا چکر اس کے دل و دماغ میں تیزی سے گھوم گیا۔ وہ اسی ادھیڑبن میں تھی کہ پھر آواز آئی۔

"رادھا"

"کون؟"

"گردھاری"

"میری قسم"

"ہاں"

"اندر آؤ"

ایک سایہ اندر داخل ہوا۔ رادھا نے دیا جلایا۔ مدہم روشنی میں ایک دوسرے کو دونوں بہت دیر تک گھورتے رہے ——— گھورتے رہے۔ ——— ان کی پلکوں پر آنسو رقص کرنے لگے اور ناچتے ناچتے تھک گئے۔

"تو کتنی بدل گئی رادھا"

"پر دل نہیں بدلا میرا"

دو قالب لپٹ کر ایک ہو گئے ———

صبح کو جب رادھا نیند سے بیدار ہوئی تو اس کی آنکھوں میں خمار تھا۔ ان میں خوف کی ایک پتلی سی لکیر بھی تھی۔ رات کو اس نے جو کچھ دیکھا وہ خواب نہیں تھا خواب کی تعبیر تھی اس کے

باوجود اس کا دل یقین نہ کرتا تھا۔ آخر اس نے سوچا کہ اگر وہ خواب ہی تھا کہ اگر وہ خواب ہی تھا تو نرسنگ سے اس کا ذکر کرنا چاہئیے۔

" باپو! رات میں نے گردھاری کو خواب میں دیکھا "

نرسنگ پریشان ہو گیا۔ رادھا کو ایسا خواب کیوں نظر آیا۔ گردھاری مر چکا ــــ مردے تو مرنے والوں کے خواب میں آتے ہیں ــــ پھر؟ میری رادھا!!!

وہ آپ آنسو ضبط نہ کرسکا۔ فوری جھونپڑی سے باہر آیا۔ اسے گردھاری آتا دکھائی دیا۔ نازک سی پگڈنڈی اپنی کمر لچکاتی اس کے پیچھے دوڑتی ہوئی آرہی تھی۔ اس نے اپنے آنسو پونچھ ڈالے اور بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

" رادھا! ذرا یہاں آنا ــ دیکھ تو وہ کون آرہا ہے۔

" میرے سپنے کی تعبیر "

نرسنگ کے ضعیف رگ پٹھوں میں پھر جوانی کا خون دوڑ گیا۔ وہ دوڑکر گردھاری کو اپنے سینہ سے چمٹا لیا۔

" گردھاری تم آگئے ــــ بہت دن انتظار کروایا تم نے۔ کیا بڑی لڑائی ختم ہو گئی "

بڑی لڑائی کا حال نہیں معلوم ــ ہاں میری لڑائی ختم ہو گئی۔ یہاں سے تھوڑی دور ایک ویرانے میں مجھے دشمن نے قید کر دیا تھا۔ میری حالت اس پنچھی کی سی تھی جس کو پنجرے میں بند کرکے اس کے گھونسلے کے سامنے اس کا پنجرہ لٹکا دیا جائے۔ میں نے بھاگ نکلنے کی کوشش کی مگر بھاگ نہ سکا۔ گنیش ایک روز میرے پاس آیا اور کہنے لگا۔ تم دیوار کو ٹکر مارکر گرانا چاہتے تھے۔ لیکن خود گر گئے۔ کندن لال سے مقابلہ کرنا چاہتے تھے۔ گائے بھی کہیں شیر کا مقابلہ کرسکتی ہے۔ رادھا تمہاری بیوی نہیں بن سکتی نرسنگ اب اسے کندن لال سے بیاہنے پر مجبور ہو گیا ہے۔ مچھلی کے حلق میں گل پھنس چکی ہے۔ یہ خبر سن کر میں بے چین ہو گیا۔ اس کے بعد میں کس طرح بھاگ نکلا یہ میں تمھیں پھر کبھی سناؤں گا۔ بھگوان کی کرپا ہے کہ جان بچی لاکھوں پائے "

اس قصہ کو سن کر نرسنگ کی آنکھیں کھل گئیں۔ جس کو پارس سمجھا وہ پتھر نکلا۔ جس کو اس نے اپنا عصا سمجھا اسی نے اس کا بچھو مر نکال دیا نرسنگ جذبات کے سیلاب میں خس وخاشاک کی طرح بہہ نکلا۔ اس نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے لاٹھی سنبھالی اور گاؤں کی طرف جانے لگا۔

" کہاں جارہے ہو؟ " گردھاری نے پوچھا

" اس سر کو پھوڑنے جس میں اتنی حرامزدگی بھری ہے "

"واپس آؤ چاچا — غیب کی لاٹھی تمہاری لاٹھی سے زیادہ مضبوط ہوتی ہے۔"

"نہیں گردھاری اب صبر نہ ہوگا۔"

"تم بھول رہے ہو ہم غریب صبر کے سوا کر بھی کیا سکتے ہیں۔"

گردھاری کی واپسی کی خبر گاؤں بھر میں پھیل گئی سیٹھ جی کی عیاریوں کا بھی بھانڈہ پھوٹ گیا۔

ایک رات کو کندن لال کے مکان میں آگ لگ گئی۔ غریبوں کا حق مار کر جمع کی ہوئی دولت اور ذخیرہ کئے ہوئے اناج کے ساتھ سیٹھ جی بھی جل کر راکھ ہو گئے۔ سارا گاؤں ان کی مہاڑی سے بلند ہوتے ہوئے شعلوں کو دیکھ رہا تھا۔ جب آگ ٹھنڈی ہوئی تو بے شمار دلوں میں بھڑکتے ہوئے انتقام کے شعلے بھی بیٹھ گئے۔

شوکت علیخاں ایم۔ اے

شہاب کے حسب ذیل پرچوں کی ضرورت ہے قیمتاً۔ لطفتاً۔ مرحمتاً۔ عنایتاً دے۔

امرداد ۱۳۴۲ف۔ آبان ۱۳۴۴ف

آذر۔ دے۔ بہمن۔ تیر۔ امرداد۔ شہریور۔ مہر۔ آبان بابتہ ۱۳۴۵ف

ترقی پسند ادب

جناب عطارد صاحب

اُردو کانگریس کا ابتداً جب اعلان ہوا تو سمجھا کہ اس کانگریس میں صرف لیتھو پریس کے مشکلات۔ زبان اردو کی ترقی و ترویج اور ٹائپ کے رواج جیسے مسائل مہمہ پر بحث ہوگی مگر کانگریس کے اجلاس میں کسی نے "صوتی اعتبار سے زبان اردو کو بہتر بنانے" کی محیر العقول تحریک پیش کی اور ترقی پسند ادب پر سجاد ظہیر صاحب نے ایک بسیط خطبہ پڑھا جو میرے لئے فی الحقیقت جاذب توجہ ثابت ہوا۔ ترقی پسند مصنفین اور ترقی پسند ادب پر جو لوگ الزام لگاتے اور شبہات پیش کرتے ہیں اون کا مسٹر سجاد نے بہت تفصیلی جواب دیا اور بتایا کہ اس ادب کا مطمح نظر صرف یہ ہے کہ اردو نظم و نثر میں ایسے مضامین لکھے جائیں جو ابنائے ملک کی بھوک۔ افلاس۔ سستی اور غلامانہ ذہنیت کا مداوا اور ملک و قوم کے لئے حصول آزادی کا راستہ صاف کر سکیں۔ ان مسائل یا ان موضوعات پر بحث میرے مقصد سے خارج ہے کیونکہ یہ سب سیاسی مسائل ہیں اور میں اُن سے ناواقف ہوں۔ میں تو صرف ادبی نقطۂ نظر کو واضح کرنا چاہتا ہوں۔

سیاسی مسائل کے ذکر پر اس وقت ایک بات یاد آگئی عرصہ ہوا کسی مصری رسالہ کے حوالہ سے مولانا ابوالکلام آزاد نے الہلال میں لکھا تھا ہندوستان میں

"سیاست آسان تر کام ہے کیونکہ کسی اصول وقواعد کا
علم اوس کیلئے ضروری نہیں۔ لوہاری۔ نجاری۔ جلد سازی۔
نعل بندی حتی کہ حجامت بھی سیاست سے مشکل ہے کیونکہ
یہ تمام پیشے اپنے مقررہ اصول وقواعد رکھتے ہیں جس کے جانے
بغیر کوئی آدمی اُنہیں اختیار نہیں کرسکتا لیکن سیاست کی
حالت اس سے بالکل مختلف ہے جس لمحہ چاہو سیاسی ہونے
کا اعلان کردے سکتے ہو اور سیاست کے نام سے جو بکواس بھی
چاہو بلا تامل کرسکتے ہو۔" ترقی پسند مصنفین کا موضوع سخن
سیاسی ہے تو مجھے اعتراض کا کوئی حق نہیں مگر غور طلب امر
یہ ہے کہ ہندوستان جیسے ملک میں جہاں تعلیمی حالت ابھی
پستی میں ہے نیم تعلیم یافتہ یا جہلا میں ایک گروہ غیر ذمہ دارانہ
طریق سے وقت بیوقت موقع بے موقع آزادی کا ڈنکا
بجایا کرے تو کیا اوس سے کوئی قومی سیاسی یا ادبی
مفید نتیجہ برآمد ہوسکیگا؟ تجربہ اور مشاہدہ بتاتا ہے کہ
آزاد ممالک میں بھی آزادی کی فراوانی اور اس کے بیجا
استعمال سے نتائج بد پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ افلاطون
نے اپنی کتاب جمہوریت میں ایک موقع پر لکھا ہے کہ ڈیمو
کریٹک یا جمہوری حکومت میں جب صہبائے آزادی
کا نشہ ضرورت سے زیادہ ہوجاتا ہے تو اس کا رد عمل
ظلم واستبداد کی شکل میں نمودار ہوتا ہے بیٹا باپ کی
اور شاگرد استاد کی عزت نہیں کرتا باپ بیٹے سے اور
استاد شاگرد سے خائف رہتا ہے۔ ہندوستان میں
شراب آزادی کی تو تلچھٹ بھی پوری طرح نہیں کہلیں لیکن
محض اوس کی بو نے کم عمر لڑکوں اور نوجوانوں کو قبل از
قبل ایسا سرشار کردیا کہ افلاطون کا مقولہ ہندوستان
میں حرف بہ حرف ثابت ہوگیا۔

ترقی پسند ادب کے ہوا خواہوں نے ایک
افسوسناک طریقہ اختیار کر رکہا ہے قابل احترام شعرائے
متقدمین ومتاخرین کے کلام کی مذمت اون کا عجیب
مشغلہ ہے۔ فحاش اور رجعت پسند جیسے مذموم خطابات
اون کو دئے جاتے ہیں مجھے قاضی عبدالغفار صاحب ایڈیٹر
پیام جیسے مشہور ادیب سے شکایت ہے کہ انھوں نے بھی متقدمین
ومتاخرین شعرا کے کلام کو فحش نگاری سے موسوم کیا اور
پیام کے اداریہ مورخہ ۴ شعبان ۱۳۶۳ھ میں لکھا کہ "جو لوگ
اس تحریک کی (ترقی پسند ادب کی) مذمت کرتے ہیں وہ
قدیم رجعت پسند ادیبوں کے ڈگر پر چلتے ہیں جنھوں نے
محض لذت کی خاطر فحش نگاری کی ہے اور جو آج بھی
معشوق کی کمر کو کم کرتے کرتے غائب کردیتے ہیں اور
جسم کے ایک ایک عضو کو اس طرح پیش کرتے ہیں کہ اگر
ان اعضا کو جوڑا جائے تو ایک ایسا ڈھانچہ بنے گا جسے
کوئی معقول شخص انسان بھی نہیں کہہ سکیگا" قاضی صاحب
مجھے معاف فرمائیں اگر میں عرض کروں یہی ناواقفیت ہے جس نے
شاعری کا نام ڈبویا اسی لئے مولانا شبلی رح نے کہا ہے کہ
"آج کل جس چیز کا نام شاعری ہے اوس سے شاعری کو کچھ تعلق نہیں
علم بیان ومعنی کے کسی ابتدائی رسالہ کو جو کوئی بغور سمجھ کر
پڑھے گا اوس کی رائے ادب و شعر کے متعلق یقیناً آپ کی رائے سے

بالکل مختلف ہو گی۔ اس سے کس کو انکار ہو سکتا ہے کہ شاعری میں تشبیہ و استعارہ مجاز و کنایہ حسن کلام کا باعث اور سامعین پر اثر و انفعال پیدا کرنے کا موجب ہوتا ہے۔ مبالغہ اغراق و غلو بھی ادب شعر کی ایک صنعت ہے جو لوگ فن بیان و معنی سے ناواقف ہیں وہ سعدی حافظ۔ نظامی خسرو۔ ظہیر وغیرہ نامی گرامی شعرائے فارسی کے کلام کو بھی فحش اور رجعت پسندی کا نمونہ ہی قرار دیں گے ع کہ اہل شوق علوم اند و گفتگو عربی است" شکایت کا یہ محل نہیں ایسے لوگ ہر زمانہ ہر عہد میں ہوتے ہیں چنانچہ آج سے تخمیناً سو سال قبل مولف حدائق البلاغت نے لکھا ہے کہ "دریں عصر کہ از علم و حکمت نامے و از فضل و ہنر نشانے بر جا نماندہ جمعے کہ در زشت و زیبا فرق نمی کنند و لعل از خارا باز نمی دانند بمحض تالیف الفاظ بر وزنے کہ دست فکرت شان از دامن میزانش کوتاہ است علم دعوی ایں فن برمی افرازند و کلاہ نخوت و غرور بر آسمان می اندازند شبہ بمقدار خود را ہم سلک گوہر شاہوار می شمارند و سفال ریزہ بیقدر خویشتن را در برابر لعل بدار بجلوہ می آرند"۔ حالانکہ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ عربی فارسی کے علما۔ فضلا اور شعرا کی کمی نہ تھی آج جبکہ فارسی کا زمانہ ختم ہو چکا علوم مشرقی کی قدر نہ رہی فارسی سے واقف چند ہی بزرگوار ہوں گے ایسے زمانہ میں اگر قابل عزت شعرا پر رجعت پسندی اور فحش گوئی کا الزام لگایا جائے تو تعجب کی کیا بات ہے جس چیز سے ہم واقف نہیں جس کا ہمیں مذاق نہیں اس کی نسبت اس کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے۔ اردو کے شعرا فارسی کے خوشہ چین ہیں اردو کی بنیاد خود فارسی پر ہے جب فارسی کا مذاق نہ رہا تو اردو میں بھی بد مذاقی پیدا ہو گئی۔ کہتے ہیں مصوری۔ موسیقی اور شاعری آرٹ ہیں آخر ان تینوں میں مشترک چیز کیا ہے؟ وہ صرف اثر و انفعال ہی ہے جو دیکھنے اور سننے والے پر طاری ہوتا ہے مگر اب ہماری بد مذاقی کا یہ عالم ہے کہ ہم سینما کی موسیقی پر دل باختہ اور "چل چل چل رے نوجوان" جیسی شاعری پر فریفتہ ہیں حالانکہ صحیح معنی میں وہ موسیقی ہے نہ شاعری۔

جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا ہے ترقی پسند ادب کے موضوعات سے مجھے غرض نہیں شاعری کے واسطے کسی خاص موضوع کی ضرورت ہی کیا ہے شاعر تو محض اپنے فیلنگس اور جذبات کو ایسے الفاظ میں ظاہر کرتا ہے جس سے سامع پر بھی انفعالی کیفیت طاری ہو جائے شاعری ایک وجدانی کیفیت کا نام ہے جذبات مختلف ہوتے ہیں غم اور خوشی کا اثر سب پر ہوتا ہے مگر یہ تفاوت شاعری انسان کے جملہ حواس پر اثر انداز ہوتی ہے جس شعر سے جذبات برانگیختہ نہ ہوں اوس کو شعر کہنا ہی غلط ہے اب میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ شاعر نے جس موضوع سے اپنے فکر و تخیل کا گلدستہ بنایا اوس میں کچھ رنگ و بو بھی ہے یا نہیں۔ آئیے اب اس کلیہ کے تحت شعرائے ترقی پسند ادب کے کلام کا تجزیہ کر کے دیکھیں کہ کسوٹی پر کونسا شعر پورا اترتا ہے۔ یہ بات بھی ذہن نشین رہے کہ جس زبان میں شعر کہا جائے اوس زبان کے الفاظ و محاورات کی صحت حسن بیان اور طرز ادا میں جدت نہ ہو تو وہ شاعری نہیں تک بندی ہو گی۔

مسٹر سجاد ظہیر نے اپنے پسندیدہ چند منتخب شاعروں کے کلام کا نمونہ بھی اپنے خطبہ میں پیش کیا ہے ان میں صرف دو شاعروں کی تصنیف یعنی مخدوم محی الدین صاحب کی سرخ سویرا اور

فیض احمد صاحب کی کتاب نقش فریادی میری نظر سے
گذر چکی ہے۔ مخدوم صاحب فرماتے ہیں۔

امت مرحوم ہو یا ملت زنار دار!
آنکھ فاقوں کی نہ گنتی ہے نہ لاشوں کا شمار
مرد وزن شیخ و برہمن سب قطار اندر قطار
آہ سوکھی چھاتیوں کی چیخ بچوں کی پکار

دوسرے مصرعہ میں مبالغہ نہیں اغراق ہے معلوم نہیں
اس کی نسبت قاضی صاحب کی کیا رائے ہوگی۔ دوسرے شعر کا مصرعہ
اولی نامکمل ہے جس میں کوئی فعل ہی نہیں اور نہ یہ موقع فعل کو حذف
کرنے کا تھا۔ دونوں مصرعوں میں معنوی ربط بھی نہیں "سوکھی
چھاتیوں کی چیخ" بے معنی ہے کوئی چھاتیوں سے چیختا چلاتا
نہیں مسٹر سجاد ظہیر نے صرف یہی دو شعر پیش کئے اس وقت
سرخ سویرا میرے پاس نہیں ہے ورنہ دو چار شعر اور پیش کرتا سبط حسین
صاحب رکن ادارت "قومی جنگ" کا ایک خط سرخ سویرے میں طبع
ہوا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حیدرآباد کے کسی جلسہ میں مخدوم محی الدین
نے ایک نظم پڑھی اس محفل میں سبط حسین کے قریب قاضی عبدالغفار صاحب
بھی تشریف فرما تھے سبط حسین اپنے خط میں مخدوم محی الدین
کو لکھتے ہیں "جب تم اس مصرعہ پر پہنچے ع خدا بھی مسکرا
دیتا تھا جب ہم پیار کرتے تھے۔ تو میں نے قاضی صاحب سے
کہا تھا دیکھئے ہمارے نوجوان شاعر میں محبت کا کتنا
پاکیزہ اور معصوم تصور پیدا ہو رہا ہے اور انھوں نے
جواب دیا تھا کہ خدا اس نئی پود کو پروان چڑھائے جو
خدا کے سامنے پیار کرنے سے نہیں جھجکتی اور جن کا
خدا بھی اتنا شفیق اور مہربان ہے کہ محبت کے اس معصوم مظاہرے
پر خوش ہوتا ہے" اس کا ذکر ضمناً یہاں اس لئے کیا کہ فکر شعر
کے ساتھ شاعر اور مداحان شاعر کے عقاید مذہبی پر بھی
کچھ روشنی پڑے۔

مسٹر سجاد ظہیر نے فیض احمد فیض کے چند اشعار بھی
بطور مثال پیش کئے ہیں "نقش فریادی" اس وقت
میرے میز پر موجود ہے۔

دل کے ایوان میں لئے گل شدہ شمعوں کی قطار
نور خورشید سے سہمے ہوئے اکتائے ہوئے
حسن محبوب کے سیال تصور کی طرح!
اپنی تاریکی کو بھینچے ہوئے لپٹائے ہوئے

حسب بیان مسٹر سجاد "یہ متوسط طبقہ کی مایوسی
حزن اور یاس کی تصویر ہے" اس تصویر کے خد و
خال پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے شاعر نے دل
کو ایوان قرار دیا مگر "گل شدہ شمعوں کی قطار"
کس چیز سے عبارت ہے اس کا مفہوم کیا ہے کوئی
استعارہ ہے تو یہاں معنی موضوع لہ کی دلالت
کا کوئی قرینہ نہیں قطع نظر اس کے اردو میں "قطار
لینا" نہیں بولتے یہ اردو کی زبان نہیں ہے۔ "سہمے
ہوئے اور اکتائے ہوئے" سے مراد "متوسط طبقہ"
ہوگا مگر "نور خورشید سے کسی انسان کا ڈرنا اور اکتانا
ہماری سمجھ میں نہ آیا۔ رقیق یا بہتی ہوئی چیز کو "سیال"
کہتے ہیں لیکن تصور کو سیال نہیں کہہ سکتے تصور کیلئے

سیال نہ تشبیہ ہے نہ صفت۔ "بھینچنا اور لپٹانا" مادی چیز کے واسطے استعمال کیا جاتا ہے تاریکی کو بھینچنا اور لپٹانا اُردو میں نہیں بولتے یہ مضحکہ خیز غلطی ہے۔

سرمائے کے سمٹے ہوئے ہونٹوں کا تبسم
مزدور کے چہرے کی تھکن ہے کہ نہیں
وہ زیر زمین صبح کی ہلکی سی سپیدی
ڈھلتے ہوئے تاروں کا کفن ہے کہ نہیں
پیشانی افلاس سے جو پھوٹ رہی ہے
اٹھتی ہوئی سورج کی کرن ہے کہ نہیں!

مسٹر سجاد کہتے ہیں" سرمایہ دار اور مزدور کی کشمکش میں خیات نو کی نشانیاں اس طرح ڈھونڈ نکالا ہے" ان عجیب وغریب اشعار میں تشبیہ، استعارہ مجاز وکنایہ کے اصول وقواعد سے بے نیاز ہو کر سرمایہ کو ایک شخص فرض کر لیا ہونٹ ہیں تو تبسم بھی لازم ہے اور یہ سب کچھ کیا ہے صرف" مزدور کے چہرے کی تھکن" کا عکس ہے۔ کیا خوب! مزدور کے چہرے کی" تھکن" کو سرمائے کے ہونٹوں کا تبسم قرار دینا ترقی پسند ادب کا اعلیٰ کارنامہ ہے۔ تھکن کا لفظ فصحاء نہیں بولتے دیہات میں بولتے ہیں تو عجب نہیں۔ دوسرے شعر میں صبح کی سپیدی کو تاروں کا کفن کیوں قرار دیا گیا سرمایہ دار اور مزدور کی کشمکش میں غریب تاروں نے کیا قصور کیا جن کو کفنانے دفنانے کی ضرورت داعی ہوئی ہماری سمجھ میں تو کچھ نہ آیا۔

افق تو کنارہ آسمان کو کہتے ہیں افق کے لئے زیر و بالا کی قید بھی فضول ہے۔ تیسرے شعر میں" افلاس" کو پھر ایک شخص فرض کر لیا مگر یہ نہیں کہلاتا کہ" پیشانی افلاس" سے کیا چیز پھوٹ رہی ہے جس کو" اٹھتی ہوئی سورج کی کرن" کہا گیا ہے۔ کیا اسی قسم کی شاعری کو ترقی پسند ادب کی شاعری کہا جاتا ہے نقش فریادی سے دو ایک شعر اور پیش کرتا ہوں ایک نظم کا عنوان ہے" تہہ انجم" اس نظم کا ایک شعر ہے۔

چھلک رہی ہے جوانی ہر اک بن مو سے
رواں ہو برگ گل تر سے جیسے شمیم!

"چھلکنا" بجیم فارسی کسی ظرف میں سیال چیز کے لب ریز ہونے کو کہتے ہیں۔ بن مو کو ظرف اور جوانی کو سیال شئی قرار دیا گیا بن مو سے جوانی اس طرح بہہ رہی ہے جیسے پھول سے بو۔ یہ سب ایسی باتیں اور ایسی تشبیہیں ہیں جو دوسروں کے فہم وادراک سے باہر محاورہ زبان اور علم بیان سے خارج ہیں۔ ایک اور نظم ہے جس کا عنوان ہے" تنہائی" اس میں سے بھی صرف ایک ہی شعر پر اکتفا کرتا ہوں۔

ڈھل چکی رات بکھرنے لگا تاروں کا غبار
لڑکھڑانے لگے ایوان میں خوابیدہ چراغ

غبار بکھرنا اردو میں نہیں کہتے۔ لڑکھڑانا کے معنی ہیں لغزش پا یا ضعف۔ ناتوانی یا نشہ میں پاؤں کا بے قابو ہونا لہٰذا" چراغ لڑکھڑانا" بھی قطعاً

غلط ہے خوابیدہ چراغ بھی ایک نیا محاورہ مصنف کا ایجاد ہے۔ نقش فریادی سے ایسی بیشمار مثالیں پیش کیجا سکتی ہیں زبان و بیان کی حقیقت اور اشعار کی لطافت کا اندازہ کرنے کے لئے جو کچھ پیش کیا گیا وہ بہت کافی ہے۔

آخر میں یہ عرض کرنا بھی ضرور ہے کہ ترقی پسند مصنفین میں بلاشائبہ شک کئی ایک لائق نثار اور قابل شاعر ہوں گے بدقسمتی سے مجھے صرف دو ہی شاعروں کے کلام سے لطف اندوز ہونے کا موقع ملا اور انہیں کے کلام پر بلا رو رعائت اور بلا خوف لومۃ لائم اپنے خیالات کا اظہار کیا ان دونوں شاعروں کے علم و فضل سے بھی مجھے انکار نہیں بات صرف یہ ہے کہ شاعری کو آج کل آسان فن سمجھ لیا گیا جس کے لئے کسی ماہر فن کے مشورہ کی ضرورت نہیں سمجھی جاتی نتیجہ اوس کا یہ ہے کہ میدان سخن گوئی میں اشہب فکر و تخیل ٹھوکریں کھاتا ہے اس خصوص میں مولوی محمد حسین آزاد کی رائے یاد رکھنے کے قابل ہے۔ فرماتے ہیں "شعر شاعری کا کوچہ جہان سے نرالا ہے جو لوگ ذہن کے بھدے ہیں ان کے لئے تو استاد کی محنت برباد ہے مگر یاد رہے جس قدر مبتدی زیادہ تیز و طباع ہو اتنا ہی زیادہ استاد کا محتاج ہے جیسے ہونہار بچھیرا کہ اچھے چابک سوار کے کوڑے تلے نکلتا ہے جب ہی جوہر نکالتا نہیں تو بے ڈھنگے ہاتھ پاؤں مارتا ہے بلکہ بدخو ہو جاتا ہے اس طرح تیز اور نوجوان طبیعت زبردست استاد کے قلم کے نیچے نہ نکلے تو گمراہ ہو جاتی ہے"

غزل

نقاب رخ کوئی سرکا رہا ہے۔
در فردوس کھلتا جا رہا ہے

ترے قرباں کہ تیرا ہر ارادہ
مری تقدیر بنتا جا رہا ہے

حیات و موت میں اک کشمکش ہے
معمہ اور الجھا جا رہا ہے

مصیبت کی یہ گھڑیاں بھی عجب ہیں
مرا دشمن مجھے سمجھا رہا ہے

نگاہ واپسیں نے کہدیا کیا
کوئی بالیں سے اٹھ کر جا رہا ہے

تمہارے ظلم کا ممنون ہوں میں
بتو مجھ کو خدا یاد آ رہا ہے

شمیم آئے ہیں وہ تسکین دینے
مگر دل ہے کہ بیٹھا جا رہا ہے

نبی الحسن بی اے شمیم

بہ سرپرستی
محترمہ بیگم نواب مہدی یار جنگ بہادر
صدر المہام تعلیمات
شہاب
ناہید

ناہید

جلد آبان ۱۳۵۳ف م ستمبر ۱۹۴۴ع نمبر ۱۲

۱- مریخ - بشیر بانو کا مطالعہ ہے اس کی نسبت ابتک کئی تحقیقاتیں ہو چکی ہیں لیکن کوئی نظریہ طے نہ ہو سکا، مگر یہ ضرور ہے مستقبل میں شاید نتیجہ خیز ثابت ہو کیونکہ ایک جماعت اس کے حل میں مصروف ہے۔

۲- نظم عاری - اور جھینا دونوں موزوں نام ہیں غالباً یہ ماضی کی جانب اشارہ ہے۔

۳- غم - صغرا عبد السبحان نے بہت عرصہ بعد لکھنا شروع کیا ہے واقعہ یہ ہے کہ انہیں بعض صدمات انگیز کرنے پڑے ہیں۔ ۴- تشطیر - آپ جانتی ہیں کہ سوائے سعیدہ منظر کے کون لکھیں گی۔ ۵- بھلا بوجھے - دوسری قسط ہے - غالباً اب عقدہ کھل گیا کہ یہ تمہید ہے مرحومہ سعادت کے یاد کی - جو کچھ لکھا ہے خوب لکھا ہے - ۶- میری کامیاب زندگی - تاباں نے بالکل صحیح مشورہ دیا ہے - جنھیں اپنا مستقبل پیش نظر ہے اس گر کو یاد رکھیں - ورنہ عموماً گھریلو زندگی کی ابتدائی خرابیاں اسی سے شروع ہوتی ہیں ۷- بھونرے - نیر کی عکاسی ہے - ۸- چنبیلی کی کلیاں - شگفتہ ہوئی ہیں محمودہ رضویہ کے قلم سے - (ب)

مریخ

بشیر بانو

سورج کے اطراف یوں تو بہت سے سیارے گھومتے ہیں۔ مگر بعض بہت بڑے اور شاندار ہیں اور بعض بالکل چھوٹے۔ ہماری زمین کے جو حالات ہیں، تقریباً وہی حالات مریخ کے بھی ظاہر ہوئے ہیں اگر یہ فرض کرلیا جائے کہ مریخ پر انسان نہیں بستے تو یہ سمجھنا بہت مشکل ہے کہ وہاں پر پھر بادل کیوں اٹھتے ہیں۔ اور بارش کیوں ہوتی ہے۔ اگر اس بارش کا قلیل حصہ بھی وہاں کسی جاندار کیلئے مفید ہو تو ہم جان سکتے ہیں کہ بادلوں کا اٹھنا۔ دریاؤں کا بہنا اور بارش کا برسنا ضائع نہیں ہوتا۔

مریخ ایک سیارہ ہے جس کا قطر پانچ ہزار میل ہے یعنی زمین سے کچھ چھوٹا۔ اس کی کثافت اضافی زمین کی تین چوتھائی ہے۔ اور جاذبہ کی کمی کی وجہ سے وہاں ایک معمولی آدمی بھی بارہ یا پندرہ فیٹ آسانی سے اچک سکے گا۔ مریخ سورج سے روشنی اور گرمی کسی قدر کم حاصل کرتا ہے اس کا سال ہمارے حساب سے (۶۸۷) دن کا ہوتا ہے اور دن ہمارے حساب سے کچھ بڑا۔ اگر چاند کو مستثنیٰ کیا جائے تو دوربین کے ذریعہ مریخ کا جتنا مشاہدہ کیا گیا ہے اتنا کسی سیارے کا نہیں کیا گیا۔ سب سے نمایاں چیز اس کا سرخ رنگ ہے۔ لیکن اس کے قطبین پر سفید دائرے نظر آتے ہیں۔ بعض ہیئت دانوں کا خیال ہے کہ وہاں کے نباتات سرخ ہیں جس کی وجہ سے وہاں کے موسم بہار میں سرخی بڑھ جاتی ہے اور گرما میں کم ہوجاتی ہے اور قطبین پر جو سفیدی نظر آتی ہے وہ برف کی ہے۔ اسی لئے سرما میں زیادہ ہوجاتی ہے اور گرما میں کم۔ دوربین کے ذریعہ یہ بھی معلوم کیا گیا ہے کہ اس کے اطراف ہوا کا ایک کرہ ہے جس میں اکثر بادل تیرتے ہیں۔ بادل کے وجود سے یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ اس میں سمندر اور دریا بھی ہوں گے اور بارش بھی ہوتی ہوگی۔ زمانہ جدید کی دوربینوں کی مدد سے اتنی ترقی ضرور ہوگئی ہے کہ مریخ کے تمام سمندر اور براعظم علیحدہ علیحدہ معلوم کرلئے ہیں اور ہر ایک کو نام بھی دیدیا گیا ہے۔ ان بادلوں کے آنے اور جانے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہاں پر ہوائیں بھی چلتی ہیں اور ان میں گرمی اور سردی کا نظم بھی موجود ہے براعظموں اور سمندروں کی وجہ سے ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ وہاں آتش فشان اور زلزلے اپنا کام برابر کرتے ہوں گے۔ اس لئے پہاڑوں دریاؤں

اور وادیوں کا پایا جانا بھی ضروری ہے - اور ہماری زمین
پر جو سمندر پر گرتا ہوگا اور چھوٹے چھوٹے ندی نالے
ان دریاؤں میں آکر گرتے ہوں گے - وادیاں زرخیز
ہوتی ہوں گی- آخر ان سب چیزوں سے ہم کیا نتیجہ
اخذ کرسکتے ہیں؟ یہ سب خیالی تصویریں تو ہیں نہیں
بلکہ سنجیدہ علما، بہت ہی غور و خوض اور سالہا سال
کے مشاہدے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ مریخ پر
بھی وہ تمام چیزیں موجود ہیں جو ہماری زندگی کے
معیار سے ایک زندہ مخلوق کے لئے ضروری ہیں
مثلاً تری، خشکی، پہاڑ. وادیاں، بادل اور دھوپ
بارش اور برف دریا و جھیلیں، ہوا اور پانی کے
رو وغیرہ۔ پھر ہم کیوں کر یقین کریں کہ اس مکمل دنیا
میں کوئی مخلوق موجود نہیں؟ یا نہیں تھی یا آئندہ
بھی نہیں رہے گی حقیقت تو یہ ہے کہ مریخ پر زندہ
مخلوق کے وجود کو تسلیم کرنا اگر بے وقوفی ہے تو اس کو
نہ تسلیم کرنا بھی بے وقوفی سے خالی نہیں۔

مریخ کی آبادی سے سردست گفتگو کرنا تو ممکن
نظر آتا ہے کیونکہ یہ فرض کرلیا جائے کہ وہاں کی آبادی
سے ہم نے بات بھی کی- تو یہ نہیں کہہ سکتے کہ اُن کی
ذہنی ترقی اس حد تک پہنچی ہے کہ وہ ہماری بات کو
سمجھ سکیں اور جواب دے سکیں- اور کون جانے کہ
ان کی زبان ہماری زبان سے ملتی ہے یا بالکل جدا-

جانباز ملت

دکن کی قابل احترام شاعرہ بشیر النساء بیگم بشیر کی وہ
نظم ہے جو حیدرآباد کے جانباز ملت نواب بہادر یار جنگ
کی بے وقت جواں مرگ موت پر دل کے آنسو قلم کی
زبان سے ٹپکے ہیں، جس کا ہر بند سوز و گداز اثر و
درد میں ڈوبا ہوا ہے۔ کس قدر متاثر اشعار ہیں۔

آہ! ایسے میں اچانک ایک طوفان آگیا
چھا گئیں تاریکیاں اور کارواں لوٹا گیا
برق آسا گردش دوراں نے ڈھایا انقلاب
دوپہر کی چھاؤں میں ڈوبا دکن کا آفتاب

بے وقت اور جواں مرگی کا کس قدر حقیقی چربہ
اُتارا ہے کہ دل پر ایک چوٹ لگتی ہے۔

کل اشعار ایسے ہی تاثرات میں ڈوبے ہوئے
ہیں - یہ مجموعہ قیمتاً نہیں مل سکیگا - کیونکہ شاعرہ
نے بطور اظہار تعزیت لکھا ہے - پھر اس کی قیمت
ہی کیا ہوگی - ہاں کہیں سے ملجائے تو آپ بھی اس
موت پر تلخ آنسو بہائیں کہ حیدرآباد سے کیسا
فرد اٹھ گیا- انا للہ

آپ ختم چندہ پر وی. پی کیوں واپس کرتی ہیں
(عال) چندہ سالانہ اتنا گراں نہیں

نظم عاری

"ارشی" کے نام.....!

پھول کنج[1] مسکن بنا ہے آج کل کیوں آپ کا
بے تکی باتیں تمہاری جن سے مجھ کو پیار تھا
کھیل رتیلے کنارے کے، اندھیری رات کے
بیت بازی، رات کی، شعروں کی لے
چاندنی راتوں میں، وہ بلبل ترنگ۔ پر چھیڑ چھاڑ
چلچلاتی دوپہر میں تاش کے وہ جھگڑے!
بات سلطانہ سے اور روئے سخن میری طرف
عید کا تحفہ۔ رنگیلی چوڑیاں
نقش فریادی[2] کا تحفہ وہ برتھ[3] کے گانٹھ پر
کیا ہوئے وہ دن؟ بہاریں ساعتیں!
عہد الفت کی قسم، جذب محبت کی قسم!
رس پہ مرنے والے بھونرے، کچی کلیوں کی قسم
کون تھے تم سوچنا، اور کیا سے کیا اب ہو گئے

خار سے الفت کے وعدے کیا ہوئے؟
خواب کی باتیں سنانے کے بہانے کیا ہوئے؟
کھیل کے پردے میں وہ فسانے کیا ہوئے؟
شعر کی سنگت پہ وہ دل کے اشارے کیا ہوئے؟
بھیگی برساتوں میں ہنسی کے وہ نالے کیا ہوئے؟
پیاس میں لسی کی سالنوں کے شرارے کیا ہوئے؟
رابعہ کی آڑ سے جھکے کنائے کیا ہوئے؟
کیل یاقوتی سنہرے کیا ہوئے؟
خاص اشعاروں پہ وہ منپل کے دھارے کیا ہوئے؟
وہ رگوں میں دوڑتے سے برق پارے کیا ہوئے؟
دل کی پارینہ کہانی، اس کی حسرت کی قسم!
بس کے سودے میں جو لی تھی اس حلاوت کی قسم!
جس سہارے ہم جئے وہ دن ہمارے کیا ہوئے؟

"جہینا"

---

[1] ایک گھر کا نام [2] فیض کا دیوان [3] سالگرہ

غم

لیتا ہے میرے دل میں غم آرام اس طرح
سنسان جنگلوں میں پڑے شام جس طرح

اے غم! آخر تجھے مجھ بدنصیب سے اتنی ہمدردی کیوں؟ میرے خانۂ دل میں ایسی کیا خوبی دیکھی جو تو نے اسے اپنی آماجگاہ بنالیا۔ میرے دل کی دنیا میں وہ کونسی دلچسپی پنہاں ہے جو تجھ کو یہاں تک کھینچ لائی؟ مجھ میں اتنی طاقت نہیں تھی کہ تیرا استقبال کرتی۔ ایک عرصہ سے تجھے میں نے محو کر رکھا تھا گو میرے دل میں تو موجود تھا مگر میں ہر طرح سے تجھے مٹانے کی کوشش کرتی رہی اور کثر کامیاب بھی ہوئی مگر ظالم! تو پھر سے ایک نئے روپ میں جلوہ گر ہو کر میرے دل و دماغ پر قابض ہو گیا۔ ؎

حاصل کو تو نے پھر غم حاصل بنا دیا،

میرا دل تیری مہمان نوازی سے قاصر تھا۔ میں تجھے اپنے دل سے نکال دینا چاہتی تھی لیکن اب۔ تجھ سے جدا ہونا ناممکن ہے تو میری زندگی کا جز ولاینفک ہو گیا ہے۔ بیشک میں تیری میزبان ہوں۔ اب تو مجھے کس قدر پیارا ہو گیا ہے میں نہیں بتا سکتی۔ تو میرا جیون ساتھی ہے۔ میں تجھے اپنے دل میں اس طرح رکھنا چاہتی ہوں کہ کسی کو خبر نہ ہو کہ تو کہاں مقیم ہے۔ تو مجھے اب اس قدر عزیز ہے کہ تجھ کو سب کی نگاہ سے پوشیدہ رکھتی ہوں۔ تو میرا ہمدم ہے مونس ہے۔ رفیق تنہائی ہے۔ وہ کٹھن گھڑیاں جن کو میں کروٹیں بدل بدل کر گزارتی ہوں اس وقت تو اور صرف تو ہی میرا ساتھ دیتا ہے۔ ساری دنیا کم از کم میری دنیا جس میں میں بستی ہوں آرام سے پڑی سوتی رہتی ہے اور میں تیرے ساتھ اپنا دل بہلاتی رہتی ہوں۔ میرے رفیق! میرا خانۂ دل تیرے لئے وا ہے۔ مجھے دھوکا نہ دے اور اپنے قدم سے اسے آباد رکھ۔

صغرا عبدالسبحان

عورت

وجود زن سے تصویر کائنات میں رنگ
اسی کے ساز سے ہے زندگی کا سوز دروں
شرف میں بڑھ کے ثریا سے مشت خاک اس کی
کہ ہر شرف ہے اسی درج کا دُر مکنوں
مکالمات فلاطوں نہ لکھ سکی لیکن
اسی کے شعلہ سے ٹوٹا شرار افلاطوں

علامہ اقبال

تشطیر بر غزل حضرت غالبؔ

نظروں کو کیف حسن سے سرشار دیکھکر | اپنا حسین ذوق شرربار دیکھ کر
"کیوں جل گیا نہ تاب رخ یار دیکھ کر | جلتا ہوں اپنی طاقت دیدار دیکھ کر"

اخگر سرشت کہتے ہیں اہل جہاں مجھے | شعلہ شکست کہتے ہیں اہل جہاں مجھے
"آتش پرست کہتے ہیں اہل جہاں مجھے | سرگرم نالہ ہائے شرربار دیکھ کر"

جن کے قلوب ہی میں نہیں قوت صفا | ایسوں سے کیا امید ملے حاصل وفا
"کیا آبروئے عشق جہاں عام ہو جفا | رکتا ہوں تم کو بے سبب آزار دیکھکر"

اٹھا ہے وہ تو چڑھ کے مگر جوش رشک سے | پھنکتا ہے سارا قلب و جگر جوش رشک سے
"آتا ہے میرے قتل کو پر جوش رشک سے | مرتا ہوں اس کے ہاتھ میں تلوار دیکھکر"

افسوس اس نے کھینچا ہے سب و ستم سے ہاتھ | یعنی کہ اس نے روک لئے اب کرم سے ہاتھ
"واحسرتا کہ یار نے کھینچا ستم سے ہاتھ | ہم کو حریص لذت آزار دیکھکر"

وابستہ چشم دل ہے شعاع سخن کیساتھ | وابستہ زندگی ہے ضائع سخن کیساتھ
"بک جاتے ہیں ہم آپ متاع سخن کیساتھ | لیکن عیار طبع خریدار دیکھکر"

نشہ نہیں ہے مئے میں تو پیمانہ توڑ ڈال | جس میں نہیں ہے آب وہ دردانہ توڑ ڈال
"زنار باندھ سبحۂ صد دانہ توڑ ڈال | رہرو چلے ہے راہ کو پرخار دیکھکر"

یکسانیت سے راہ کی بولا گیا تھا میں | بار الم سے سینہ کے چکرا گیا تھا میں
"ان آبلوں سے پاؤں کے گھبرا گیا تھا میں | جی خوش ہوا ہے راہ کو پرخار دیکھ کر"

جانے ہے خون غیر کو پیمانہ میں مرے | اس کو خیال غیر صنم خانے میں میرے
"کیا بدگماں ہے مجھ سے کہ آئینہ میں مرے | طوطی کا عکس سمجھے ہے زنگار دیکھکر"

مومن کی انتہا نہیں حور و قصور پر | قایم ہے ذات اس کی تو تیرے ظہور پر
"گرنی تھی ہم پہ برق تجلی نہ طور پر | دیتے ہیں بادہ ظرف قدح خوار دیکھکر"

دیکھا نتیجہ ہم نے یہ اکثر مآل کا
بننے سے پہلے مٹتا ہے مظہر خیال کا
"سر پھوڑنا وہ غالب شوریدہ حال کا
یاد آگیا مجھے تری دیوار دیکھ کر"

سعیدہ مظہر ایم - اے آخری

صنف نازک

عورت کا یہ فطرتی تقاضا ہے کہ اُس کی اِس قدر نیکی کی قدر کی جائے جس قدر اُس میں پائی جاتی ہے اور وہ اپنے پاکدامنی پر جھوٹا حملہ نہ ہونے دے گی خواہ حملہ کرنے والا ایسا شخص ہو جس کو وہ اپنی عفت و عصمت حوالہ کرنے کو تیار ہے۔

عورت مثل حجاب ہے اُس کی فطرۃ بدل نہیں جاتی ایک ذرا سا سہارا دو پھر وہ تجدید عہد کرتی ہے۔ اُس کو موقع دو کہ وہ وعدہ کی شانِ ایفا پھر پیش کر سکے۔

عورت دنیا بھر کی شاعری ہے۔

عورت کی خاموشی مرد کی تقریر کے برابر ہے۔ جس میں سامان جراحت و مسرت پنہاں ہے۔

عورت کا ایک جذبہ تمام مردوں کی عقل سے بڑھ کر ہے۔

عورت کی مرضی خدا کی مرضی ہے۔

عورت ہونٹوں ہی ہونٹوں میں ہنسنا شرم کے مارے منہ پھیر لینا نگاہ نیم ناز سے تاڑنا میٹھی میٹھی باتیں کرنا۔ سوتن سے جلنا عشوۂ ناز دکھانا۔ ان تمام اُمور میں مجبور و لاچار ہے۔

عورت کی کرشمہ سازی۔ کن آنکھوں سے دیکھنا۔ خوش بیانی سے کام لینا۔ شرم آمیز تبسم اٹکھیلیوں سے ٹہلنا۔ مچل کر ٹھہر جانا۔ وہ اوصاف اور حربہ حسین ہیں کہ جن کے ذریعہ کائنات کو ہلا کر ڈالتی ہے۔

عورت بھی جس طرح نیلے کنول کے پھول کی حالت بدلتی رہتی ہے اُسی طرح آنکھوں کی زیب و زینت سے اُس کے چہرہ کی حالت متغیر رہا کرتی ہے۔ کبھی تو وہ ابرو سے وار کرتی ہے کبھی حیا سے بیحد دلفریب دکھائی دیتی ہے کبھی غصہ سے غضبناک کبھی شوخ بن کر ناز و انداز کی بجلیاں گراتی ہے۔

عورت رشک ماہ صورت غیرت گل رخسار کندن کی دمک کو مات کرنے والی جسمانی رنگت' بھونروں کی قطار کو شرمانے والی سیاہ زلفیں۔ پر رونق سینہ۔ دل کش و شیریں نغمہ۔ یہ تمام اوصاف فطرۃ سے ساتھ لاتی ہے۔

"بھلا کوئی بوجھے"

(بسلسلۂ گزشتہ)

۹- حسین خواب کی "تعبیر" ہیں۔ روداد چمن ہیں اور پردۂ تبسم ہیں۔ پیمانہ و ساغر ہیں۔ گنجینۂ معنیٰ کا طلسم ہیں۔ عالم تمکین و ضبط ہیں۔ خیال "حسن عمل" ہے۔ دل "خزینۂ راز" ہے۔ اِن کی تنہائی ایک "انجمن" ہوتی ہے۔ زندگی کے خط و خال "بغور" پڑھتی ہیں ——

یہ میری "ہم نشین" ہیں۔

۱۰- دنیا کی پہلی تجربہ کار عورت ہیں۔ انتہائی متین اور سنجیدہ، بڑی مدبرا اور صاحب فہم ہیں۔ اضطراب اور انتشار ان کی ایک نگاہ سے شرارہ بن جاتا ہے، اتحاد اور رواداری ان کا "شیوہ" ہے۔ "خاموش گویائی" ہیں۔ دوسروں کے خلوص و محبت کی "معصوم خوشی" کو اپنی زندگی کا دائمی حصہ سمجھتی ہیں حقیقت کا اظہار نہایت موثر طریقہ پر کرتی ہیں۔ زبان نہایت رواں اور شستہ ہے۔ احساسات اور فطرت پر پورا "قابو" ہے۔ فانی دنیا کے ابھرتے اور مٹتے ہوئے نقوش کا کافی "مشاہدہ" ہے۔ زیادہ کیا لکھوں۔

یہ میری "ہم نفس" ہیں۔

۱۱- تنہائی پسند ہیں۔ کوئی ہم نوا ہے اور نہ کوئی "ہمنفس" —— کائنات کو جگمگانے والی اور نسوانی دنیا کو مہکانے والی ہیں۔ درد و سوز ہیں۔ ستارۂ سحر ہیں۔ روح "امید" ہے اور وجود آرزوؤں کی بستی اور تمناؤں کا مرجع ہے۔ اِن کی کشتی حیات بڑے سے بڑے "طوفان" میں بھی نہیں ڈگمگاتی —— فریادی کی "فریاد" ہیں۔ موقع کے لحاظ سے سبک لہر بھی ہیں اور بڑھتی ہوئی "موج" بھی ——

یہ میری "رہنما" ہیں

۱۲- "خوش آیند ساز" ہیں۔ گرتا ہوا آبشار ہیں۔ "حقیقت" کا یہ نغمہ گاتی ہیں۔ سنجیدہ موضوع ہیں۔ اِن کا قدم "شائستگی" ہے۔ خود مکمل عورت ہیں اور نسوانی دنیا کی "رہبر" ہیں۔ چشم بصیرت رکھتی ہیں نئی روشنی کی تیتریوں کو خوب پرکھتی ہیں۔ اور ان کی "اداطرازیوں" پر ریمارک کرتی ہیں۔ بڑی محنتی اور "وقت کی پابند" ہیں۔

یہ میری "استاد" ہیں۔

۱۳- ماضی کا "آئینہ" ہیں اور مستقبل کی بشارت —— حال کی سب سے "بہترین تصویر" ہیں۔ جذبات حد امکان سے زیادہ گہرے ہیں۔ "یاد رفتہ" کی طرح درد انگیز معلوم ہوتی ہیں اور دل انتظار کی طرح پرسوز —— مگر ہیں سراپا "روح و مسرت" —— علم و اخلاق کی منزل ہیں۔ "نسائیت" کا مکمل نمونہ ہیں۔

سچی "غمخوار" اور دلِ بے چین کی ترجمان ہیں۔ "روحانیت"
کے مقدس رشتے اِن کے پاس ملتے ہیں۔ یہ "درد" بھی
ہیں اور سراپا "تسکین" بھی ——— "فرشتہ دل" ہیں اور
روحانی دلوں سے قریب تر ہیں جس کے وجود کا چاند
رات اور دن طلوع رہتا ہے وہ یہی ہیں ۔

یہ میری "دوست" ہیں ۔

۱۴ - ہمیشہ "امید" کے ساتھ اِن کا خیال آتا ہے۔
"آرزو" کے ساتھ یہ یاد آتی ہیں۔ درد کے ساتھ "تسکین درد"
بن جاتی ہیں۔ "اشکوں" کے ساتھ یہ تسلی دیتی نظر
نظر آتی ہیں۔ دل کو ان کی تلاش میں سرگرداں نہیں
رہنا چاہیئے۔ یہ شہ رگ سے بھی زیادہ قریب تر ہیں
اور جان سے زیادہ "عزیز" ——— انسانیت کا بحر ہیں۔
نسائیت کا گوہر ہیں۔ اس بہائم کی بستی میں اخلاص
و مروت کی روشنی ہیں۔ "جنت کے نورانی جلوؤں کی
قسم" ! یہ اپنی آپ نظیر ہیں۔ یہ میرا "ایمان" ہیں اور
یقین ہیں ——— میرا "دل" ہیں اور "جان" ہیں کیوں
نہ ہوں آخر ———

یہ میری "روحانی ماں" ہیں ۔

۱۵ - قدرت کی "عکاسی" ہیں اور فطرت کی "پرچھائیں"
——— "زندگی کی موسیقی" سے خوب واقف ہیں۔ دماغ
فلسفیانہ اور جذبات شاعرانہ ہیں ——— حقیقت "آبحیات"
ہیں۔ انسانی تمکنت اور اصلی اخلاقی شان ان کی
شخصیت کے "جوہر" ہیں۔ ادبی دنیا میں چمکتا ستارہ
ہیں۔ حسن کا سحر ہیں مگر کسی حسن سے "مسحور" نہیں ہیں۔
"نسائیت" پرست ہیں اور کسی ہم نوا کی متلاشی ہیں۔
در اصل ۔

یہ میری "ہم نوا" ہیں ۔

۱۶ - دل ہر لحظہ اسے خطاب کرتا ہے۔ روح ہر ثانیہ
جھوم اٹھتی ہے۔ زندگی اس کی نہ بھولی جانے والی
"یاد" پر ہے۔ اور جب کبھی یہ یاد آتی ہے۔ دل اس
"آباد ویرانہ" سے گھبراتا ہے۔ اور روح آسمانی بلندیوں
میں پہنچ کر بادلوں کی رخنہ اندازیوں میں کچھ ڈھونڈنے
لگتی ہے۔ وہی بے چین جذبات اور وہی زندگی کی
"تلخیاں" سامنے ہوتی ہیں۔ بس ٹوٹا ہوا دل مسلسل
"ارتعاش" بن جاتا ہے۔ اور زندگی دل کے "زخموں
کی کراہ" کا ایک تسلسل معلوم ہوتی ہے۔ اس کی یاد
میرا "نغمہ" ہے۔ اس کا خیال میرا "گانا" ہے۔ مگر آہ !!
یہ نغمے اسے نہیں سنائے جا سکتے۔ یہ میری حدِ امکان سے
پرے اس دنیا میں ہے جسے "جنت" کہتے ہیں۔ فرشتے
اسے لوریاں دے کر سلاتے ہیں۔ یہ اپنے "شیریں خواب"
سے بیدار ہو کر پھر اس دنیا میں نہیں آئے گی۔ اب
جو چیز اسے مرغوب ہے وہ مجھ سے "پیہم جدائی" ہے
تاروں کے جھرمٹ میں آنکھ مچولی کھیلنے والی روح
آمین ہر لمحہ اس کی منتظر ہوں۔ میری مسرتیں، میری
تمنائیں جس کے مقدس مزار سے ٹکراتی ہیں۔ آہ !!
میری "مسرتوں کی شمع" میرے "دل کی سکون" ———

میرے افسانوں کی روح ــــ میرے مضامین کا موضوع ــــ میرے خیالستان کی "حور" ــــ میرے تصور پرستان کی ملکہ ــــ میں ہر لمحہ اس کی "پرستش" کرتی ہوں۔

یہ میری سعادت ہے۔ آہ !!!

جنت نصیب سعادت کے مضامین کی نسبت کچھ دنوں اوس کی کثیر سہیلیوں میں مجموعہ کی اشاعت کا ایسا جوش رہا گویا صبح شام منظر عام پر آجائیگا کمیٹیاں ہوئیں۔ باہمی چندوں کا ارادہ کیا گیا لیکن پھر ایسی خاموشی طاری ہوگئی کہ تقریباً چار سال سے کسی نے نہ پوچھا یہی ہمارے بہنوں کا عالم چند دنوں کے بعد یہ بھی معلوم نہ ہوگا کہ آخر سعادت تھی کون؟ کاش چند سہیلیاں آمادہ ہوکر اس کے مٹنے والے نقوش کو دائمی بنادیں۔

"چنبیلی کی کلیاں"

تمہاری سفید جگمگاہٹ، آسمان پر رقصاں ستاروں کی مانند ہے۔ اور تمہاری ہر لمحہ لرزش روح کو سرور دینے کا باعث! . . . . . تمہاری نرم و نازک بیلوں کی جنبش۔ قلب کو کیف سرمدی عطا کرتی ہے۔ اور نگاہوں کو تازگی!

چاند کی زرین کرنیں۔ تمہارے دلفریب عکس کو چمک عطا کرتی ہیں۔ خاموش لمحات میں تمہاری موجودگی دنیائے معصومیت میں لیجاتی ہے۔ اور تمہاری عطر بیزیاں باعث تجدید حیات ہیں۔

جنگلی ہواؤں کو تمہاری نزاکت نے فریفتہ کرلیا۔ اور آفتابی شعاعوں کو والا و شیدا۔ شب تاریک میں تمھیں بیلوں پر لرزہ براندام دیکھ کر مجھے تو یہی محسوس ہوتا ہے کہ اندھیرے سنسار میں روشنی کانپ رہی ہے۔

اندھیرے جنگلات اور روشن گلستانوں میں تمہارے لئے کوئی امر فرق نہیں۔ نیز پہاڑی جھرنوں۔ اور وسیع نالوں کو بھی اپنی ضیائے حسن سے جگمگاتی رہتی ہو۔

تمہاری خوشبو کس قدر میٹھی ہے۔ اور کیسی پیاری۔ باغ ارم کی تمام عطر آمیزیاں بھی شاید اس کا مقابلہ نہیں کرسکتیں۔ . . . . اور پھر یہ رعنائی۔ یہ لطافت۔ اور بڑھتی ہوئی پاکیزگی۔ بہشت کی حوریں بھی نہ معلوم اس قدر صفات سے مزین ہیں یا نہیں؟ . . . . اور پھر تمہاری معصومیت! جسے دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ تم حقیقتاً دیوتاؤں کے مقدس ہاتھوں سے تخلیق کیگئی ہو، ان کی نظروں میں تمام پھولوں سے بڑھ کر لطیف ہو، اور سب سے زیادہ قابل تعریف۔ ورنہ بھونرے اس بیتابی سے تمہارے ارد گرد چکر کیوں کاٹتے؟ تتلیاں پروانہ وار نثار ہونے کو آگے کسلئے بڑھتیں اور خوبصورت پرند سر تسلیم کسطرح خم کردیتے۔

تمہارا حسن معصوم کیسا نگاہوں میں کھب جانیوالا ہے مقدس کلیوں۔ اور کس قدر دل لبھانیوالا۔ محمودہ رضویہ

میری کامیاب زندگی

تابان

اسکول کا زمانہ شوخی اور شرارت میں بسر ہوا جب کالج پہنچی تو عقل میں پختگی، مزاج میں سنجیدگی پیدا ہو گئی تھی۔ فرصت کے اوقات جہاں اور باتیں ہوتیں وہاں کبھی ساتھ والیاں مستقبل کا ذکر چھیڑتیں اور کبھی اپنا خیال آتا تو ایک وحشت معلوم ہوتی۔ میاں بی بی کے ناخوش گوار تعلقات۔ ساس بہو کے جھگڑے نند بھاوج کی نوک جھونک۔ یہ اور اسی قبیل کی گفتگو سے میں گریز کرنا چاہتی تھی۔ عموماً چھٹی کے گھنٹوں میں یہ مشغلہ بیکاری چھڑتا کوئی نہ کوئی لڑکی یہ راگ الاپتی پھر دیکھئے کہ وہ وہ نغمے بلند ہوتے کہ خدا کی پناہ! بعض تو ایسی شوخ ہوتیں کہ وہ اپنے مستقبل کا ایک مکمل پروگرام سنا دیتیں بعض ایسی شرمیلی کہ گردن جھکائے چپکی بیٹھی رہتیں۔ مجھے ایسے قصوں سے خوف سا ہوتا میں اس کی نسبت ایک لفظ بھی سننا نہیں چاہتی تھی اس لئے کہ مستقبل کو مستقبل ہی پر چھوڑ دینا چاہئیے۔ ایسی کہانیوں سے بچنے کے لئے کالج سے اکثر غیر حاضر ہوتی تو گھر میں اس سے زیادہ طومار ہوتا، جہاں بارہ بجے ہمسایہ کی عورتیں کا چن وغیرہ دن تمام آتی جاتی اور یہاں بھی داستان گوئی کا سلسلہ آغاز ہو جاتا۔ وہی شوہر بی بی کی جنگ

نند بھاوج کی رنجش۔ ساس بہو کے جھگڑے۔ دنیا بھر کے عیب و ہنر عذاب و ثواب پر دھواں دھار تقریریں اور تنقیدیں۔ یہ تو ممکن نہ تھا کہ کانوں میں روئی ٹھونس کر پڑی رہوں مجبوراً ان قصوں کو دماغ میں اتارنا پڑتا تھا۔ اس سے تو کالج ہی کی چار دیواری کنج عافیت کا کام دیتی تھی کہ وہاں ایک ہی گھنٹہ اور بھی بعض اوقات ایسے تذکروں کے لئے وقف ہوتا تھا لیکن گھر میں پناہ بخدا جہاں توپ دغی مجلس آراستہ ہو گئی۔

میں اکثر یہی سوچتی تھی کہ مرد کس قدر آزاد، کتنا لاپروا، کتنا خود مختار ہے۔ نہ مستقبل کی ذمہ داریوں کا خیال نہ کسی قسم کا اندیشہ۔ جہاں جائے کوئی پوچھنے والا نہ ٹوکنے والا۔ اور! ! عورت' کمزور تھی۔ سماج کا شکار، بندھنوں میں اسیر، نظروں کا نشانہ، لبوں پر مہر، مجبور اور لاچار۔ دل زخمی ہے مگر بتا نہیں سکتی۔ درد ہے لیکن ظاہر کرنے کی اجازت نہیں، وہ مرد کے ہاتھ کا کھلونا ہے جب تک جی چاہا کھیلا۔ اور جی چاہا توڑ پھوڑ کر پھینک دیا۔ گویا دنیا میں اوس سے کوئی سچی ہمدردی کرنے والا اور اوس کے زخموں پر مرہم رکھنے والا ہی نہیں ہے حالانکہ کائنات میں رنگ و بو اوسی کے دم سے ہے وہ نہ ہوتی تو آج رنگینیوں کا وجود ہی نہ ہوتا باوجو

اس کے کبھی مجھے قدرت پر الزام لگانے کی جراءت نہ ہوئی
کہ میری تخلیق ایسی کمزور صنف میں کیوں کیگئی۔ قدرت
کی ایک مشین کی طرح اپنی زندگی کاٹ رہی تھی کہ کوک
ہی ایسی ملی ہے۔

ایک روز کالج سے آکر میز پر کتابیں رکھ رہی
تھی نعیمہ دبے پاؤں کمرہ میں داخل ہوکر کہنے لگی آپا آپ تو
ہوکہ آج کیا ہوا؟ میں نے کہا کیا خبر تم ہی بتاؤ نا۔
بولی دوپہر میں بیرسٹر فرحت کی والدہ آئی تھیں میں نے
کہا آئی ہوں گی مجھے کیا۔ ارے تمھیں کیا؟ وہ تو تمھاری
ہی نسبت باتیں کرنے آئی تھیں۔ بس اتنا سُن لو کہ فرحت
کا پیام تم سے پختہ کرنے کا ذکر تھا۔ ممی نے میاں ابا سے
اس کا تذکرہ کرکے جواب دینے کا وعدہ کیا ہے۔ یہ سُن کر
میرے اندیشے تازہ ہوگئے اور میں کچھ کھوئی کھوئی سی
بنگئی نہ کھانا بھلا معلوم ہوتا تھا نہ پڑھنا۔ آہ! عورت
کس قدر مجبور جنس ہے جس کے مستقبل کا خیال والدین
کو دامنگیر رہتا ہے اوس سے اس مسئلہ میں نہ ذکر ہوتا
ہے نہ رائے لیجاتی ہے۔ ایک بے زبان جانور کا گلا چھری
کے نیچے رکھدیا جاتا ہے نہ تڑپنے کی اجازت ہے اور نہ
فریاد کی۔ یہ ہے ہمارے مستقبل کی بسم اللہ۔

فرحت ہمارے دور کے رشتہ دار ہوتے ہیں
حال ہی میں انگلستان سے واپس آکر وکالت کی دکان
سجائی تھی مجھے علم نہیں کہ کتنوں کو جیل بھجوایا اور کتنوں کو زندگی کے
گھاٹ اوتارا۔ ادہر برق چمکی اور کسی آشیانہ کی تلاش ہوئی ادہر
دو ایک ہفتہ میں گھر کا نقشہ ہی بدلا ہوا دکھائی دینے لگا بینڈ باہر
جارہا ہے خرید فروخت کا بازار گرم ہو رہا ہے کنبہ کے لوگ جمع ہو رہے ہیں لیجئے وہ نیک
ساعت بھی آپہنچی اور قاضی جی کے دو بول پر کسی کے دائمی
امن وچین کی گرہ لگادیگئی والدین کو میرے عارضی
رخصت کا غم۔ اور سسرال کو بھولانے کی خوشی اور ایک
مذبوح پرند کو رسم ورواج کے قفس میں بند۔ یہ ہے
ایک مشرقی عورت کے مستقبل کا پہلا دن جس کے لئے شادیانہ
مسرت بجایا جاتا ہے۔

چار ہفتہ تو صبح شام ساس کو سلام اور چھوٹوں
سے پیار وکلام اور وقت پر کھانا۔ فرصت میں مطالعہ
کتب کے سوا کوئی اور مشغلہ نہ تھا۔ فرحت جب کبھی
واپس آتے کوئی نہ کوئی تحفہ اپنے ساتھ ضرور لاتے۔
میں آئے دن کے تحفوں سے اکتا چکی تھی لیکن ان کی
دلچسپی میں کوئی فرق نہ ہوتا۔ اس عرصہ میں اس نئی
زندگی سے میں مانوس ہوچکی تھی وہ ابتدائی وحشت،
طبیعت میں باقی نہ تھی۔ البتہ آئندہ کی ذمہ داریوں کا
کافی احساس پیدا ہوگیا تھا۔ اس لئے اپنا ایک مکمل
پروگرام بنالیا تھا۔ ایک دن جب کہ فرحت عدالت
جاچکے تھے اپنے کمرہ میں آرام کرسی پر لیٹے ہوئے مطالعہ
میں مصروف تھی دروازہ میں کسی کے پیروں کی آہٹ
نے چونکادیا دیکھتی ہوں والدہ صاحبہ چلی آرہی ہیں
تعظیماً اوٹھ کھڑی ہوئی اونہوں نے نہایت پیار سے
اپنے بازو صوفہ پر بٹھالیا سر پر ہاتھ پھیر کر کہنے لگیں

بیٹی ایک مدت سے جو آرزو اور تمنا دل میں تھی خدا نے پوری کر دی کہ تم سی بہو سے گھر روشن ہو گیا۔ میں اب لب گور ہوں گھر کے بکھیڑوں میں کب تک پھنسی رہوں اب اپنا گھر تم سنبھالو۔ جو کہلاؤ گی کھالوں گی۔ جو پہناؤ گی پہن لوں گی مجھے جینا ہی کتنے دنوں بقیہ عمر اوس کی عبادت میں بسر کروں جس نے آرام دیا چین دیا۔ تم سے بہو دی۔ یہ کہکر میری پیشانی پر بوسہ دیا میں نے نہایت ادب سے عرض کیا آپ کا حکم میرے لئے موجب سعادت ہے لیکن میں ابھی ناتجربہ کار ہوں آپ سے بزرگوں کی موجودگی میں مجھے بہت کچھ سیکھنا ہے، خدا دیر گاہ رکھے۔ مجھ میں اتنی ہمت نہیں کہ اس ذمہ داری کو برداشت کروں۔ یہ سن کر وہ دعائیں دیتی ہوئی چلی گیئں۔ کیونکہ میں سوچ چکی تھی۔ ساس بہو کی بدمزگی اور نند بھاوج کی رنجش کا باہمی سب سے بڑا سبب گھریلو حکومت ہوتی ہے۔ ساس یہ چاہتی ہے کہ اوس کی حکومت اوس کے جیتے جی ختم نہ ہو، بہو محبت کے زعم میں ساس وغیرہ کو بھول کر گھر پر حکمرانی کی متمنی رہتی ہے اور ایسا ہی حال نند کا ہے اگرچیکہ وہ عارضی طور پر آتی جاتی رہتی ہے تاہم اوس کو اندیشہ لگا رہتا ہے کہ بھاوج کی حکومت سے بھائی کے دل میں اوس کی کوئی قدر و منزلت نہ رہیگی اسلئے ہر بہو کچھ دنوں اپنے جذبات پر قابو پالے اور حکومت کا خیال دل سے نکال ڈالے تو وہ حال اور مستقبل میں ایک کامیاب اور مقبول حکمراں بن سکتی ہے یہی میرے خیالات تھے جس پر چلنے کا میں نے اپنے دل میں مستقل فیصلہ کر لیا تھا۔ جو میرے لئے بہت کارآمد ثابت ہوا چنانچہ گھر کا بچہ بڑا میرا شیدائی اور ہمدرد ہے اور دن بھر بیٹھی ہوئی بیفکری کی بنسری بجا رہی ہوں۔ ایک دن فرحت مسکراتے ہوئے میرے پاس آئے اور کہنے لگے چلو آج سینما دیکھ آئیں۔ میں نے کہا بالکل تیار ہوں لیکن گھر میں اماں جان نہیں ہیں ان کے بغیر اجازت کہیں جانا ہمارے لئے بالکل نا موزوں ہوگا یہ سن کر وہ کہنے لگے "تعجب ہے کہ باوجود تعلیم کے تم اتنی کنسر ویٹو ہو" میں نے کہا تعلیم کا اگر یہی مقصد ہے کہ بڑے بوڑھوں کا لحاظ نہ کیا جائے تو ایسی تعلیم سے جہالت ہی اچھی ہے کہ جس میں کچھ تو پاس و لحاظ ہوتا ہے یہ سن کر وہ ہنستے ہوئے چلے گئے پھر کبھی نہ کہا حالانکہ بیسیوں مرتبہ سینما و تفریحیں ہو چکی ہیں میرے لیل و نہار نہایت پُر لطف گذر رہے ہیں۔ میری وہ بہنیں جو 'بہو' بننے والی ہیں اگر اس گُر کو سمجھ لیں تو عسرت و افلاس میں بھی عشرت کے شادیانے گائے جا سکتے ہیں۔ البتہ کچھ دنوں کے لئے اپنی امنگوں کی قربانی ضروری ہے یاد رہے کہ بغیر قربانی اور ایثار کے کبھی کامیابی نہیں ہو سکتی۔

بھوبرے

نیر

۱- دل وہ یوسف ہے جسے فکر خریدار نہیں،

سانولے سلونے بہت حسنوں کے منظور نظر۔ دل کی گہرائیوں کا پتہ آنکھوں سے چلتا ہے۔ جذبات لطیف۔ شاعرانہ خیالات۔ مغربی معاشرت کے دلدادہ۔ طبیعت میں طفلانہ شوخی۔ ادبی دنیا میں کھوئے ہوئے مگر لکھتے کم ہیں کہ مصروفیت سے چھٹکارا نہیں۔ سنجیدہ عورتوں کے ستائش گزار۔ سیاست پرست۔ خوددار انسان ہیں۔ افسانہ زندگی میں ایک ہیرو کی حیثیت، تعلیم یافتہ۔ مطالعہ کے دلدادہ۔ ازدواجی زندگی میں بہترین شوہر ہیں۔ شگفتہ پھول سے زیادہ بیمار کلی، رقص پروانہ سے زیادہ خاک پروانہ مرغوب ہے۔

۲- چال پر تو ظالم کے سادگی برستی ہے۔

گورا رنگ، اوسط قد۔ اتنے حسین جتنا کہ گمان ہے۔ گیمس سے دلچسپی ہے گویا قریب قریب چمپین، زندگی کے نشیب و فراز سے محض نا آشنا۔ پانی پر محل بنانے میں کمال حاصل ہے۔ ارادوں سے قریب قریب عملی دنیا سے بہت دور۔ تدبیر سے زیادہ تقدیر پر شاکر۔ حسن کو نئے زاویہ نگاہ سے جانچتے ہیں جذبات گو لطیف ہیں لیکن بھدے پن سے پیش کرتے ہیں۔ محبت کی صلاحیت ہے اور نہ کئے جانے کی۔ زندگی میں کوئی کیف ہی نہیں وہ جانتے نہیں کہ ساز زندگی میں کونسا تار چھیڑا جائے۔ پردہ کا خیال جنون کی حد تک ضرورت سے زیادہ تشنگی۔ عدم مداخلت کے حامی مگر مداخلت ضرور کرتے ہیں کہ طبیعت کی افتاد ہی ایسی ہے۔ فطرۃ سے مجبور۔

۳- انہیں آئیں گی شوخیاں آتے آتے۔

حسن۔ آرٹ سہی لیکن اپنی خوبصورتی پر ناز نہیں۔ زمانہ کے حوادث نے مستقبل کی صلاحیتوں کو جلا کر رکھدیا ہے۔ پھر بھی استقلال کا مادہ موجود ہے۔ مسکراہٹ میں ہزار راز پوشیدہ ہیں غصہ اور رحمدلی کا خمیر۔ نگاہیں پر غضب۔ جبر سے زیادہ صبر پسند اسلئے سنجیدگی پیدا ہوگئی ہے۔ موسیقی کا شوق ہے۔ مطالعہ کا ذوق۔ خیالات لطیف بہترین دوست اور اچھے ہمدرد بننے کی صلاحیت ہے۔ ساز محبت سے واقف ہیں لیکن مضراب نہیں کہ نغمے بلند ہوں۔ ازدواجی زندگی میں بھٹکے ہوئے ہیں جہاں ٹوکنا ہوتا ہے رعایت کی جاتی ہے۔ جہاں رعایت کی ضرورت ہے وہاں شکنجہ بن جاتے ہیں۔ مختصر یہ کہ بیوی پرست ہیں۔ آئندہ زندگی میں ٹھوکر کھانے کا احتمال ہے۔

۴ - ابھی سن ہی کیا ہے جو ... میانہ قد - نگاہوں سے شرارت ٹپکتی ہوئی، کام سے زیادہ باتیں - عمر سے زیادہ تجربہ - متین بننا چاہتے ہیں لیکن شوخیاں کروٹیں لیتی رہتی ہیں - محفل میں مہذب بننے کی کوشش پیش نظر - ملازمت سے نفرت - طبیعت آزادی پسند ہے - ہونے والے گریجویٹ - انتہائی دوست پرست - دھن یہ کہ دولت فراہم کی جائے چاہے کسی قیمت پر ملے - قہقہہ مار کر ہنسنا خاص انداز ہے - ہمدرد بھی ہیں اور مشیر بھی - لڑائی جھگڑوں سے نفرت -

۵ - جو بات پا گئے وہ تھوڑی سی زندگی میں :- رنگ پاک و صاف کمسنی کی شوخیاں مچل رہی ہیں - نگاہوں کے تیر چلانا خوب آتا ہے - دل ایک آتشکدۂ محبت ہے اور اکثر بھڑک اٹھتا ہے - نہایت گہرے - تاڑنے میں قیامت کی نظر رکھتے ہیں - آنکھیں دل کا آئینہ ہیں - سنجیدگی اور شوخی سے خمیر تیار ہوا ہے - حوادثات زمانہ سے کام نہیں پڑا - پھر بھی تجربہ کار - مسکراہٹ کے پیچھے برقی شرارے پنہاں رہتے ہیں خیالات معصوم - ایسی سرسبز ڈالی جو ابھی خزاں سے محفوظ ہے - ترقی کے منازل طے کر رہے ہیں -

۶ - یہ حضرت دیکھنے میں سیدھے سادے بھولے بھالے ہیں -
دل کی گہرائیوں کا پتہ چلانا مشکل ہے، صاف رنگ اوسط قد - تعلیم یافتہ - نگاہیں دل کی دھڑکنوں کا پتہ دیتی ہیں - پاک نفس مسکراہٹ میں سنجیدگی - نظر نہایت تیز - جس کے ساتھ برق و خرمن رہتے ہیں، پوشیدہ چیزیں لب بام - طرز گفتگو پر کیف - خاموش لیکن شکریں کو نین لپیٹ کر دینا خوب آتا ہے - دولت سے لاپروا - بیوی کے متلاشی -

---

بارہا عرض کیا گیا ہے کہ اندرون ۵ تاریخ کوئی پرچہ نہ پہنچے تو مکرر طلب فرمالیں، لیکن یہ عجیب بات ہے کہ باوجود توجہ دلانے کے آپ عمل نہیں کرتے اور پھر کئی کئی مہینوں کے پرچے طلب کئے جاتے ہیں - ظاہر ہے کہ کاغذ کی گرانی میں فالتو پرچے ذرا مشکل ہی سے نکل سکیں گے - اس لئے براہ کرم وقت پر طلب کر لیجئے اس کے بعد شاید ہی فرمایش کی تعمیل ہو سکے ۔

محمودیہ پریس چارمینار میں چھپ کر دفتر شہاب بیرلورہ سے شائع ہوا۔

ماہنامہ

شہاب

شہاب

جلد ۱۳ — آذر ۱۳۵۴ف م اکتوبر ۱۹۴۴ء — نمبر ۱

(مُرتبہ)

محمد عبدالرزاق بسمل

عوام سے چندہ سالانہ (للعہ)
گورنمنٹ سے (عـــہ)

پھر ہوا ہے تازہ سودائے غزل خوانی مجھے

آج سے ٹھیک بارہ سال قبل جب ہم محفل ادب میں شہاب سا حقیر ہدیہ لے کر نکلے تھے تو یہ توقع کس کو تھی کہ وہ ارباب ادب میں قبول عام حاصل کریگا اور اوس کی خدمات کا اعتراف کیا جائیگا۔

یہ سب کیا ہے؟ اوس خدائے برتر و بزرگ کا فضل و کرم ہے جو اپنے بندوں کو دوسروں کے دروازوں سے بے نیاز بنا دیتا ہے اس تمام عرصہ میں ہم اوس کے بخشش و کرم کو دیکھ چکے ہیں کہ راستہ کی حائل ہونیوالی مشکلات ہمارے لئے کس قدر آسان کردیگئی تھیں جبکہ عالمگیر جنگ نے بڑے بڑے رسائل کے کس بل نکال دئے لیکن شہاب ہر مہینہ وقت پر بدر کامل بن کر چمکتا رہا۔ انشاء اللہ چمکتا رہے گا۔

کسی پرچہ کی مقبولیت میں بڑا حصہ اہل قلم کا ہوتا ہے اس میں شہاب ابتداء ہی سے خوش نصیب رہا کہ جناب عطار حیدرآباد، جناب خواجہ محمد عباد اللہ اختر بی اے امرتسر، جناب ڈاکٹر کریم نواز خاں ایم اے پنجاب، جناب سید نور الحسن بی اے حیدرآباد، مسٹر بھارت چند کھنہ حیدرآباد، نصیر الدین ہاشمی جیسی ہستیاں مصروف نگارش رہیں اور پھر خواجہ صاحب جیسے عالم کا فرمودہ "وظیفہ لینے کے بعد اب میرے لئے دو ہی کام رہگئے ہیں اپنے لئے زمیندار اور شہاب کیلئے مضامین نگاری میں تو بالکل شہاب کا ہو چکا ہوں" نہایت حوصلہ افزا ہے۔

خواتین میں جہاں بانو ایم اے حیدرآباد، ثریا پروین بی اے پشاور، سلطانہ عزیز بی اے حیدرآباد، بشیر بانو حیدرآباد، زینت ساجدہ حیدرآباد، عمدۃ النساء حیدرآباد، منیزہ بانو کاؤس جی حیدرآباد، شمیم جا لندہ نے اس کو دلچسپ بنانے میں اپنا وقت صرف کیا ہے۔

شعراء میں نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیز حیدرآباد، جناب مسلم حیدرآباد، سعید مظہر ایم اے حیدرآباد۔ وحیدہ نسیم حیدرآبادی کی نازک خیالیوں کو بڑا دخل رہا ہے ان سب کی خدمات میں ہدیہ تشکر پیش کیا جاتا ہے اور آئندہ اس سے زیادہ توقعات وابستہ ہیں۔

اردو کی تاریخ اور ترقی پر کام کے وسائل

جناب حافظ محمد مظہر صاحب (معتمد حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس)

(بلا کسی تمہید اور خیالات بطور طریقہ کار سنجیدہ افراد کی خدمت میں ذریعہ شہاب چند امور پیش ہیں)

۱- تاریخ زبان اردو کی ترتیب کیلئے بعض ادارے تہیہ کررہے ہیں کہ کم وبیش تیس سال پہلے پھر اس کے بعد بھی متعدد مرتبہ زبان اردو کے پیر کبیر جناب ڈاکٹر عبدالحق کی خدمت میں عرض کیا گیا اردو شاعری اور شعرا کی حد تک متعدد تذکرے اور تفصیلات شائع ہوچکے ہیں مگر نثر اردو کی سرگذشت قلمبند ہونی چاہیئے جناب موصوف کا یہی جواب ہوتا تھا کہ وہ خود اس کام کو کر رہے ہیں اور چند امور باقی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کے ذاتی ذوق و تحقیقات علمی اور شوق خدمت زبان اردو اور وسیع کتب خانہ کی موجودگی، وافر سرمایہ- انجمن ترقی اردو اور نیز سرکار عالی کی امداد کی وجہ اس کام کو عرصہ قبل مکمل ہوجانا چاہئے تھا- لیکن ہمیشہ قیاس کرنا پڑتا ہے کہ ہنوز "ایک آنچ" کی کسر ہے-

اس عرصہ میں دکن اور جنوبی ہند کی حد تک دوسرے اصحاب ذوق و علم کی کتابیں اور مقالے شائع ہوچکے ہیں- تاہم یہ عرض کرنا ہے کہ تاریخ زبان اردو کے متعلق ایک مبسوط کتاب کی ملک کو اور خود زبان اردو کو ضرورت ہے- میرا ناچیز خیال ہے کہ تاریخ نثر و نظم اردو کا عنوان اس قدر وسعت رکھتا ہے کہ دو چار افراد علحدہ علحدہ اپنی جگہ کام کرکے اوس کو مکمل نہیں کرسکتے- اردو ایک بڑے براعظم اور دیگر ممالک میں وسعت کے ساتھ کروروں افراد کی زبان ہے انگریزی برطانیہ- امریکہ- نو آبادیات میں پھیلی ہوئی ہے- اس زبان کی وسعت کا یہ عالم ہے ایک علاقہ دوسرے علاقہ کے ادب اور علوم و فنون کا مکمل احاطہ نہیں کرسکتا اردو نثر و نظم کی تاریخ ترتیب فن واری اور علاقہ واری طور پر تقسیم عمل کے ساتھ چند علم دوست افراد کی کوششوں سے ہوسکتی ہے جنہیں اون کی محنت کا صلہ دیا جاسکتا ہے- جو معتد بہ رقم **اردو کانگریس** نے حاصل کی ہے وہ اس کام میں لائی جاسکتی ہے- فنی لحاظ سے نثر کی حد تک علحدہ علحدہ عنوان جو کام کے قابل ہیں وہ حسب ذیل ہیں-

۱ مذہبیات اسلامی و تصوف- ۲ مذہبیات ہنود-
۳ ادبیات- تاریخ تذکرے سفرنامے- اخبارات و رسائل،
۴ سیاسیات- پبلک اسپیکنگ تعلیمی و معاشرتی تحریکات-

لغت صرف ونحو ومتعلقات زبان - قانون سرکاری
دفتری اردو، سائنس - ریاضی - فلسفہ قصص -
ناول - ڈراما ناٹک سینما - نسوانیات جس میں دونوں
صنف کا کام شامل ہے - درسیات - کاروباری
اردو - بول چال - ترجمہ اس کی مختلف شاخیں
زبان اور فنون کے لحاظ سے ہوسکتی ہیں ۔
جغرافیہ اور نقشے -

نظم کی اصناف کے اعتبار سے بھی تقسیم ہوسکتی
ہے - حمد ونعت ومنقبت - غزل - مثنوی - قصائد -
مراثی - تاریخ نگاری - رباعی - قومی جذبات -
مناظر فطرت - عشق ومحبت - تصوف - مذہبیات
اسلام وہنود - ہجو - ہزل -

علاقہ واری تقسیم میں مدراس پریسیڈنسی بنگلور
میسور - حیدرآباد دکن - پونہ بمبئی مہاراشٹر -
احمدآباد وگجرات - کلکتہ ڈھاکہ بنگال - پٹنہ وبہار -
لکھنؤ واودھ - آگرہ الہ آباد - بنارس اور متعلقہ
علاقے - دہلی - لاہور وپنجاب - سندھ ملتان -
بلوچستان، صوبہ سرحدی ممالک ایشیا وافریقہ -
یورپ وامریکہ -

کہنا یہ ہے کہ تقسیم کار سے اس طویل اور پھیلے
ہوئے کام کو پورا کیا جاسکتا ہے - جامعہ عثمانیہ - ادارہ
ادبیات اردو - انجمن ترقی اردو وغیرہ علاقہ واری و
فن واری طور پر جلد سے جلد مکمل کراسکتے ہیں - تفصیلی
حصص کی ترتیب کے بعد کوئی بلند نظر محقق عام تبصرہ
تاریخ ارتقائے اردو لکھ سکتا ہے - اس سلسلہ میں
دفتری - قانونی وسرکاری تحریرات بھی زبان کی تاریخ
کا ایک عظیم جزو ہوتی ہیں - ایک طرف پرزور فرامین
اور احکام فرمان روا وحکومت - دوسری طرف
عام فہم جامع ومانع قوانین وضوابط - تیسری جانب
پرزور عدالتی فیصلے - چوتھے مرحلہ پر مراسلات اور
رپورٹیں زبردست استدلال شوکت الفاظ متانت
وسنجیدگی کا انبار عظیم دفتری تحریرات وذخائر میں
عیاں ونہاں ہوتے ہیں - اس شعبہ کے متعلق زبان
اردو کو حیدرآباد نے جس طرح مالا مال کیا ہے وہ سارے
ہندوستان میں لاثانی ہے - مگر اس کی جانب کسی نے
بھی نظر نہیں ڈالی - جب کبھی زبان کی حیثیت سے جس
کسی شاخ تحریرات سرکاری پر نظر ڈالی جائے گی تو
وہ کرشمہ دامن دل می کشد، کا مصداق ہے -

برطانوی حکومت ہند میں مرکزی حکومت کے
کام کا جس قدر تعلق ہے ابتدا سے انگریزی میں لکھا
گیا ہے اور اس میں بہترین انگریزی انشا پردازی کا
کثیر مواد موجود ہے مثلاً ۱۹۵۸ء کا اعلان منتقلی حکومت
کمپنی بہ تاج برطانیہ - دور کمشنری کے وقت والیان
ملک سے تحریرات فارسی میں ہوتی تھیں - دفاتر
مال وعدالت کا کاروبار جو مرکزی حکومت سے غیر متعلق
ہو، فارسی میں نیز عام قوانین وضوابط واعلانات بھی

فارسی میں ہوا کرتے تھے۔ پھر چند سال کے بعد فارسی کی جگہ اردو نے لے لی۔ دہلی کالج اور ڈاکٹری درس گاہوں میں اردو کو کالجی تعلیم کی زبان کا ذریعہ مثل جامعہ عثمانیہ رکھا گیا مگر تقریباً ایک صدی یعنی جامعات کے قیام سے اردو برطانوی ہند میں دیگر السنہ ملکی کے ساتھ ابتدائی مدارس میں پڑھائی جاتی ہے۔ دفاتر عدالت و مال کے اطلاع نامے دوسرے السنہ کے ساتھ اردو میں تحریر ہوتے ہیں اس کے مقابل ممالک محروسہ کے اوس وسیع رقبہ میں جو جزائر برطانیہ کے مماثل ہے، اردو ہی قصر شاہی سے لے کر دفاتر دیہی تک ہمہ گیر ہے۔ محکمہ جات حکومت مرکزی۔ صدارت عظمیٰ۔ صدر المہامی۔ معتمدی۔ نظامت ہائے سررشتہ پریوی کونسل عدالت العالیہ مع متعلقہ عدالتیں۔ جملہ مجالس حکومت خود مختاری مجالس وضع قوانین سے مجالس متقننہ تک اور پھر عام دفاتر سرکاری مدارس جدہر نظر اٹھائی جاتی ہے اردو ہی کا راج ہے اور یہ بات ہندوستان کے کسی برطانوی صوبہ یا بڑی ریاستوں میں بھی نہیں ہے۔ بعض انگریز حکام نے بھی اردو تحریرات اشتلہ میں چھوڑی ہیں۔

محکمہ جات سرکاری میں اعلیٰ ترین نثر نگار اور ادیب اردو نے پیدا کئے ہیں مسلمان بھی ہندو بھی۔ راقم کی ذاتی رائے میں دفتری و سرکاری تحریرات اردو کی حد تک عماد جنگ، مولوی محمد صدیق سرنظامت جنگ۔ مولوی نظام الدین احمد متانت زور کلام۔ طرز استدلال سنجیدگی تحریر میں بہت بلند پایہ رکھتے ہیں۔ ان سے قطع نظر مہاراجہ کشن پرشاد سر علی امام۔ تلاوت جنگ۔ سر امین جنگ۔ فخر الملک مولانا انوار اللہ سر مہدی یار جنگ۔ عبداللہ یوسف علی محسن الملک۔ عماد الملک۔ صدر یار جنگ۔ مولوی عزیز مرزا۔ سید علی بلگرامی۔ رفعت یار جنگ اول و دوم۔ سید محمد یوسف الدین۔ ملا عبدالقیوم محمد یار جنگ۔ فصیح جنگ۔ فتح نواز جنگ۔ ظفر علیخاں۔ ڈاکٹر عبدالحق، مولوی محمد بیگ۔ مولوی محمد مرتضیٰ مولوی محمد عبدالعزیز مرحوم۔ مہدی نواز جنگ معین نواز جنگ سید افضل حسین میر مجلس اور دیگر میر مجلس و اراکین۔ رائے بالمکند۔ بخشی رگھوناتھ پرشاد۔ رائے حکم چند۔ رائے بیجناتھ وغیرہم کی تحریرات مشمولہ اشتلہ بہترین نمونہ ہائے انشاپردازی و ادب وغ ملیں گے۔ جن پر روشنی ڈالنا بجائے خود ایک اچھا ادبی مشغلہ ہوسکتا ہے۔ اس وسیع شعبہ ادب اردو کو ہرگز نظر انداز نہ کرنا چاہئے ادارہ ادبیات اردو اس کام کو اچھے طریقہ پر آغاز کرسکتا ہے۔ راقم بھی اس میں ممکنہ خدمت گزاری کے لئے آمادہ ہے

۲۔ زبان اردو کی فوری ضرورت۔ فرہنگ اصطلاحات علمی شائع نہ کرنا ہی حیرت ہوتی ہے۔ اور اسباب نامعلوم ہیں کہ انجمن ترقی اردو نے

زائد از چالیس اور سررشتہ تالیف و ترجمہ نے ۷۰ سال کے عرصہ میں کیوں اس ضرورت کو پورا نہ کیا۔ علمی اصطلاحات کی نسبت واضح رہنا چاہیئے کہ ڈیڑھ سو سال میں اردو میں ترجمہ کتب علمی کا کام جاری ہے اور بکثرت کتابیں لکھی جا چکی ہیں اور سیکڑوں سے ہزاروں اصطلاحات ان ترجموں میں استعمال ہوتی ہیں اور اکثر اصطلاحات علمی خود مغربی السنہ میں عربی۔ فارسی۔ ترکی۔ سے لیگئی ہیں۔ دہلی کالج پنجاب یونیورسٹی سائنٹفک سوسائٹی علی گڈھ۔ آگرہ مڈیکل اسکول۔ لاہو۔ کلکتہ۔ حیدرآباد دکن کے ڈاکٹری مدارس۔ انجنیرنگ کالج رڑکی۔ پنجاب ریلجس سوسائٹی وغیرہ نے بکثرت تراجم اور تالیفات کر دئے ہیں شمس الامرا مرحوم اور علم دوست افراد نے متعدد علمی کتابیں لکھوائیں یا خود لکھی ہیں۔ مولوی ذکاء اللہ نے ریاضی کے ایک بڑے حصہ کو اردو میں لالیا ہے ان تمام علمی کتابوں میں اکثر کے ساتھ فرہنگ اصطلاحات بھی دیگئی ہے اور نہیں ہے تو مترجمہ کتاب سے اصطلاحوں کو جمع کرنا کسی فن داں کے لئے مشکل نہیں ہے۔ بنگال کے ایک ذی علم بزرگ عرصہ قبل اصطلاحات کیمیا کے متعلق اصولی کام کر چکے ہیں اور اوسی کے روشنی میں جامعہ عثمانیہ کتب کیمیا کے ترجمے ہوتے رہے۔

سررشتہ تالیف و ترجمہ کیلئے یہ ممکن اور وہی سہولت کار تھا۔ تقریباً ڈیڑھ صدی میں جو کام ہوچکا تھا اوس سے استفادہ کرتے ہوئے بقیہ کام کی بنیاد اسی پر رکھی جاتی یہ ممکن تھا کہ جو کچھ ترجمے اور تالیفیں ہوچکی ہیں جن کو اہل علم نے لکھا ہے اون سے تمام اصطلاحات علمی کو جمع کرنے کیلئے ایک کاردان اور ذوق علم رکھنےوالا مسجل معمور کیا جائے اور حسب ضرورت مزید اصطلاحات کی ترتیب شروع کیجاتی مگر از سر نو کام شروع کردیا گیا اور پھر ہر مترجم نے جدا جدا اصطلاحیں وضع کیں اور خاص کر تاریخ جغرافیہ و معاشیات میں مثلاً ہوس آف لارڈس ہاؤس آف کامنس کا جداگانہ ترجمہ ہر مترجم نے کیا ہے۔ اکثر مترجم چونکہ بیرون ملک سے آئے تھے اونھوں نے دفتری سرکاری قانونی ایسے اصطلاحات کو سالہاسال سے سرکار عالی کے دفاتر میں رائج ہیں اور جن کا مفہوم بآسانی سمجھ میں آسکتا ہے نہ لیا۔

ایسے جغرافی مقامات اسلامی بکثرت ہیں جن کا عربی فارسی کتابوں میں جداگانہ نام ہے اور مغربی زبانوں میں جداگانہ۔ بعض قابل مترجموں نے بڑی محنت سے عربی۔ فارسی مروجہ نام استعمال کئے ہیں اور آخر میں فرہنگ کے

ذریعہ اصلی انگریزی نام بھی اور اپنے اختیار کردہ عربی فارسی نام بھی درج کردئے ہیں یہ ایک بہتر علمی کام تھا بعض ترجموں نے عربی فارسی ترجمہ میں استعمال کئے ہیں مگر اون کی فرہنگ نہ دی کہ عربی اور انگریزی ومغربی السنہ میں کیا نام استعمال ہوتے ہیں اس کی وجہ اس کا ایقان نہیں کیا جاسکتا کہ ترجمہ میں اصل مروج فارسی نام استعمال ہوتے ہیں یا منگھڑت ترجمے ہیں۔ بعض مترجموں نے انگریزی نام بھی استعمال کئے ہیں۔ سررشتہ تالیف و ترجمہ کیلئے بآسانی ممکن تھا کہ اس طویل عرصہ میں تمام ایسے اسماء جغرافیہ حقیقی عربی وفارسی نام اور مغربی السنہ کے نام مع رومن حروف ایک فرہنگ کے طور پر شائع ہوجاتے اور جو طوفان بے علمی ایسے ناموں کے لکھنے میں اردو میں نظر آتا ہے باقی نہ رہتا۔ ابتداء میں فرہنگ بھی ترجموں کے ساتھ منسلک رہتی تھی مگر اب اس کا التزام بھی متروک ہوگیا ہے۔

یہ کہا جاتا ہے کہ ابتداء میں مترجمین دارالترجمہ کو مطلق العنان چھوڑ دیا گیا اور اس کی جانب مطلق توجہ نہیں کیگئی کہ اصطلاحات علوم وفنون کے ترجموں میں یکسانیت ہے۔ مولوی وحید الدین سلیم۔ مولوی عنایت اللہ مرحوم۔ مولوی عبد الرحمٰن خاں نے توجہ کی اور کافی رقم فرہنگ اصطلاحات علمی میں صرف کیگئی۔ ہزاروں اصطلاحوں کا مجموعہ مرتب کرلیا گیا مگر طبع کیوں نہ ہوسکا ماجرائے حیرت ہے بظاہر دو قیاس پیدا ہوتے ہیں ایک یہ کہ اصطلاحات عام طور پر شائع ہوجانے سے زیادہ افراد ترجمہ کے میدان میں آجائیں گے جو ادارے وافراد سرکاری اور غیر سرکاری ترجموں کی منوپلی رکھتے اور فائدہ حاصل کرتے ہیں ان کی ہوا بدل جائیگی اس لئے اس کو سرخ فیتہ کی چکر میں ڈال دیا گیا۔ دوسرا یہ چلتے ہوئے کام میں رخنہ پیدا کرنے اور افراد جو کانگریسی یا قومیت کی ذہنیت رکھتے ہیں اور اردو کے بجائے ہندی کو ملک میں رائج کرنا چاہتے ہیں یہ خیال پیدا کررہے ہیں کہ انگریزی اصطلاحات مستعمل ہوں یا عربی یا فارسی الفاظ کے بجائے ہندی اور سنسکرت کے الفاظ لئے جائیں اوس کی بناء پر فرہنگ اصطلاحات کی طباعت کو تاخیر میں ڈالدیا گیا۔ بہرحال قیاسات سے قطع نظر سررشتہ تالیف و ترجمہ اور انجمن ترقی اُردو کو اپنی تاخیر کے وجوہات ظاہر کردینا اور طباعت کے کام پر فوری توجہ فرمانا چاہیئے۔

یہ ظاہر ہے کہ اکثر اصطلاحات علمی مغربی السنہ میں عربی۔ فارسی۔ ترکی ہی سے ماخوذ ہیں اور ڈیڑھ سو سال سے یہی کوشش اردو میں رہی ہے کہ اصطلاحات جہاں تک ممکن ہو عربی۔ فارسی ماخذ سے لئے جائیں ڈیڑھ سو سال کے کام کو نظر انداز کردینا اور نیا نظریہ پیش کرنا جس کے لئے از سرنو محنت کرنی پڑے گی۔

کسی طرح پسندیدہ نہیں۔ سررشت موجودہ کتب درسیہ جامعہ عثمانیہ میں جو اصطلاحات علمی استعمال ہوتی ہیں اور ابتک ڈیڑھ سو سال میں جو اصطلاحیں عام طور پر اردو ترجموں تالیفوں میں استعمال ہوئے اون کی فرہنگ شائع کرنے میں اردو زبان بولنے والوں کا کوئی نقصان نہیں۔ بلکہ کام آسان کرنا ہے آیندہ اچھے الفاظ وضع اور عام پسند ہو جائیں تو نیا اڈیشن فرہنگ اصطلاحات کا شائع ہو سکتا ہے اور متبادل و مترادف الفاظ کے طور پر جدید و سابق اصطلاحوں کو درج کردیا جاسکتا ہے۔ ایک کشش قلم یا حکم سے ڈیڑھ سو سال کی کوشش نابود نہیں ہوسکتی۔

۳ - دفاتر سرکاری کے مروجہ اصطلاحات اور قانونی اصطلاحات کی فرہنگ خواہ کسی زبان کے الفاظ ہوں۔ انگریزی۔ فرانسیسی۔ پرتگالی۔ عربی۔ فارسی۔ تلنگی۔ مرہٹی۔ جو بطور اصطلاح سرکاری دفاتر میں مروج نیز انگریزی الفاظ کے ترجمے اور برطانوی ہند کے اصطلاحات کے مترادفات کی یکجائی تھوڑی محنت کی متقاضی ہے۔ ایک مترجم ایک مرتب کو اس کے لئے مخصوص کردیا جائے ہر دفتر اور سررشتہ سے مراسلت سے ان کو فراہم کیا جائے تو بآسانی یہ کام ایک سال کے اندر مکمل ہو سکتا ہے۔ محکمۂ فینانس کی گشتی متعلق ترویج اردو میں ایسی فرہنگ کی ترتیب کا حکم ہے محکمۂ فینانس کو اس کا جلد تصفیہ فرمانا چاہئے کہ اوس کی گشتی کے اس حکم کی تعمیل کس سررشتہ سے متعلق کی جائے۔ چونکہ باب حکومت کا یہ حکم ہے اس لئے کچھ رقمی گنجائش بھی منظور کیجا سکتی ہے۔

۴ - جغرافیہ کے نقشے اور اٹلاس ہر ایک علمی زبان کے لئے جیسے کچھ لازمی ہیں اور جیسا کچھ اہتمام یورپ کے ہر ملک اور ہر زبان میں کیا گیا ہے اوس کے مقابل اردو جیسی کچھ بے مایہ ہے ظاہر ہے تمام دنیا کے متعلق جو نقشے اور اٹلاس وغیرہ مدارس سرکاری کو مطلوب ہوتے ہیں ان کی حالت بھی کچھ عمدہ نہیں ہے۔ مدارس وسطانیہ اور فوقانیہ کے طلباء کیلئے لانگ منس کمپنی کا مرتبہ و مطبوعہ نقشہ کا جو حصہ ممالک محروسہ کا ہے اوس کے حسن و قبح کے انداز کیلئے اوس کے مندرجہ اسماء مقامات قابل ملاحظہ ہیں۔ کہامیٹ - وارنگل۔ آسائی۔ بہیر۔ کارنل نگر۔ نل گنڈہ۔ ان مقامات میں جہاں آسائی ایک غیر معروف گاؤں کا نام درج ہے وہاں جالنہ میدک۔ سنگا ریڈی۔ جیسے اہم مقامات کا نام متروک ہے۔ کل ممالک محروسہ کا نقشہ ایک صفحہ پر دکھانے کے بجائے تمام ہندوستان کے ساتھ اس کو شامل کردیا گیا ہے۔ اضلاع کے مدارس اور دفاتر سرکاری میں ضلع۔ تعلقہ کے مستند نقشوں کی فراہمی کی ضرورت ہے۔

اور حسب ضرورت وہ فراہم نہیں کئے جا سکتے۔ بلکہ ممالک
کے سررشتہ بندوبست و تعمیرات میں اضلاع کے
متعلقہ نقشوں کی تیاری کا کافی انتظام ہے۔ دفتر طبع
اور اس کی شاخ جامعہ عثمانیہ میں نقشوں کی تیاری کا
ممکن ہے۔ سررشتہ جات۔ بندوبست۔ تعمیرات۔
لوکلفنڈ۔ تعلیمات۔ تالیف و ترجمہ۔ جامعہ عثمانیہ کے
مشترکہ تعاون سے نہ صرف ممالک محروسہ کے نقشے اور
اور اٹلاس بلکہ تمام دنیا کے نقشوں اور اٹلاس کی
نسبت بھی کام نہایت آسانی سے ہو سکتا ہے جو
سارے ہندوستان کے لئے مستند ہو جائیگا اور
تمام ملک کی ضرورتیں پوری ہوں گی اس کام میں
سررشتوں کے سوا حیدرآبادی ادارے اور خدا ان
علم ہاتھ بٹا سکتے ہیں۔

۵۔ مدارس اور عوام کے استعمال کیلئے اردو
میں چھوٹی متوسط تفصیلی لغت بھی ملک کی اہم
ضروریات سے ہے۔ فرہنگ آصفیہ کا مکمل نسخہ
اب بازار میں ملتا نہیں۔ امیر اللغات کی صرف دو
جلدیں طبع ہوئی ہیں۔ انجمن ترقی اردو نے بہت
کچھ روپیہ صرف کیا مگر ہنوز ملک کی ضرورتیں رفع
نہ ہو سکیں۔

۶۔ اردو کے متعلق جو علمی ادارے کام
کر رہے ہیں خود سرکاری غیر سرکاری اون کیلئے ضروری
ہے کہ خدمت گزاران اردو سے خود ربط پیدا کریں

اس کا انتظار نہ کرنا چاہیئے کہ ان کے پاس افراد آئیں
بلکہ افراد کو اور ملک کے اہل علم کو جو کسی قسم کا بھی
علمی ادبی کام کرتے ہوں تلاش کر کے ایسا کام لیا جائے
جو ملک کے لئے سود مند ہو۔ ذوق علم و ادب رکھنے
والے ملک میں موجود ہیں خفیف معاوضہ پر اون
کی ہمت افزائی ہو تو بآسانی ایثار کے ساتھ کام
کرنے آمادہ ہو سکتے ہیں۔ حیدرآباد میں متعدد
ادارے ہیں جنھوں نے اجتماعی اور انفرادی کوشش
اردو کی خدمت کے لئے کی اور کر رہے ہیں ان سب
کو ساتھ لے کر اجتماعی قوت بڑھائی جا سکتی ہے۔
کل ہند اردو کانگریس نے برطانوی ہند کے
افراد اور اداروں کو تلاش کرنے میں
بڑی جد و جہد کی مگر خود ملک کے اندر سالہا
سال سے اردو کے خدمت گزار ہیں اون کو
ساتھ لینے کی کوشش نہیں کیگئی۔

۸۔ برطانوی ہند کے ایسے علاقوں میں
جہاں اردو سارے صوبہ کی عام اور مادری زبان ہے
ان جامعات میں مثل جامعہ عثمانیہ اردو کو تعلیمی
زبان بنانے میں کوئی مشکل حائل نہیں ہے صوبہ
متحدہ و پنجاب کے جامعات میں کس قدر سہولت
موجود ہے وہ ظاہر ہے۔ صرف تعصب اردو کے
مقابل ہندی کو بھی بخط ناگری لا کھڑا کر دیا گیا ہے
جو اس میں حائل ہے۔ مگر مسلم یونیورسٹی علیگڈھ اور

جامعہ ملیہ دہلی کو کوئی مشکل اس کی تقلید میں درپیش نہیں۔ مسلمانوں کے غیر سرکاری اور دینی مدارس۔ دیوبند۔ ندوہ وغیرہ میں جہاں طبیعات فلسفہ کا درس انتہائی اہتمام سے دیا جاتا ہے۔ جدید نصاب اردو جامعہ عثمانیہ کو دے کر طلبہ کو زمانہ حال کی ضروریات کیلئے کارآمد بنایا جاسکتا ہے۔

۹- سررشتۂ تالیف و ترجمہ کا کام سرکارعالی سے علمی ادبی خدمات کے وضائف جو افراد اور ادارں کو مل رہے ہیں اون کے کام کی جانچ ہونی چاہئیے۔

۱۰- ہندوستان میں حکومت حیدرآباد ہی وہ واحد بڑا علاقہ ہے جس کی سرکاری زبان اُردو ہے مگر اوس کے سرکاری کاروبار میں روزبروز انگریزی داخل ہوتی جاتی ہے چند دن قبل انسدادی گشتی محکمہ فینانس نے جاری کی ہے مگر عملاً اس گشتی کی چنداں تعمیل نہ ہوسکی۔ اس پر غور ہونا چاہئیے۔

۱۱- سرکارعالی کے دیہی دفاتر میں ملکی زبان میں کام ہوتا ہے اب ممالک محروسہ کے نیز قصبات و مواضعات کی آبادی میں اردو اور ملکی زبان کی تعلیم ملا کر دیجاتی ہے اور خاص کر قصبات و مواضعات میں دفاتر دیہی کے تقریباً تمام کارکن اردو نوشت و خواند سے بخوبی واقف ہیں اس لئے مفاد عامہ کے لحاظ سے دفاتر دیہی کو اردو میں ہونے کی پالسی سرکار کو قایم فرمانا چاہئیے۔ خاص کر ایسے سرحدی اضلاع میں جہاں مرہٹی۔ تلنگی۔ کنڑی زبانوں کے اختلاف موجود ہیں وہاں اردو بآسانی رائج کیجاسکتی ہے۔

۱۲- کمپنیوں۔ کارخانوں کے دفاتر اور تجارتی کاروبار میں خاص کر ممالک محروسہ میں اور برطانوی ہند کے اردو علاقوں میں انگریزی کاروبار ہوتا ہے یہاں تک کہ رقمی رسید انگریزی میں لکھی جاتی ہے حالانکہ رسید جو لکھتا ہے اور جس کو رسید دیجاتی ہے دونوں اردو داں ہوتے ہیں انگریزی کسی طرح اس کے لئے موزوں نہیں ہے۔

۱۳- تاریخ ہند اردو دکن کو معیاری پایہ پر لکھانا پیش نظر ہے۔ جہاں تک تاریخ ہند و دکن عہد اسلام کا تعلق ہے اوس کا بڑا مواد فارسی کتابوں اور قلمی تاریخی نوشتوں اور بڑی حد تک حیدرآباد میں محفوظ ہے۔ ہندوستان کے لئے عہد مسلمانان کی بشمول تاریخ عہد مسلمانان دکن دونوں کے لئے معیاری کتابوں کا سلسلہ آسانی سے اردو ہی میں اولاً لکھا جاسکتا ہے اور بعد میں جب ضرورت ہو تو انگریزی میں ترجمہ ہوسکتا ہے۔ حیدرآباد میں سرکاری اور غیر سرکاری کتب خانے تاریخی کتابوں اور تاریخی نوشتوں سے معمور ہیں اور بہترین افراد بھی محنت کے لئے آمادہ ہیں۔ صرف اون میں اجتماعیت پیدا کرنا چاہئیے۔

۱۴- تمام اردو کتابوں کا کتب خانہ اردو کتابوں کی فہرست بھی حیدرآباد کیلئے ضروری ہے اس کے لئے انفرادی کوششیں علیحٰدہ علیحٰدہ جاری ہیں اون میں اجتماعی ربط پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ امور متذکرۂ بالا کے متعلق اردو کے بہی خواہ اور ادارے غور فرما سکتے ہیں:

غزل

ڈر ہے وہ نظر دل کو تماشا نہ بنادے
پیکانِ مصیبت کا نشانہ نہ بنادے

خود مجھکو مری ذات سے بیگانہ بنادے
اے حسن کے مالک مجھے دیوانہ بنادے

ساقی تجھے اُن مد بھری آنکھوں کی قسم ہے
پھر مست نظر سے مجھے مستانہ بنادے

وہ صحبتِ پُر کیف کہاں اور کہاں ہیں
جو مجھکو غمِ زیست سے بیگانہ بنادے

آنکھوں میں حیا، نیچی نظر، لب پہ تبسم
اس طرح چلا آ مجھے دیوانہ بنادے

کیا ذکر وفاداریٔ عاشق سرِ محفل
دشمن کہیں اس کو بھی نہ افسانہ بنادے

پھر چشمِ تماشا کو عظیم سخن آراء
اُس کے رخِ پرنور کا پروانہ بنادے

عظیم حیدرآبادی

بوسۂ رخصت

بڈھے باپ نے آنکھوں میں آنسو بھر کے کہا "بیٹی جا رہی ہو —— میری بیٹی —— آج تم اس گھر سے چلی جا رہی ہو۔ اچھا جاؤ —— تم اپنی سسرال جاؤ —— تمہیں خوشی جاؤ ——" "ہاں بابا جا رہی ہوں۔ اس گھر سے آج بچھڑ رہی ہوں" اس نے اپنے ریشمی رومال سے آنسو پوچھتے ہوئے کہا "آج میں اپنی ماں —— اس کی آواز گلوگیر ہوگئی"
"کاش وہ آج زندہ ہوتی" —— باپ کی آواز حلق میں پھنسنے لگی۔ "اچھا بیٹی اب جاؤ! ——"
بچی آخری دفعہ اپنی نظر میں باپ اور اپنے پرانے مسکن پر ڈالتی ہوئی موٹر میں بیٹھ گئی۔

جناب مرزا سہام الدین صاحب

گھریلو طیور خوشیاں منا رہے تھے، سورج پہاڑ کی اوٹ میں چھپ رہا تھا، بادل رقص و سرور کی محفلیں گرم کر رہے تھے۔
آج پھر بوڑھے نواب کی لڑکی دوشیزگی کے عالم میں نہیں بلکہ عورت بنی ہوئی اپنے عزیز باپ کے گھر میں خونی ارادہ سے داخل ہوئی، باپ ایک کوچ پر پڑا کھانس رہا تھا۔ بیٹی کو دیکھ کر

خوشی سے اچھل پڑا۔ سینہ سے لگایا۔ دل سے دعائیں دیں، آخر پدرانہ محبت تھی۔

موت کسی نہ کسی حیلہ ہی سے آتی ہے۔ روح قبض کرنا عزرائیل کا شیوۂ زندگی اور مقصد حیات ہے کبھی وہ کسی زہریلے کیڑے کی صورت میں، کبھی خونخوار درندے کی شکل میں اور کبھی کبھی حسین و جمیل عورت کے روپ میں، ہم انسانوں کی زندگی طلب کرنے آتا ہے۔

پدرانہ محبت کے نشانات ابھی اس کے عارض گل جیسے سرخ رخساروں سے مٹنے بھی نہ پائے تھے کہ وہ اپنے باپ کو "دام سازش" میں گرفتار کرنے پر تیار ہوگئی۔ چائے تیار کرتے کرتے شمیم کا چہرہ کسی نامعلوم خوشی پر کندن کی طرح چمکنے لگا۔ اس نے آہستہ سے کہا " موقع! —— زرین موقع!! —— یہاں کوئی نہیں!!! —— وہ چائے میں کچھ ملائے، آخری جام بنائے، سامان موت تیار کئے باپ کے کمرہ میں داخل ہوئی۔ یہ وہی باپ تھا جس کی شفقت خدا کی رحمت تھی۔ جس کی محبت خوشی کا خزانہ اور جس کی مسرت زندگی کا دفینہ ہوا کرتی تھی۔ بوڑھا سلیم کچھ لکھنے میں مصروف تھا۔ شمیم نے کہا "بابا! چائے تیار ہے"

"ہاں میری بچی ابھی آیا" —— باپ نے کہا وہ قریب کے صوفے پر بیٹھی باپ کو موت کی دعوت دے رہی تھی۔ سلیم نے کچھ لکھتے لکھتے اپنا چہرہ اوپر اٹھایا۔ بیٹی کو کسی خیال میں مستغرق پاکر اس نے کہا "بیٹی کس فکر میں ہو، تمہاری ماں مر چکی۔ عرصہ ہوا۔ اب ہمارے دن بھی قریب ہیں۔ فکر کرنے کی ضرورت نہیں، ماشاءاللہ سے تم ہوشیار ہو۔ تم چائے پی لو - میں ابھی آیا"

بیٹی کا رنگ یکایک بدل گیا" اوہ تاریک مستقبل میرے باپ پر روز روشن کی طرح روشن ہے غضب ہوگیا کیا کروں میرے اللہ" وہ یہ سوچتی ہوئی چائے کے میز کی طرف پلٹی۔ اس کی آنکھوں میں دنیا تاریک تھی۔ رسوائی کے خوف اور ندامت کی دہشت میں اس نے پیالی ختم کی۔ پھر انہی خیالات کے عمیق سمندر میں ڈوب گئی - پیالیوں کی ٹکر کی سی آواز سنائی دی - وہ چونک پڑی - دیکھا باپ پیالی اٹھا رہا ہے - اس کے چہرے پر ناگوار شکنیں پڑی ہیں۔ ضمیر چلایا، بچالے —— اپنے بوڑھے عزیز شفیق، مہربان باپ کو موت کی خونخوار آغوش سے ہم کنار ہونے سے قبل بچالے۔ ——" وہ ایک پوشیدہ خوف سے کانپنے لگی۔

" ابّا!" وہ چلا اٹھی ——

" ہاں میری بیٹی " باپ نے کہا

کیا ہی شیریں الفاظ ہیں۔ میں آج اپنے بوڑھے باپ کا خاتمہ کیا چاہتی ہوں۔ ہمیشہ ہمیشہ کیلئے

اسے دور کر دینا چاہتی ہوں۔ صرف دولت کے لئے ہاتھ کا میل۔ قوت بازو کا فیصلہ چاہتی ہوں۔ میں اپنے خاوند کے مشورے سے اتفاق نہیں کر سکتی۔ وہ خونی ہوگا۔ اور میں مجرم گردانی جاؤنگی۔ ہائے میرے ابا! کیا میں ایسا کر سکتی ہوں۔ میں مجبور ہوں، نہیں، نہیں!! دنیا میں کوئی انسان مجبور نہیں — اللہ کیا کروں، اپنا مقصد ظاہر کر دوں سازش کا دفتر کھول دوں۔ اپنا خونی ارادہ بتا دوں بھیانک مستقبل کی تاریکی کو روشنی سے بدل دوں۔ نہیں۔ میں مرنے نہیں دوں گی — یہی وہ مختلف خیالات تھے جو موج دریا کی طرح اس کے دماغ سے ٹکرا رہے تھے۔ سینما کی متحرک تصویروں سے تیز — باپ اس کے چہرے کے اترتے چڑھتے رنگوں کو غور سے دیکھتا ہوا اپنی پیالی پھر ہونٹوں تک لے گیا۔

"ابا —" اس نے پھر چلا کر کہا اور ساتھ ہی پیالی تھام لی.... وہ اپنے دائیں ہاتھ میں اپنے باپ کی جان کو پکڑے ہوئے تھی۔

"ابا — اس پیالی کو پھینک دو — خوفناک سازش — زہر۔ میں گنہگار ہوں۔ بخش دو، اس سازش میں میرا ہاتھ ہے۔ میں کیا کروں مجبور تھی۔ شوہر کی بات۔ ہائے منصور —" سلیم زیر لب مسکرا رہا تھا۔ مسکراہٹ کے پردہ میں حقارت اور نفرت کے جراثیم آمیز تھے گویا اس کو پہلے ہی سے آئندہ واقعات کی خبر تھی۔

فضا کو چیرتی ہوئی کھڑکی میں سے سنسناتی ہوئی ایک گولی سلیم کے جگر کو چاک کرتی ہوئی پار ہو گئی۔ — ساتھ ہی شمیم کی چیخ بھی سنائی دی۔ وہ دیوانی ہنسی ہنس رہی تھی۔ باپ کا خون فوارے کی طرح اچھل اچھل کر کمرے کی چیزوں کو رنگین بنا رہا تھا۔ شمیم پر غنودگی طاری تھی۔ باپ ایک طرف کراہتا ہوا پڑا تھا۔ منصور اپنا پستول چھپائے کمرے میں داخل ہوا۔ سلیم کی نعش دیکھی۔ روح قفس عنصری سے پرواز کر چکی تھی وہ ایک نہ ختم ہونے والی منزل کی طرف روانہ ہو چکا تھا۔ پیالی خالی پڑی تھی۔ طشتری میں تھوڑی سی چاء۔ اور خون کا مرکب موجود تھا۔ ایک کاغذ پر جلی حرفوں میں کچھ لکھا دکھائی دیا۔ جس پر خون کا دھبہ بھی تھا جو آہستہ آہستہ ان الفاظ کی اس وصیت کو اپنی آغوش میں لے رہا تھا۔ جو اس نے خود قلمبند کئے تھے۔

"میری دولت کی حقیقی اور جائز"

"وارث شمیم"

آہ غضب ہو گیا نادان تو نے غلطی کی۔ یہ خیال کر کے کہ دھونے سے وصیت کے سب الفاظ ظاہر ہو جائیں گے۔ اس نے اس کو گری ہوئی چائے میں ڈبو دیا۔ افسوس بجائے دھلنے کے

اس پر خون اور چاٹنے کی گہری استر کاری ہو گئی۔ رہے سہے الفاظ بھی اس کی آغوش میں دفن ہو گئے۔

شمیم تو ختم ہی ہو چکی تھی۔ جس نے دوسرے کو موت کا مزہ چکھانا چاہا خود اسی کو اس کی لذت سے بہرہ اندوز ہونا پڑا۔ دوسرے کیلئے زہر کا پیالہ بنایا تھا۔ لیکن وہ اسی کی قسمت کا تھا۔ خیالات کی انوکھی دنیا میں جب وہ مستغرق تھی تو اس کو سوائے خوف رسوائی اور شرمندگی کے کسی شئی کا مطلق خیال نہ رہا۔ آنکھوں میں دنیا تاریک تھی۔ زہریلا پیالہ بڑھ کر شمیم کے نرم و نازک ہونٹوں کے بوسہ کا شرف حاصل کر چکا تھا۔ دوسری پیالی بے ضرر تھی۔

قبل اس کے کہ منصور اپنا دماغ گولی سے پاش پاش کرتا۔ انصاف کے مضبوط ہاتھوں میں گرفتار ہو گیا۔

نہ ختم ہونے والی آرزو کا ناکام انجام ـــــ کیسا عبرت ناک ہے ؎

نوٹ :۔ مسلمانوں کی علمی جد وجہد خواجہ معین الدین صاحب کے مولفہ کتاب کا ایک حصہ ہے جو زیر ترتیب ہے۔

مسلمانوں کی علمی جد وجہد

جناب محمد خواجہ معین الدین صاحب عابد

یہ نہ سمجھ لیجئے کہ قرآن شریف علوم و فنون سے متعلق کوئی مستقل تصنیف ہے۔ یہ تو مسلمانوں کی معاشی، تمدنی، مذہبی، سیاسی اور اخلاقی زندگی کا قانون مقدس ہے۔ اسی لئے علوم فلکیات جغرافیہ، ریاضی، تاریخ، ادب اور فلسفہ وغیرہ کے متعلق قرآن میں سوائے اشاروں اور اساسی اصولوں کے تذکرے کے کوئی تفصیلی روشنی نہیں ڈالی گئی۔ اور یوں بھی ایک عربی شاعر کے قول [1] کے مطابق "گو قرآن ہر قسم کے علوم و فنون کا خزانہ ہے لیکن انسانی ذہن ان کے سمجھنے سے قاصر ہیں" مگر منچلے عربوں نے کلام مجید کو شمع راہ بنا کر ہر علم کی جستجو شروع کی۔ ان کے ہاتھوں میں کلام اللہ کی مشعل تھی اور دل و دماغ تعلیم نبوی سے منور تھے۔ اللہ اکبر! ان کی ہمتیں!! جو کام مشکل ہوتا وہی کر دکھاتے۔ اپنی پے در پے فتوحات کے نشہ میں بدمست نہ ہوئے اور تحصیل علم کی خاطر یونانیوں کے سامنے زانوئے شاگردی تہہ کیا۔ یہاں یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہیئے کہ

---

[1] جمیع العلم فی القرآن لا کن ۔ تقاصر عنه افهام الرجالِ ۔

انھوں نے یورپ[1] کے یونانیوں کی نہیں بلکہ اسکندریہ کے یونانیوں کی شاگردی اور اتباع کی۔ یہی نہیں بلکہ جن جن ممالک اور جن جن زبانوں میں علمی ذخیرہ ملتا گیا بغیر کسی تنگدلی اور تعصب کے حاصل کرتے گئے۔

ترجمے ۲۔ علمی دنیا میں مسلمانوں کا سب سے پہلا کام دوسری زبانوں کی کتابوں کے ترجمے کرنا اور شرحیں لکھنا تھا۔ عربوں[2] کو یونانی طب، حکمت، ریاضی اور ہیئت سے بہت دلچسپی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ انھوں نے یونانی علماء و حکماء مثلاً بقراط، اقلیدس، بطلیموس اور جالینوس وغیرہ کی قابل قدر کتابوں کے ترجمے چند ہی سال میں کر ڈالے۔ یونانی منطق اور فلسفہ کی بھی بڑی قدر کی۔ انھوں نے یونانی، کلدانی، سریانی، عبرانی، نبطی، قبطی اور سنسکرت زبانوں کی مشہور کتابوں کے ترجمے کئے۔ اس طرح دنیا کی مختلف قوموں اور زبانوں کے علمی ذخائر عربی میں منتقل کئے۔

مسلمانوں نے خاص طور پر عبرانی زبان پر بہت زیادہ توجہ صرف کی، کیونکہ توریت، انجیل، اور زبور کی اصلی زبان عبرانی ہی ہے۔ اس کے علاوہ اکثر صحف آسمانی اسی زبان میں ہیں۔

عموماً ایسا ہوتا کہ مسلمان جن زبانوں کی کتابوں کے ترجمے کروانا چاہتے ان کے علماء کو اپنے دربار میں بلواتے، بڑے بڑے عہدے عطا کرتے اور باضابطہ شاگرد بنتے۔ یا بعض اوقات ایسا بھی ہوتا کہ علم و فن کی محبت بے چین کر دیتی اور جہاں سرچشمۂ علم ہوتا وہاں پیاسے کی طرح خود ہی پہنچ جاتے۔ طرح طرح کی کڑیاں جھیلتے۔ سفر کی صعوبتیں برداشت کرتے اور نایاب کتابیں سونے کے مول نہیں بلکہ جواہرات کے تول خریدتے۔

میرے اس بیان کے ثبوت میں ابوریحان بیرونی کا تذکرہ بطور امتثال امر کافی ہے جس کے ذوق طلب کی نظیر بیسویں صدی میں بھی مشکل سے ملیگی۔

وسیع القلب اور بے تعصب مسلمانوں نے سنسکرت زبان سے بھی کافی اعتنا برتی۔ چنانچہ خلیفہ ہارون الرشید جب ایک مرتبہ بیمار پڑا تو بیسیوں حکیم آئے۔ سینکڑوں علاج کئے گئے۔ ہزاروں تدبیریں برتی گئیں۔ لیکن بادشاہ کی طبیعت رو بہ صحت نہیں ہوئی۔ اطبا عاجز آگئے اور شفا سے مایوس ہوگئے۔ ایک درباری کی تحریک سے خلیفۃ المسلمین نے ہندوستان کے مشہور فاضل پنڈت لنکا کو بلا بھیجا۔ وہ آیا، علاج[3] کیا اور شفا ہوگئی۔ پھر کیا تھا۔ پنڈت لنکا کی قسمت جاگ اٹھی، مزید یہ کہ اس ایک ہندی طبیب کے کمال نے مسلمانوں کو ہندوستانی طب اور دیگر علوم کی طرف متوجہ کیا۔

---

[1] "معرکۂ سائنس و مذہب" صفحہ ۱۴۳ مصنفہ ولیم ڈریپر۔
[2] قرون وسطیٰ میں علمائے عرب و عجم کی علمی تحقیقات (حیدرآباد علمی اکادمی) صفحہ ۹۹ از ڈاکٹر عبدالرحمٰن خان صاحب سابق صدر کلیہ جامعہ عثمانیہ۔
[3] رسائل علامہ شبلی نعمانی صفحہ ۳۳۔

امیر وہ ہے جس کا دل غریب نہ ہو۔

جناب بھارت چند صاحب کھنہ ایم اے آنرز

سیٹھ سلیمان کنچانی

جب لفظ سیٹھ میرے کان میں پڑتا ہے تو مجھے تصور میں لڈو نظر آتے ہیں۔ نہ صرف لڈو بلکہ ان لڈوؤں کو کھاتا ہوا کوئی موٹا سا انسان۔ سیٹھ کے لغوی معنی شاید "مالک" کے ہیں۔ لیکن میری رائے ناقص یہ ہے کہ اس لفظ کے معنی میں موٹاپے کا تخیل بھی کہیں نہ کہیں ضرور ہونا چاہیئے۔ کیونکہ سیٹھ کبھی پتلے نہیں ہوتے۔ وہ کالے۔ گورے۔ لمبے۔ پستہ قد۔ خوبصورت یا بدصورت ہو سکتے ہیں لیکن دبلے کبھی نہیں۔ اگر کوئی شخص دبلا ہوتے ہوئے خود کو سیٹھ کہے تو میں یہ سمجھونگا کہ وہ اصلی سیٹھ نہیں بلکہ نقلی اور بالکل جاپانی قسم کا ہے۔

سیٹھ سلیمان کنچانی بھی صحیح معنوں میں سیٹھ تھے۔ موٹے۔ لکھپتی اور تجارت پیشہ۔ کاروبار کرنے میں وہ ماہر تھے اور صرف اسی کام میں ہاتھ ڈالتے تھے جس میں ہزاروں کا نفع ہو۔ ان کی قسمت کا ستارہ چمک رہا تھا۔ دولت ان کی لونڈی بن چکی تھی۔ لیکن کیا وہ اپنے زر ومال سے مطمئن تھے؟ کیا ان کی زندگی میں آرام۔ چین اور سکھ کی فراوانی تھی؟ یہ وہ سوال ہیں جن کا جواب ان کی زندگی کے چند واقعات دیکھنے سے ملتا ہے۔

سیٹھ سلیمان کنچانی مجرد تھے۔ کیوں تھے؟ اس کا بالکل صحیح جواب دینا ممکن نہیں کیونکہ یہ ان کے دل کا بھید تھا۔ بظاہر تندرست اور ایسی شکل وشباہت کے مالک تھے جن کی شادیاں بچپن ہی میں کر دی جاتی ہیں اور جو بڑھاپے میں اپنی پہلی بیویوں کے مرجانے کی وجہ سے یا ان میں حسن کی کمی اور عمر کی زیادتی ہونے یا پھر اولاد نہ ہونے کی وجہ سے نئی نویلی دلہنوں کی تلاش میں لگے رہتے ہیں۔ نئی نویلی دلہنیں جو دولت کے مقناطیسی اثر سے کھنچی چلی آتی ہیں اور ازدواج کی گرہ میں باندھ دی جاتی ہیں اسلئے لوگوں کو حیرت تھی کہ سیٹھ سلیمان کنچانی دولت۔ گھر بار و موٹر نوکر چاکر وغیرہ رکھتے ہوئے بھی کیوں مجرد تھے حالانکہ وہ آسانی سے ایک دو درجن بیویاں پال سکتے تھے ایک وجہ شاید یہ تھی کہ سیٹھ صاحب شادی کے اخراجات برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں تھے۔ اور دوسری یہ کہ شادی کے بعد بیوی کو کھلانے

پلانے اور اس کی پرورش کرنا بھی ان کو گوارا نہ تھا۔ الغرض کچھ اسی قسم کی وجوہات کی بنا پر وہ اپنی زندگی کے پینتالیسویں سال تک بھی اپنی شادی نہ کرسکے تھے۔ . . . . . .

سیٹھ سلیمان کا ایک منیم تھا چونی لعل بودہی جس کو وہ اپنے فرزند کی طرح سمجھتے تھے چونی لعل بودہی نہایت دیانتدار، محنتی اور قابل اعتماد نوجوان تھا اور اپنی ہنس مکھ طبیعت اور عمدہ کارگزاری کی وجہ سے سیٹھ صاحب کے دل میں جگہ حاصل کرچکا تھا۔

چونی لعل بودہی ہر محنتی نوجوان کی طرح عینک پوش تھا۔ سیٹھ سلیمان کنجانی کے حساب کتاب کو درست رکھنا بھی آسان کام نہ تھا۔ دن میں کئی گھنٹے حسابات کی جانچ پڑتال کرنا پڑتی تھی جس سے آنکھوں پر سخت بار پڑتا تھا۔ آخر چونی لعل کی آنکھیں سرخ سی رہنے لگیں اور اکثر ان میں سے پانی بہا کرتا۔ سیٹھ سلیمان نے جب اپنے منیم کی یہ حالت دیکھی تو ان سے رہا نہ گیا۔ ایک دن چونی لعل کو حکم دیدیا کہ جاکر آنکھوں کے اعلیٰ ترین ماہر کو بتاؤ چنانچہ چونی لعل حکم کی تعمیل میں جاکر بہترین معالج چشم سے مشورہ و علاج کرایا۔ چالیس روپے کا بل جب سیٹھ صاحب کی خدمت میں پیش کیا گیا تو خود ان کی اپنی آنکھیں غصہ سے لال ہوگئیں اور افسوس کے مارے ان میں سے پانی بہنا شروع ہوگیا۔ ایک عرصہ تک وہ چونی لعل کو بل کی ادائیگی کے متعلق ٹالتے رہے آخر تنگ آکر منیم نے اس رقم کو سیٹھ صاحب کے متفرق اخراجات میں ڈال کر رقم وصول کرلی لیکن سیٹھ سلیمان نے یہ پسند نہ کیا اور اس رقم کو پھر حساب کی کتاب میں سے کٹوادیا۔ آخر جب چونی لعل رقم وصول ہونے سے بالکل ناامید ہوچکا تھا ایک دن سیٹھ سلیمان گھوڑ دوڑ میں کچھ رقم جیت کر لائے۔ اور چونی لعل کی آنکھوں کے سامنے دس دس روپے کے چار نئے نوٹ پھیلا کر کہنے لگے " لو بھئی تمہارا قرضہ ادا کردیتا ہوں "

یہ عجب نظارہ تھا۔ سیٹھ جی نئے نوٹ چنی لعل جی کی آنکھوں کے سامنے پھیلائے ہوئے کھڑے تھے ان نوٹوں کو چونی لعل کی آنکھیں دیکھ رہی تھیں اور سیٹھ سلیمان کی بھی۔ بیشتر اس کے کہ چونی لعل ہاتھ بڑھا کر نوٹ لے لیتا۔ سیٹھ نے اپنا ارادہ بدل دیا اور کہا " ایسے صاف اور کھرے کھرے نوٹ میں تم کو کس طرح دے سکتا ہوں۔ چونی لعل تم حساب میں یہ رقم لکھ کر چالیس روپیہ وصول کرلو " پھر نوٹ اپنی جیب میں ڈال دیئے اور اطمینان کی سانس لی۔

سیٹھ سلیمان کنجانی کو گھوڑ دوڑ کا بہت شوق تھا

لیکن روپیہ جمع کرنے کا اس سے کہیں زیادہ تھا اس لئے وہ اکثر دوڑ کے میدان میں گئے بغیر گھوڑوں پر شرطیں لگایا کرتے تھے ایک دفعہ ایک نہایت اہم دوڑ کے دن سیٹھ سلیمان اپنی موٹر میں دوڑ کے میدان کے باہر کھڑے تھے۔ دوڑیں ختم ہو چکی تھیں اور ان کے نتائج اخباروں میں چھپ چکے تھے۔ لڑکے چلا چلا کر اخبار بیچ رہے تھے۔ سیٹھ سلیمان نے ایک لڑکے کو بلایا۔ لڑکا اخبار لے کر آیا تو سیٹھ نے کہا "میں دو منٹ میں ریس کے نتائج دیکھکر اخبار تم کو واپس دے دوں گا۔ دو پیسے لے لو"

اخبار والے لڑکے نے حقارت سے سیٹھ صاحب کی طرف دیکھا اور کہا "واہ سیٹھ جی کیا اسی لئے بلایا تھا" یہ کہکر لڑکا تو ہزاروں صلواتیں سناتا چلاتا ہوا چلتا بنا اور سیٹھ جی نتائج دیکھنے کے لئے تڑپ گئے۔ آخر اپنے شوفر سے کہنے لگے "کیوں خلیل تم اخبار کیوں نہیں خریدتا ہے"

خلیل نے کہا "سیٹھ جی میں کیوں اخبار خریدوں۔ میں نے گھوڑوں پر کوئی شرط ہی نہیں لگائی تھی"

اب سیٹھ جی نے چونی لعل سے پوچھا "چونی لعل تم ہی اخبار خرید لو"

چونی لعل نے کہا کہ "سیٹھ جی میں تو کل دفتر میں دیکھ لوں گا۔ مجھے بھی گھوڑوں سے دلچسپی نہیں"

سیٹھ سلیمان نے اس پر ایک آہ دلخراش بھری اور کہا "تم دونوں بیوقوف ہو۔ خیر چلو کلب چل کر اپنے دوست وجو بھائی سے اخبار مانگ لیں گے"

چنانچہ سیٹھ سلیمان کلب گئے لیکن وہاں جاکر پتہ چلا کہ وجو بھائی وہاں بھی نہ ملے۔ آخر ہار کر سیٹھ سلیمان نے سوچا کہ چلو گھر واپس چلتے ہیں چھوٹے بھائی شکیب نے ضرور اخبار خریدا ہوگا اس سے لے کر دیکھ لیں گے۔

گھر پہنچنے پر شکیب سے ملاقات ہوئی۔ شکیب ایک آرام کرسی پر دراز اخبار پڑھ رہا تھا۔ سیٹھ سلیمان کنجانی نے شکیب سے اخبار مانگا۔ شکیب بھی عجیب مسخرہ تھا۔ وہ بھائی سلیمان کی کنجوسی سے پریشان تھا۔ اس نے پوچھا کہ سیٹھ نے آتے ہوئے راستہ میں اخبار کیوں نہیں خریدا۔ سیٹھ سلیمان نے تمام داستان سنائی کہ کس طرح اخبار بیچنے والے لڑکے نے دو پیسے لے کر دو منٹ کے لئے اخبار دینے سے انکار کیا تھا۔ کس طرح وجو بھائی کی تلاش میں کلب اور پھر چوپاٹی کا چکر لگانا پڑا تھا اور اب . . . . . .

شکیب نے مسکراتے ہوئے کہا "لیکن یہ اخبار تو میرا ہے میں کیوں دوں"

سیٹھ جی نے کہا "تیرا ہے تو کیا ہوا میرے دیکھنے سے گھس تو نہیں جائیگا"

شکیب "گھس تو نہیں جائیگا لیکن اخبار میرا ہے"

اور میں دینا نہیں چاہتا۔"
سیٹھ سلیمان "اچھا نہ سہی۔ مجھے گھوڑ دوڑ کے نتائج پڑھ کر سنا دو۔"
شکیب "میں اخبار زور سے پڑھنے کا عادی نہیں ہوں۔"

اس پر سیٹھ سلیمان کنجانی کو بہت غصہ آیا لیکن کیا کر سکتے تھے۔ خون کے گھونٹ پی کر رہ گئے۔ دوسرے دن صبح جب دفتر کا اخبار آیا تو کہیں جا کر سیٹھ جی کو اخبار دیکھنا نصیب ہوا۔

ایک مرتبہ گرمی کے دنوں میں سیٹھ جی دفتر میں بیٹھے ہوئے کام کر رہے تھے۔ لاکھوں کا کام جس میں ہزاروں کا نفع تھا۔ گرمی بہت تھی انہوں نے چونی لعل سے کہا "چلو چنی لعل چل کر ٹھنڈی ٹھنڈی آئسکریم کھا آئیں۔"

چونی لعل سیٹھ جی کے ساتھ ہو لیا۔ دونوں نے مل کر آٹھ آٹھ آنے کی آئسکریم کھائی۔ اٹھتے وقت سیٹھ سلیمان کنجانی نے اپنی جیب سے ایک اٹھنی نکال کر چونی لعل کو دی کہ اپنی اٹھنی ملا کر بل ادا کرے۔ چونی لعل نے بل تو ادا کر دیا لیکن دفتر میں آ کر کھاتہ میں درج کر دیا۔"

" سیٹھ سلیمان کنجانی کے ساتھ آئسکریم کھانے کے ضمن میں آٹھ آنے" اور آٹھ آنے اپنی جیب میں رکھ لئے۔ سیٹھ سلیمان نے جب حساب دیکھا تو چونی لعل کو اس مد کے متعلق پوچھا۔ چونی لعل نے کہا کہ "آئسکریم کھانے آپ ساتھ لے گئے تھے میں پیسے کیوں دوں۔"

سیٹھ جی نے کہا "لیکن آئسکریم کھائی تو تم نے تھی۔"

چونی لعل "کھائی تو ضرور تھی لیکن اگر مجھے نہ ساتھ لیجاتے تو میں آئسکریم ہرگز نہ کھاتا۔"

اس پر سیٹھ صاحب کچھ ناراض ہوئے۔ ذرا جھنجھلائے۔ لیکن آخر کتاب پر دستخط کرنا پڑا۔

سیٹھ سلیمان کنجانی کے دفتر میں ایک ڈبہ لگا ہوا تھا جس پر لفظ خیرات لکھا ہوا تھا ہر ایک بل کی ادائی کے وقت رسید دینا ہوتی تھی اور ہر ایک رسید پر ایک آنے کا ٹکٹ بھی چسپاں کرنا پڑتا تھا۔ لیکن جو رقمیں چک کے ذریعہ وصول کیجاتی تھیں ان کے لئے رسید دینے کی ضرورت نہ ہوا کرتی تھی اس لئے ہر ایسی ادائی کے ضمن میں جو ایک آنے کی بچت ہوا کرتی تھی اس کو خیرات کے ڈبہ میں ڈال دیا جاتا تھا۔ چونکہ کاروبار لاکھوں کا ہوا کرتا تھا۔ اس لئے دن میں ستر اسّی آنے اس ڈبہ میں جمع ہو جاتے تھے۔ اس کا حساب بھی چونی لعل رکھا کرتے تھے۔

کچھ عرصہ تک تو ڈبہ کا حساب ٹھیک رہا لیکن بعد میں یہ ہونے لگا کہ ہر صبح کو ڈبہ کھولنے پر چار آنے کم ہو جانے لگے۔ چونی لعل نے جب یہ ماجرا

دیکھا تو سیٹھ سلیمان کنجانی کو رپورٹ کی سیٹھ نے سُن کر اضطراب کا اظہار کیا کہ یہ بہت بری بات ہے ایسا ہرگز نہ ہونا چاہیئے۔ چونی لعل نے اس بات کا ذکر شکیب سے بھی کیا۔ شکیب نے کہا کہ میں دریافت کروں گا۔ آخر ایک دن شکیب نے چونی لعل سے کہا کہ چور کوئی باہر کا شخص نہیں ہے۔ یہ سب سیٹھ سلیمان ہی کی کارستانی ہے۔ انہوں نے ڈبہ کے قفل کی ایک کنجی بنوا رکھی ہے اور ہر رات اس میں سے چار آنے نکال کر صبح کا ناشتہ انہی پیسوں سے کرتے ہیں۔

چونی لعل نے اس رات خود کو ڈبہ کے پاس ہی چھپا رکھا۔ وقت مقررہ پر سیٹھ جی صبح کے ناشتہ کے لئے رقم نکالنے آئے۔ جب وہ رقم نکال رہے تھے تو چونی لعل نے سامنے آکر ان کو پکڑ لیا۔ سیٹھ جی بہت شرمندہ ہوئے لیکن کہنے لگے۔

" دیکھو چونی لعل یہ پیسہ میرا ہی ہے اگر میں لے لوں تو اس میں کیا ہرج ہے "

چونی لعل نے جواب دیا کہ سیٹھ صاحب روپیہ تو آپ ہی کا ہے لیکن آپ ہی کے حکم سے اسے خیرات کے کاموں کے لئے جمع کیا جا رہا ہے آپ کا اس طرح ہر روز چار آنے نکال لینا کسی طرح بھی ٹھیک نہیں "

سیٹھ سلیمان کنجانی نے کہا۔

" چونی لعل۔ آخر یہ کیوں ٹھیک نہیں، جب یہ رقم خیرات کے لئے جمع کی جا رہی ہے تو ظاہر ہے کہ اسے خیرات کے کام میں استعمال کروگے۔ غریبوں ہی کو کھانا کھلاؤ گے، بس سمجھ لو کہ میں بھی فقیر ہوں۔ میں بھی تو ان پیسوں سے روٹی ہی کھاتا ہوں " چونی لعل اس کا کیا جواب دیتا۔

سیٹھ سلیمان کنجانی لاکھوں کا بیوپار کرتے تھے جس میں ہزاروں کا نفع ہوتا تھا۔

غزل

جناب نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیز

نہ جان جاتی نہ یوں تڑپتے نہ تم کو ہم سے ملال ہوتا
یہ کاش پہلے ہی ہم سمجھتے یہ کاش پہلے خیال ہوتا

متاع دل کی نہ تھی حقیقت میں ان پر اس کو نثار کرتا
کبھی تو وہ یہ سوال کرتے کبھی تو ایسا سوال ہوتا

نہیں ہے احباب سے شکایت نہیں ہے احباب کا گلا کچھ
عزیز دشمن بھی قدر کرتے جو ہم میں کوئی کمال ہوتا

اخلاق نفسیات کی روشنی میں

جہاں بانو۔ ایم۔ اے

اصل یہ ہے کہ دنیا کی ہر چیز اضافی ہوتی ہے کوئی چیز قطعی طور پر اچھی یا بری نہیں ہو سکتی۔ ہر نیکی میں برائی اور ہر برائی میں نیکی چھپی ہوئی ہے۔ بلکہ بعض فیلسوف کا تو یہ بھی خیال ہے کہ دنیا میں سب سے بڑی نیکی سب سے بڑی خود غرضی ہے۔ مثلاً دو شخص راستہ پر چلے جا رہے ہیں۔ رات اندھیری ہے۔ موسلا دھار بارش ہو رہی ہے۔ بجلی کی چمک اور بادل کی گرج سے ہول ہول سی ہے جنگل سنسان ہے۔ سڑک کے کنارے ایک شخص نہایت بیکسی و کسمپرسی کے عالم میں کھڑا نظر آتا ہے۔ ہوا کے بے پناہ تھپیڑے اس کے بیمار جسم کو ہلا دیتے ہیں۔ بارش کی کثرت نے اس کی جان پر بنا دی ہے۔ کوئی جائے پناہ اس کو نظر نہیں آتی۔ راہرو اس کو دیکھکر ایک لمحہ کے لئے رُک جاتے ہیں۔ کوئی گھور گھور کر دیکھتا ہے کہ واقعی انسان ہے یا کوئی آسیبی ڈھانچہ، جو اس ہنگامہ خیزی میں کھڑا جھوم رہا ہے۔ کوئی اس پر ایک نگاہ غلط انداز ڈالتا ہوا راستہ کترا کے نکل جاتا ہے کہ یہاں اپنی ہی جان خطرہ میں ہے۔ اس کی بات کون پوچھے۔ لیکن اس غور سے دیکھنے والے کے دل میں رحم کا ایک دریا امنڈنے لگتا ہے کہ وہ اس کی سیوا میں لگ جاتا ہے اس کو اپنے گھر لیجا کر اس کی ان تھک طریقہ سے تیمارداری کرتا ہے۔ اس کو تندرست کرنے کی ہر ممکنہ کوشش اس پر صرف کر دیتا ہے۔ جب وہ بالکل اچھا ہو جاتا ہے تو اس کے قلب کو وہ سکون ملتا ہے جو کسی حریص کو ہفت اقلیم کی دولت حاصل کرنے کے بعد بھی نہ ملے۔

اب یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ تیمارداری اور ہمدردی کرنے والا راہرو خود غرض تھا یا نہیں؟ علمائے نفسیات کا تو یہ فیصلہ ہے کہ جس نے اپنا راستہ لیا وہ کم خود غرض تھا بہ نسبت اس کے جس نے اس کے دکھ درد کو کم کرنے کی کوشش میں اپنا سکھ چین سب کچھ کھو دیا۔ کیونکہ اس نے فطرتاً ایسا دل و دماغ پایا تھا کہ اگر وہ اس فقیر کی سیوا نہ کرتا اور اس کی تیمارداری میں اپنی نیند حرام نہ کر لیتا۔ ایک شان بے نیازی سے اس کو دیکھتے ہوئے یونہیں گذر جاتا تو کئی دنوں، ہفتوں، بلکہ مہینوں اور برسوں تک اس کی مسرتیں اس سے چھن جاتیں۔ اس کا ضمیر برابر

اس کے جیون سکھ میں رخنہ اندازیاں کرتا۔ وہ اطمینان قلب سے محروم ہو جاتا۔ فقیر کی تباہ حالی اور اپنی مدد نہ کرنے کا احساس، اس کو زندگی کی ہر خوشی سے بیگانہ رکھتے ——— تو، اب ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ اس نے اپنے قلب کے سکون کو ترجیح دی۔ اپنی تسکین خاطر کے لئے یہ رویہ اختیار کیا۔ ورنہ مدت العمر اس کے سینہ میں ایک ایسی کھٹک باقی رہ جاتی جو اس کی نیند حرام کر دیتی۔ اس کے چین و سکون کی دنیا غارت ہو جاتی۔

——— اسی طرح اس قسم کی سادہ پرکار نیکیوں کا ایک سلسلہ ہے۔ بعض دوستی بھی اسی قسم کی ہوتی ہے۔ انسان کو جب کوئی یکسوئی نہیں ہوتی تو وہ دوست بنانے کی فکر میں سرگرداں رہتا ہے کسی ایک بیوقوف کو دوست بنا کر اپنی جھوٹی اور بناوٹی باتوں سے اس کا من موہ لیتا ہے پھر جب اس کو کوئی من کی معراج ملجاتی ہے اس کی زندگی کا خاطر خواہ ٹھکانہ ہو جاتا ہے اپنے اُس دوست کو بھول جاتا ہے جس کی زندگی اس کی وجہ سے بیکار ہو گئی ہے۔ ایسی دوستی دوستی نہیں خود غرضی ہے۔ اسی لئے غالب کہتا ہے

آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

یعنی یہ چلتی پھرتی مخلوق انسان نہیں ہے۔ ہر آدمی انسان ہو جائے تو پھر انسانیت کی قیمت ہی گر جائے۔ انسان تو مونس و ہمدرد ہوتا ہے آدمی تو وہ سب ہیں جو آدم کی اولاد سے ہیں۔ درد دل کیلئے انسان بنایا گیا جس کے قلب میں درد دل کا پاس نہیں وہ نرا آدمی ہے۔ انسان نہیں منطقی استدلال سے نرا حیوان!

انسان وجدانیات کو چھوڑ کر عقلیت سے کام لے تو اس کی زندگی صحیح معنوں میں زندگی ہو جائے۔ ہماری زندگی وجدانی زندگی ہے۔ جب تک عقل و ہوش سے ہم کام نہ لیں گے ہم جی نہیں سکتے۔ اوپر کی دونوں مثالوں میں پہلی مثال کا وجدان پھر بھی کام کی چیز ہے کیونکہ ایک انسان کی جان بچ جاتی ہے۔ دوسری مثال ایک ٹھوکر ہے جو وجدان نے لگائی ہے دوستی میں جلد بازی کا ایک تلخ تجربہ۔ شعور کی بے شعوری۔ اب اس عقل کی معذوری کا علاج ہی کیا ——— !

ایک تیسری مثال خیرات ہی کو لیجئے۔ اگر انسان خیرات بھی آنکھیں بند کر کے دے۔ اچھے خاصے مسٹنڈے، تندرست حاجتمند بن جائیں۔ اور ہم یہ دیکھکر کہ ہم تو راہ خدا میں دے رہے ہیں اپنا روپیہ لٹاتے رہیں اپنی دانست میں یہ سمجھ کر کہ یہ خیرات ہے تو بہ الفاظ دیگر یہ دولت کا غلط استعمال ہے۔ قوم کے ایک قوی

کارآمد گروہ کو ہم خود اپاہج بنا رہے ہیں یعنی
دولت ذریعہ ہو رہی ہے لوگوں کو بگاڑنے،
ان کو ازکار رفتہ کر دینے کا۔ یوں بھی

کون ہے جو نہیں ہے حاجتمند
کس کی حاجت روا کرے کوئی

لیکن پھر یوں بھی تو ہے۔

بناکر فقیروں کا ہم بھیس غالب
تماشائے اہل کرم دیکھتے ہیں!

گویا جود و کرم ایک تماشہ ہے اور اہل سخا
اس تماشہ کے کھیلنے والے۔ اور یہ ہٹے کٹے
مسٹنڈے تماشہ بین!!

کبھی کسی دکان پر کچھ خریدنے نکل جائیے۔
آپ کی سواری دیکھکر بیسیوں انواع و اقسام کے
فقیر آپ کا دیکھتے دیکھتے محاصرہ کر لیتے ہیں جیسے
مٹھاس پر مکھیاں۔ ان میں تندرست اور بیمار
سب ہی ہوتے ہیں۔ متعدی امراض کے شکار
بھی۔ قسم قسم کی بولیاں۔ طرح طرح کی آوازیں۔
دعائیں۔ دہائیاں، اور پھر اگر اتفاق سے آپ
بغیر کچھ دئے نکل جائیے تو گالیاں، بد دعائیں۔
ایسی ایسی کہ منتوں اور مرادوں سے پلنے والے
سُن کر رو دیں ــــ ان کا کلیجہ پھٹ جائے۔

ان بیماروں اور معذوروں کے لئے ایسا
انتظام نہیں کہ انھیں گھر بیٹھے کچھ ملجائے جس سے
ان کے دوزخ کی آگ بجھ سکے۔ امیر کو ہی بھوک
لگ سکتی ہے۔ وقت پر ــــ بھوک نہ بھی لگے
تو اس کے پیٹ کا ایندھن سلگ جائے اور
غریب ــــ خصوصاً جو اپاہج و بیمار ہو، اس کا
کوئی ٹھکانا نہیں۔ ہمارے چار پیسے دینے سے
اس کا کیا ہوتا ہے۔ جب کہ ایک کی بھیک پر
متعدد پلتے ہیں۔ اب رہے تندرست قسم کے
فقیر ــــ ان کو خیرات دینے سے کہیں بہتر ہے
کہ ہم ان نوٹوں کے کٹوں کو دیا سلائی کھینچ کر
لگا دیں۔ جو کماکر خود کھا سکتے ہیں۔ اپنے معذور
ضعیف رشتہ داروں کی سیوا کر سکتے ہیں۔ ان
کو خیرات دینی حماقت ہے۔ جنگ ایک طرح سے
بڑی مفید پہل ہے۔ سوئی ہوئی قومیں
بیدار ہو جاتی ہیں۔ انسان کی تخلیقی صلاحیتیں
اجاگر ہونے لگتی ہیں۔ مزاجوں میں ایچ سا
پیدا ہونے لگتا ہے۔ سوچ بچار کی قوت بڑھ
جاتی ہے۔ قوت ارادی کا مادہ پھوٹ پھوٹ کر
ان سدّ راہ بنی ہوئی چیزوں کو روند ڈالتا ہے،
جو ابتک اس کی راہ میں حایل تھیں۔ غرض مطلب
یہ کہ انسان پر بڑی بڑی ذمہ داریاں عائد ہیں۔
اس کا نیک ہونا ضروری ہے۔ لیکن نیکی جیسا
معصوم اقدام بھی سوچ سمجھ کر ــــ یوں تو
انسان وہ ہے جو بُرے کو بھی اچھا سمجھے۔ اور

خود ہی کو سب سے زیادہ برا تصور کرے۔ کیونکہ اپنی برائیوں کا تجزیہ کرنے کے بعد دوسرے کی برائی کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔

اگر ہم چور ہیں۔ ڈاکو ہیں۔ تو خود ہماری "ضرورت" ہماری چوری جیسے برے اور مذموم فعل کی رہنمائی کرتی ہے۔ لوگوں کے چرچوں کے خوف سے تو ہم اپنی زندگی کا دستور العمل بنا نہیں سکتے۔ نہ صرف محبت بلکہ ضرورت بھی انسان کو اندھا بنا دیتی ہے۔ ضرورت آن بان اور خود داریوں کو بھی ٹھکرا دیتی ہے۔ لیکن انسان وہ ہے جو اپنی بڑی سی بڑی ضرورت پر بھی اپنی خودداریوں کی قربانی نہ کرے۔

مجھے میر تقی میرؔ کی اس صفت نے ان کا گرویدہ بنا دیا ہے۔ ان کی ایک نمایاں خصوصیت ان کی غیرت و خودداری ہے۔ حد ہوگئی جب وہ یہ کہتے ہیں ؎

الٰہی کیسے ہوتے ہیں جنھیں ہے بندگی خواہش
ہمیں تو شرم دامنگیر ہوتی ہے خدا ہوتے

شاعر اپنے وجدان کی مجذوبی میں یہ بھی بھول جاتا ہے کہ اس کے مخاطب کا کیا درجہ ہے۔ کبھی وہ یوں گریزاں ہیں۔ ؎

جائے ہے جی نجات کے غم میں
ایسی جنت گئی جہنم میں!

یہ خودداری کیسی ہے۔

جاتا ہے یار تیغ بکف غیر کی طرف
اے کشتۂ ستم تری غیرت کو کیا ہوا

یہ بہکی بہکی باتیں ہیں ان کے سمجھنے کی کوشش نہ کیجئے۔

غزل

جناب مسلمؔ

اے جانِ خلق رونقِ بازار کیستی
دلدار کیستی و دل آزارِ کیستی

از پیروان دیر و کلیسا و از حرم
ظاہر نمی شود کہ طلبگار کیستی

ہر کس بوہم ایں کہ توئی ملتفت باو
آخر بما مگو کہ تو خود یار کیستی

ایں باغ دہر نیست مقام نگار تو
اے دل تو زیر سایۂ دیوار کیستی

خلق از تو بدگمان و خدا از تو بے نیاز
زاہد بزہد خود تو پئے کار کیستی

ہستی اگر تو عکسِ نگارندۂ صور
مسلمؔ بوہم وعدۂ دیدار کیستی

"ایام جاہلیت"

مورخین نے ان ارتقائی مرحلوں کو جن سے عالم انسانی از آدم تا ایں دم گزرا، تین حصوں میں تقسیم کیا ہے "قرون اولیٰ"۔ "وسطیٰ" اور "حاضرہ"۔ قرون اولیٰ کے حالات کا علم زیادہ تر آثار قدیمہ سے ہوا ہے، انسان طبقہ حیوانات میں ممتاز درجہ محض علم و شعور کی وجہ سے رکھتا ہے اور اس میں بے انتہا ترقی کی صلاحیت ہے، ورنہ اس میں تمام خصوصیات حیوانی پائی جاتی ہیں جنھیں تہذیب کا ملمع چھپا نہیں سکتا، وہ عام حیوانوں کی طرح پیدا ہوتا، کھاتا پیتا، چلتا پھرتا، سوتا جاگتا، لڑتا مرتا ہے اور آخر خاک میں ملجاتا ہے۔ قرون اولیٰ میں جب کہ تہذیب و تمدن سے ناآشنا تھا وہ جنگلوں اور پہاڑوں کی غاروں، دریاؤں کے کناروں پر رہتا اور اس کی ادنیٰ حیوانی زندگی گاؤ خر کی طرح تلاش رزق میں ختم ہو جاتی۔ اس کا ذہنی ارتقاء ازمنہ حجریہ سے شروع ہوتا ہے جب کہ وہ پتھروں سے وہ کام لیتا جو بعد میں لوہے وغیرہ دھاتوں سے لینے لگا۔

کہتے ہیں کہ "ضرورت ایجاد کی ماں ہے"۔ ضرورت کا احساس بھی درجہ بدرجہ ہر ایک زمانہ کے فہم کے ساتھ مناسب ہی ہوتا ہے۔ حکماء یونان کہتے ہیں کہ علم کا اصلی مقام "معدہ" ہے، یعنی بھوک پیاس کا احساس معدہ سے تعلق رکھتا ہے جس کی تسکین کے لئے انسان رزق کی تلاش میں مارا مارا پھرتا ہے، یہی وہ احساس ہے جو دل و دماغ اور دیگر اعضاء کو اپنی فطری قابلیت کے اظہار کے لئے آمادہ کرتا ہے، یونانی "مائی تھولوجی" ہمارے ہندی "علم الاصنام" سے بہت ملتی جلتی ہے، چنانچہ ہمارے شاستروں میں بھی معدہ کو علم کا مقام قرار دیا گیا ہے۔ لکھا ہے کہ ایک روز پاربتی جی" کو جو جگت ماتا" ہے نہانے کی خواہش ہوئی اپنے جسم کو میل کچیل سے خوب صاف کیا اور اس میلے مادہ سے ایک بت بنایا۔ اور اس میں "جنو آتما" پھونک دی۔ وہ زندہ ہو گیا اسے ارشاد فرمایا کہ "بیٹا میں نہانے لگی ہوں، تم دروازہ پر بیٹھو کسی کو اندر نہ آنے دو"۔ اتفاق سے مہا دیو جی کہیں باہر گئے ہوئے تھے جب گھر کو لوٹے تو دروازہ پر اجنبی شخص کو دیکھا، اندر داخل ہونا چاہتے تھے کہ اس نے روکا،

جناب خواجہ محمد عباد اللہ صاحب اختر
بی۔ اے (امرت سری)

مہادیوجی نے کرودہ میں اس کا سر قلم کردیا۔ پارتی جی بھی نہا دہو کر فارغ ہو چکی تھیں۔ مہادیوجی نے پوچھا کہ دروازہ پر یہ کون گستاخ تھا۔ پھر تمام ماجرا کہہ سنایا۔ پارتی جی نے کہا "مہاراج آپ نے کیا کام کیا وہ تو آپ کا ہی بیٹا تھا۔ پھر اس کی پیدائش کا حال بیان کیا۔ مہادیوجی نے کہا کہ" اچھا میں اسے ابھی زندہ کئے دیتا ہوں" باہر آئے تو اتفاق سے ایک ہاتھی ادہر سے گزر رہا تھا مہاراج نے اس کا سر کاٹ کر اس کے دھڑ پر چسپان کردیا۔ یہ گنیش جی مہاراج ہیں جن کا دھڑ تو پیٹ ہی پیٹ ہے اور سر ہاتھی کا ایک ہاتھ میں قلم اور دوسرے میں کاغذ۔ یعنی علم کے دیوتا ہیں۔ پارتی جی نے جب گنیش جی کو اس ہیئت کذائی میں دیکھا تو کہا" واہ مہاراج' یہ تو پہلے ہی میل کچیل کا مجسمہ تھا۔ اب ہاتھی کے سر سے اسے اور بہدا بنا دیا۔ مہادیوجی نے فرمایا کہ تمام دیوتاؤں میں پہلے اسی کی پوجا ہوا کرے گی" گنیش جی دراصل معدہ کی مورتی ہیں جو تمام جہان کی میل کچیل کو لئے ہوئے ہے۔ لیکن جس طرح آب وگل کی آمیزش سے ہر ایک رزق پیدا ہوتا ہے، اور پھول اور بیل بوٹے بہار دکھاتے ہیں اسی طرح "علم" کا ظہور معدہ سے ہوتا ہے۔ "پیٹ پوجا" پہلے ہوتی ہے اور تمام دیگر اعضا اس دیوتا کو "بھوگ" لگانے کی فکر میں لگے ہوئے ہیں، یونانی روایات سے پایا

جاتا ہے کہ ایک دفعہ تمام اعضاء نے معدہ کے خلاف سازش کی، ہاتھوں نے کہا کہ ہم محنت مشقت کا ہر ایک کام کرتے ہیں۔ پاؤں نے کہا کہ ہم تمام دن رزق کی تلاش میں مارے مارے پھرتے ہیں، دل اور جگر اور دماغ نے بھی اپنی کاوش اور تکلیف کا رونا رویا۔ سب نے کہا کہ ہم کام کاج کرتے ہوئے تھک کر چور ہو جاتے ہیں اور یہ سب کچھ نکمے معدہ کے لئے کرتے ہیں، تمام جہان کی نعمتیں اس کے لئے مہیا کرتے ہیں اس کا کام صرف کہانا اور پچانا ہے۔ یہ ہنڈیا ہر وقت چولہے پر چڑھی رہتی ہے اور یہ پیٹ بھرنے میں نہیں آتا۔ مناسب ہے کہ ہم سب مل کر کام کاج کرنا چھوڑ دیں، پھر دیکھیں کہ بھوک پیاس سے اس کا کیسا برا حال ہوتا ہے" چنانچہ سب نے ہڑتال کردی لیکن ایک ہی دن فاقہ کا یہ نتیجہ ہوا کہ سب کے حواس بجا نہ رہے معدہ نے کہا کہ تم سمجھتے ہو کہ میں بالکل نکما ہوں اور تمہاری کمائی پر پڑا ہوا ہوں، بات یہ ہے کہ میں ہی تم سب کی خدمت میں لگا ہوا ہوں، کچھ شک نہیں کہ تم اپنی اپنی بساط کے مطابق کچھ نہ کچھ کام کرتے ہو، اور سب مل کر کام کرتے ہو، رزق لاکر میرے حوالے کرتے ہو، میں رزق کو پاک صاف کرکے پھر تمہیں دیتا ہوں، جو بچ رہتا ہے وہ میل کچیل ہے جو میرے پاس رہتا ہے۔ میں تو ایک ہنڈیا ہوں، کھانا پکا

اور تم چت کر گئے۔" تمام اعضاء نے سر تسلیم جھکا دیا اور گنیش جی کو نمسکار کرتے ہوئے پھر اپنے کام میں لگ گئے۔

تمام علوم وفنون اور تہذیب وتمدن کے کرشمے سب حضرت معدہ نے وضع و واضح فرمائے ہیں۔ خدا جانے ہمارے پیٹیوں کو کیا سوجھی کہ یونانی روایات کا اتباع کرتے ہوئے، بیچارہ پیٹ کے خلاف اعلان جنگ کر رکھا ہے، نتیجہ وہی ہوا جو اعضاء کی سازش کے بعد ہوا تھا، یعنی تہذیب وتمدن کے بلند ترین زینہ سے گر کر فرش خاک پر آرہے اور ان کے سر پر قرون اولیٰ کی وحشت سوار ہو گئی، ہمارے تپسوی اور مسیحی رہبان اور عربی کاہن اور کاہنہ عورتیں سب ایک ہی تھیلی کے بٹے ہیں۔ یہ دشمنان تہذیب وتمدن کہتے ہیں کہ آرام وآسائش اسی میں ہے کہ "ضروریات زندگی" کم کرتے جاؤ، اور لطف یہ ہے کہ یہ "بن باسی" متمدن آبادیوں کے معاملات میں دخل درمعقولات بھی دیتے رہتے ہیں اور عقل کے اندھے اور گانٹھ کے پورے ان کے پاس جاتے اور ان کے مشوروں پر عمل بھی کرتے ہیں، اور یقین کرتے ہیں کہ یہ غیب کی خبریں دیتے ہیں۔ لوگوں کی جہالت پر تعجب ہوتا ہے کہ ان کے کچھ ایسے گرویدہ تھے کہ ان کے لئے بڑے بڑے مندر اور مناستر اور ٹمپل اور کیا کچھ تعمیر نہ کرتے

سردست ایام جاہلیت کی اس خصوصیت کا تذکرہ ہمیں منظور نہیں، ہم دیگر خصوصیات بیان کریں گے جس کا ہمارے تاریخی قصہ سے تعلق ہے۔

رفع مسیح کو تینتیس یا چالیس سال کا عرصہ گزرا ہوگا کہ "حیرہ" میں جو دار السلطنت اس عربی حکومت کا تھا، جس کے حدود عراق میں ایک طرف شام اور دوسری طرف شط فرات سے ملحق تھے۔ درحقیقت عراق میں طوائف الملوکی تھی اور چھوٹی چھوٹی ریاستیں قایم تھیں ہمارے تاریخی قصہ کا تعلق ان میں سے دو ریاستوں سے ہے جو کم و بیش شاہان فارس ساسانیوں کے زیر اثر یا زیر سایہ عاطفت تھیں جو برائے نام ہی تھی۔ مالک بن فہم قضاعی حیرہ میں حکمران تھا، اس کے بعد اس کا بھائی عمرو بن فہم اور اس کے بعد تیسرا بھائی جزیمہ الابرش حکمران ہوا، یہ ایک الوالعزم اور صائب الرائے مستقل مزاج حکمران تھا۔ مکر و فریب سے سخت نفرت تھی، جو سیاسیات میں پسندیدہ امر ہے۔ اس سے پیشتر کسی امیر کے ہاں منظم فوج نہ تھی اس نے ایک لشکر مرتب کیا اور تھوڑے عرصہ میں ہمسایہ ملوک کو نیچا دکھایا اس کے ہمسایہ میں "عمرو بن ظرب" شط فرات کے مشرقی کنارہ پر حکومت کرتا تھا۔ دونوں میں اکثر حربی چھیڑ ہوتیں، یہ ہی ایام جاہلیت کا خاصہ تھا کہ امن

بیٹھنا کسی شخص کو نصیب نہ تھا۔ لوٹ گھسوٹ کا بازار ہر طرف گرم تھا، لیکن جب کبھی جنگ و جدل و حرب ضرب سے فرصت ملتی تو داد عیش بھی دل کھول کر دیتے۔

ایک روز جزیمہ اپنے ندیموں میں بیٹھا ہوا تھا۔ دور شراب چل رہا تھا۔ ان ایام میں شراب نوشی اور قمار بازی دو ایسے شغل تھے جن پر لوگ فخر کرتے، وہ یہ سمجھتے کہ شراب بخل کو دور کرتی ہے اور فیاضی کی محرک ہے، ہر ایک شخص کی عزت بقدر فیاضی ہوتی، چونکہ فیاضی ان کا اعلیٰ وصف تھا، اس لئے اس کا محرک شراب نوشی بھی پسندیدہ تھا، چنانچہ ایک شاعر "عمرو بن کلثوم" اپنے معلقہ میں کہتا ہے۔

"تری اللحز الشحیح اذا علیه لماله فیها مھینا"

تو انتہائی بخیل کو بھی شراب کے دور میں مال بیدریغ اڑاتے دیکھے گا۔

رہا جوئے کا معاملہ وہ اس لئے پسندیدہ تر تھا کہ وہ جو کچھ جوئے سے کماتے بیدریغ محتاجوں کو دیدیتے۔ اگرچہ شراب نوشی اور قمار بازی کا مفہوم بالکل بدل چکا ہے لیکن آج بھی مہذب اور متمدن اقوام میں اس کا رواج کثرت سے ہے۔ پانچو پانڈوں میں سے سب سے بڑا "یدہشٹر" جو "دہرم راج" کہلاتا ہے، جس نے کبھی ہنسی ٹھٹول میں بھی جھوٹ نہ بولا، اگر بھیم جسمانی طاقت کا اور ارجن عقل کا دہنی تھا تو یدہشٹر "دہرم" کا۔ لیکن جوئے کی لت ایسی لگی تھی کہ "حسن مشترک" دروپدی بھی ہار بیٹھا، بات یہ ہے کہ ایام جاہلیت میں لوگ جوا کچھ ذاتی فائدہ کے لئے نہ کھیلتے تھے جو کچھ کماتے محتاجوں کو دیدیتے "لبید بن ربیعہ" معلقہ میں کہتا ہے:۔

"وجزور ایسار دعوت لحتفها
بمغالق متشابه اجسامها
ادعو بهن لعاقر او مطفل
بذلت لجیران الجمیع لحامها
فالضیف والجار الجنیب کانما
هبطا تبالة مخصبا اهضامها"

میں نے بار بار ایسا کیا کہ ان اونٹوں کو جو جوئے کے لائق تھے ذبح کرنے کے لئے اپنے ندیموں کو دعوت جوئے کے پانسوں کے ساتھ دی، جو طول و عرض میں برابر تھے، دعوت ان پانسوں کے ساتھ بانجھ اور بچہ والی اونٹنیوں کے ذبح کرنے کے لئے دی گئی اور میرے مہمان اور دور کے پڑوسی میری فیاضی سے ایسے خوشحال ہوگئے گویا وہ تبالہ (واقعہ وادی یمن) میں مقیم ہیں جس کی چوٹیاں نہایت سرسبز ہیں۔

لبید کا مطلب یہ ہے کہ قحط کے دنوں میں لوگوں کو خواہ وہ میرے جان پہچان تھے یا اجنبی میں نے جو کچھ کھلایا وہ میرا ذاتی مال تھا کچھ جوئے کی کمائی نہ تھی۔ البتہ وہ اونٹ اور اونٹنیاں ایسی قدر و قیمت کی تھیں۔ جو جوئے پر لگانے کے لائق تھیں۔ عرب جو قیمتی

اونٹوں سے کھیلتے تھے۔ ان مجالس کا نقشہ کھینچنے کے لئے جس میں یہ لوگ داد عیش کے ساتھ اپنی فطری فیاضی کے جوہر دکھاتے، ایک دفتر چاہیئے، ہمارے تاریخی قصہ کا تعلق اس سے نہیں ہے، جذیمہ کی مجلس میں دور شراب چل رہا تھا۔ خود جذیمہ نے اپنے ندیموں سے پوچھا کہ یارو بتاؤ ہماری محفل نشاط کی تکمیل کن باتوں سے ہوسکتی ہے کیونکہ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ محض شراب سے کام نہیں چلتا۔ ایک ندیم نے کہا کہ "شراب و شاہد و ساقی جس محفل میں ہوں، اس کے کیا کہنے"۔ جذیمہ نے کہا کہ شراب تو موجود ہے اور اس کا دور چل رہا ہے۔ لیکن شاہد و ساقی کیسے ہوں اور کہاں سے دستیاب ہوں؟ اس پر ندیموں میں بحث شروع ہوگئی۔ آخر سب کا اتفاق اس امر پر ہوا کہ شاہد "نائلہ" دختر عمرو بن ضرب ہو جس کا جواب حسن میں عراق بھر میں نہیں، اور ساقی "عدی بن نصر" نہایت خوبرو نوجوان ہے دونوں شاہی خاندانوں سے ہیں، جذیمہ نے نائلہ کے حسن کا شہرہ سنا ہوا تھا جس کے خواستگار عراق میں بیشمار تھے لیکن وہ کسی کو خیال میں نہیں لاتی تھی اور اس کا باپ کسی کو اپنا ہم پلہ نہیں سمجھتا تھا نائلہ کی حسن کی تعریف کرتے ہوئے ایک شاعر نے یہاں تک کہہ دیا کہ "اس کے پہلو میں نسوانی دل نہیں ہے وہ ایک بہادر دوشیزہ ہے اگر کسی کا حوصلہ ہو تو میدان جنگ میں اپنی قسمت آزمائی کرسکتا ہے، کیوں نہ ہو آخر وہ عمرو بن ضرب کی بیٹی ہے، بہادر باپ کی بیٹی ایسی ہی ہونی چاہیئے"۔ ہم نے عربی اشعار کا ترجمہ تو کردیا ہے لیکن لفظی خوبی اور فصاحت کا ترجمہ ناممکن ہے۔ ان اشعار کا اثر نائلہ کے دل و دماغ پر ایسا ہوا کہ اس نے عہد کرلیا کہ شوہر وہی ہوگا جس کا مثل بہادری میں تمام عراق میں نہ ہو۔

"عدی بن نصر" آل نصر سے تھا اس کا دادا "ربیعہ" یمن میں حاکم تھا۔ ان دونوں میں "شق" اور "سطیح" دو مشہور کاہن تھے، جس طرح ہمارے ہندوستان میں "پراچین" کی یادگار جوتشی اور پنڈت ہیں جن سے لوگ ہر ایک اہم کام کے لئے مشورہ کرتے ہیں اور وہ شبھ گھڑی، شبھ لگن، شبھ مہورت بتا دیتے ہیں یا کسی کام سے منع کردیتے ہیں یہی حیثیت کاہن کی تھی، ان دونوں نے "ربیعہ" کے ایک خواب کی تعبیر یہ بتائی کہ "حبشہ" کا بادشاہ تم سے حکومت چھین لیگا۔ چنانچہ ان عرب کے جوتشیوں نے یہ "اپاؤ" بتایا کہ اپنے اہل بیت کو عراق کی طرف روانہ کردو۔ چنانچہ اس نے ایسا ہی کیا اور اپنے ایلچی کے ذریعہ ایک خط "شاہ پور" شاہ فارس کو لکھا کہ حضور کے زیر سایہ میرے گھر والے رہنا چاہتے ہیں۔ شاہ پور نے ان کو اس مقام پر بسایا جسے بعد میں "حیرہ" کہتے ہیں۔ "حیرہ" کی وجہ تسمیہ مورخین نے یہ لکھی ہے کہ

جب یہ قافلہ فرات کے کنارے کنارے جا رہا تھا، ایک رات راستہ بھول کر اس مقام پر آ گیا اب "حیران" تھے کہ کہاں جائیں اس لئے اس جگہ قیام کیا اور اس کا نام "حیرہ" رکھ دیا، جو بعد میں ان کی سلطنت کا دار الحکومت بن گیا، اور ایرانی اور رومی لڑائیوں میں اس نے نمایاں حصہ لیا۔

"عدی" نہایت خوبصورت نوجوان تھا۔ بنو اباد کے قبیلے کے لوگ ایک کاہن کے کہنے پر اس کی حفاظت خاطر خواہ کرتے رہے۔ یہاں تک کہ جذیمہ کا ایلچی ان کے پاس آیا اور "عدی" کا مطالبہ کیا، "بنو اباد" نے صاف انکار کر دیا، جذیمہ نے دھمکی دی کہ اگر "عدی" کو بلا عذر و حیلہ حوالہ نہ کیا تو میرا لشکر تمہاری اینٹ سے اینٹ بجا دیگا۔ بنو اباد پھر کاہنہ کے پاس گئے اور مشورہ طلب کیا، اس نے کہا کہ سردست جذیمہ کو باتوں میں ٹالتے رہو اور اس کے پاس "دو بت" ہیں جب تک اس کے پاس ہیں جذیمہ فتحمند رہے گا، اگر کسی طرح اڑا لاؤ تو پھر کچھ ڈر نہیں "بنو اباد" نے ایسا ہی کیا، جب جذیمہ کو اپنے ٹھاکروں کے گم ہونے کا علم ہوا تو ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔

ایام جاہلیت یا "ازمنۂ تاریک" میں بت پرستی عام تھی اور ان کے مندروں کی تعمیر پر لوگ روپیہ بیدریغ خرچ کرتے، چڑھاوے چڑھاتے بلکہ ضعیف الاعتقادی کی یہ کیفیت تھی کہ راجے مہاراجے اپنی لڑکیاں چڑھا دیتے راجوں کے خزانوں میں اتنا روپیہ نہ تھا جتنا زر و مال بت خانوں میں تھا۔ مصری، یونانی، رومی، ایرانی۔ ہندوستانی "علم الاصنام" کے مطالعہ سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ جذبہ عبودیت جو فطری امر ہے۔ ہر ایک قوم کے دل میں یکساں کارفرما تھا۔ چونکہ فہم انسانی مانع نہ تھا اس لئے مظاہر قدرت کی حقیقت نہ پا سکے اور "چوں ندید ند حقیقت رہ افسانہ زدند" آج حضرت انسان ان اشیاء پر حکومت کرتا ہے جس کو ان ایام میں پوجتا تھا۔

حضرت یعقوبؑ نے "لابن" آرامی کی دو لڑکیوں سے شادی کی، جب اپنے خسر کے گھر سے روانہ ہوئے تو ازواج نے اپنے باپ کے گھر سے بت چرا لئے، جب لابن کو علم ہوا تو اس قافلہ کا تعاقب کیا اور "جلعاد" پہاڑ پر جا لیا۔ اور داماد کو سخت ملامت کی کہ میں نے کتنا بڑا احسان تم پر کیا۔ اب تم میرے ٹھاکر چرا لائے اور تمام گھر کی خیر و برکت لئے جاتے ہو۔ حضرت یعقوبؑ نے قسمیں کھا کر یقین دلایا کہ یہ کام میں نے نہیں کیا۔ اسے اپنی بیٹیوں پر شبہ ہوا، ان کی تلاشی لی۔ لیکن انھوں نے اس کا انتظام پہلے ہی کر رکھا تھا اس لئے کچھ ہاتھ نہ آیا اور ہاتھ ملتا ہوا لوٹ آیا۔

فرعون کے دربار میں جب حضرت موسیٰ نے

توحید کا اعلان کیا تو اس کے ذہن میں یہ بات نہ
آئی حیران ہوکر پوچھا کہ اللہ تعالیٰ رب العالمین کہاں ہے
کہاں ہے۔ منہ دہو رکھو، مصر کے ٹھاکروں کے
مقابلہ میں بھلا تمہارا اکیلا خدا کیسے غالب آسکتا ہے
مصر کے جادوگروں یعنی پنڈتوں نے بھی ظنی دلائل
پیش کرتے ہوئے اپنے ٹھاکروں کی بڑائی بیان کی
لیکن حضرت موسیٰ کے عقل برہان کے سامنے خاموش
ہو گئے، جب فرعون "یم" میں غرق ہونے لگا،
تو سمجھ گیا کہ موسیٰ اور ہارون اور بنی اسرائیل کا خدا
بہت زبردست ہے اس لئے ایمان لایا۔

ان ایام میں قومی بتوں کے علاوہ قبائلی بت
اور خاندانی ٹھاکر علیحدہ علیحدہ ہوتے، اور اگر کسی
خاندان کو اقتدار حاصل ہوتا تو لوگ یقین کرتے کہ
ان کا ٹھاکر سب پر غالب ہے اس لئے اسے پوجنے
لگے اور رفتہ رفتہ ایسے بت قومی معبود ہو جاتے
ایک دفعہ اسرائیلیوں کا مقابلہ ایک قوم سے میدان
میں ہوا، جس نے شکست کھائی، خیال کیا کہ اسرائیلیوں
کا خدا میدان میں غالب آتا ہے، چلو پہاڑوں
میں ان سے لڑیں، وہاں بھی شکست کھائی، تو
اسرائیلی خدا کے غلبہ کا یقین ہو گیا، خود بنی اسرائیل
اللہ تعالیٰ رب العالمین کو عرصہ تک اپنا قومی خدا
سمجھتے رہے جو ابراہیم و اسمٰعیل و اسحٰق و یعقوب
کا خدا تھا۔ اور بار بار تقاضا حضرت موسیٰ سے
ہوتا کہ" اس کا ایک بت بنا دو کہ ہم پوجیں"۔ یہ
فرمائش آخر سامری نے پوری کر دی۔

جذیمہ نے خیر اسی میں دیکھی کہ جس طرح
ہو اپنے ٹھاکر بنو ایاد سے واپس لوں، بنو ایاد نے
کہا کہ مورتیاں اسی صورت میں میرے پاس بھیج دو
تو کیا قباحت ہے۔ کوئی شخص تمھیں ملامت نہ کریگا۔
بنو ایاد نے بتوں کے ساتھ عدی کو بھی بھیج دیا۔

عدی کو بہت عرصہ جذیمہ کی مصاحبت میں نہ
گزرا تھا کہ اس یوسف ثانی پر جذیمہ کی بہن "اقاش"
عاشق ہو گئی، اور ملاقات کے پیام آنے لگے۔ عدی
آوارہ مزاج آدمی نہ تھا، شاہی خون اس کی رگوں میں
تھا، کہلا بھیجا کہ ہماری ملاقات کی ایک ہی صورت
ہے کہ تم میرے عقد نکاح میں آؤ، اور یہ بات جذیمہ
منظور نہ کریگا اور نہ میں کہنے کی جراءت کرسکتا ہوں
اس لئے ہم دونوں کی خیر اسی میں ہے کہ تم میرا خیال
چھوڑ دو۔ اقاش نے کہا کہ آج عدی کو خوب شراب
پلاؤ اور اس سے یہی درخواست کرو، وہ انکار نہیں
کرے گا۔ چنانچہ عدی نے ایسا ہی کیا اور جذیمہ نے
اسی رات اپنی بہن کا نکاح عدی سے کر دیا۔ اور اقاش
حاملہ ہو گئی۔ دوسرے روز جب خدیمہ کے حواس
خمسہ بجا ہوئے تو اپنے کئے پر بہت پچھتایا اور غیظ و
غضب میں دانت پیسنے لگا۔

(باقی)

بہ سرپرستی
محترمہ بیگم نواب مہدی یار جنگ بہادر
صدر المہام تعلیمات

شہاب

ناہید

ناہید

جلد ۸ آذر ۱۳۵۴ف م اکٹوبر ۱۹۴۴ء نمبر ۱

۱- معاشیات اور ہم- نوشتہ عمدۃ النسا- معاشیات جیسے اہم مضمون کو نہایت پرلطف طریقہ پر بیان کیا گیا ہے کہ درحقیقت ہم اس سے گریز نہیں کرسکتے۔
۲- بی ہمسایہ- نگارندہ سلطانہ عزیز- غالباً آپ کے محلہ میں بھی کوئی نہ کوئی ایسی ہمسایہ ہونگی جن کے قہقہے اور جن کے نالے بیشتر اوقات آپ کی میٹھی نیند حرام کردئے ہوں گے۔ ایسے ہمسایہ کا ہم کو تلخ تجربہ ہے کہ ان کی دشنام طرازیوں میں ہمارے اخلاق کا کیا عالم ہوتا ہے۔ لیکن بات اپنے بس کی نہیں ہوتی اس لئے شربت کے گھونٹ کی طرح پینا پڑتا ہے۔ ۳- غیر مہذب رسمیں- یہی رسمیں جن کی بدولت ہماری معاشی حالت روز بروز پست تر ہوتی جاتی ہے۔ لیکن یہ ہندوستان ہے جہاں گھر پھونک تماشہ دیکھنے میں لطف آتا ہے۔ ثریا پروین کے مضامین سماج کی سدھار کیلئے اچھے ہوتے ہیں۔ ۴- فریب ہستی- ساجدہ کا لکھا ہوا ہے۔ یہ ایسے ہی مضامین لکھنے کی اچھی قدرت رکھتی ہیں۔ زندگی کے نشیب و فراز پر گہری نظر ہے۔ ۵- انتہا- محمودہ رضویہ کا تخیل ہے۔

(ب)

"معاشیات اور ہم"

عمدۃ النساء بیگم (بی - اے)

انسان طبعاً مل جل کر رہنے پر مجبور ہے۔ گویا دنیا ایک بہت بڑی کانگریس ہے جس کے ہم سب اراکین ہیں، یا ایک بہت بڑا آباد محلہ ہے جس میں سارے انسان ایک دوسرے کے پڑوسی ہیں۔ یہاں صنعتی ادارے بھی ہیں۔ تجارتی اتحاد بھی۔ درسگاہیں بھی ہیں اور نمائش گاہیں بھی۔ ایک طرف سائنس کی ایجادات ہیں۔ ہوا پانی کی لڑائیاں ہیں معاشی اور اقتصادی تصادم ہیں تو دوسری طرف فن کاری کے نمونے ہیں، تہذیب جدید کی سحر کاریاں ہیں۔ دماغی کاوشیں ہیں۔ ذہنی افکار ہیں۔ غرض کہاں تک گنایا جائے کہ اسی عجیب و غریب عالمگیر کانگریس میں کیا کیا ہے۔ اور اسی وسیع اور آباد محلہ میں کیا نہیں ہے۔

انسانیت کا یہ ارتقاء ظاہر ہے کہ تدریجی طور پر ہی عمل میں آیا ہوگا۔ اور یقیناً آیا ہے۔ دنیا کی یہ ترقی تدریجی ترقی ہے نہ کہ انقلابی۔ ہزاروں سال بعد آج دنیا یہاں پہنچی ہے۔ اور اس بڑھاپے کے باوجود بھی اپنے اندر عالمگیر جوانی چھپائے بیٹھی ہے۔ خدا جانے کل کیا کرے۔

انسان کا رشتہ دنیا سے بہت قدیم ہے۔ دنیا سے تو خیر ہوگا مگر سماج بھی نیا نہیں۔ یہ بھی انسان کا بہت پرانا اور قریبی رشتہ دار ہے جونہی انسان دنیا میں سانس لینے کے قابل ہوتا ہے ذرا شعور کو پہنچتا ہے تو بس پیٹ کی فکر بے چین کر دیتی ہے۔ آپ کہیں گے پیٹ کی فکر تو پیدا ہوتے ہی شروع ہو جاتی ہے۔ ہوتی ضرور ہے مگر، فکر فکر میں فرق ہے۔ زندگی زندگی میں فرق ہے بچپن میں پیٹ کی فکر آپ کو رونے پر مجبور کر دیتی تھی۔ اب آپ روتے نہیں رلاتے ہیں۔ تب سماج سے آپ کا کوئی رشتہ نہ تھا۔ اب یہی بندھن اسی سے بندھتا ہے۔ غرض یوں زندگی، جتھا بندی میں تبدیل ہو جاتی ہے، جتھا بندی کے بعد نفع پرستی کا آغاز ہوتا ہے۔ اس کے بعد جاگیرداری پھر سرمایہ داری کی ابتداً ہوتی ہے۔ چھوٹے بڑے کا امتیاز نفع پرستی کے سایۂ عاطفت میں پھلتا پھولتا جاتا ہے جس کو پورے طور پر بار آور ہوتا، ہم قرون وسطیٰ میں دیکھتے ہیں۔ جہاں سے پھر انتشار کے آثار نمایاں ہوتے جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ، ہیگل، کارل مارکس اور لینن، اشتراکیت کی تحریک میں سرمایہ داری کی دھجیاں

اُڑاتے نظر آتے ہیں۔ ایک کا پیغام، دوسرے کی تبلیغ
اور تیسرے کے عمل سے روس وہ کچھ بنتا ہے، جو
آج ہم دیکھ رہے ہیں۔

اگر ان سب واقعات کا غور سے مطالعہ کیا
جائے تو پتہ چلتا ہے کہ ان سب کی تہہ میں سماجی
تنظیم کارفرما ہے۔ اب بھی انسانیت مختلف گروہوں
میں تقسیم ہے۔ کئی کئی جماعتوں سے بیک وقت ہمارا
رشتہ ہے۔ اور ان میں سے ہر ایک کا کام کسی خاص
انسانی ضرورت کی تکمیل ہے۔ لہٰذا ہر گروہ، ہر جماعت
اور ہر مجلس کا کوئی نہ کوئی معاشی پہلو ضرور ہوتا
ہے۔ خواہ بجائے خود معاشیات ان کا مقصد ہو یا
نہ ہو۔ مگر اس ذریعہ کے بغیر وہ اپنے کسی مقصد کو
نہیں پا سکتے۔

مثال کے طور پر تین اہم انسانی اداروں کو
لیجئے ان میں پہلی اور سب سے اہم جو اپنی ابتداء
کے لحاظ سے بھی بہت قدیم ہے خاندان ہے، دوسرا
مذہبی ادارہ، تیسرے تفریحی مجالس ہیں ان کی اہمیت
موجودہ دَور میں بہت اہم ہوگئی ہے۔ ہر تہذیب
یافتہ اور متمدن ملک میں کلب، باغ عامہ اور عجائب
گھر وغیرہ کا پایا جانا نہایت ضروری سمجھا جاتا ہے،
معاشیں کے نقطۂ نظر سے خاندان معاشی اتحاد کا
دوسرا نام ہے، صدیوں تک یہی خیال رہا۔ خیر نام سے
بحث نہیں، کام دیکھئے۔ خاندان کو زندگی بسر کرنے
کے لئے بہرحال آمدنی کی ضرورت ہوتی ہے۔ یعنی
احتیاجات کی تکمیل کے لئے پیدائش دولت کی
ضرورت۔ بہ الفاظ دیگر پہلے صَرف اور پھر آمدنی۔
انہی دو چیزوں نے دنیا کو دنیا بنا دیا۔

اب رہے مذہبی ادارے۔ سو مذہب تو
ہمیشہ جسمانی اور مالی قربانیاں ہی مانگتا رہا۔ عہد
قدیم میں جب خداؤں کا سلسلہ لامتناہی ہوتا
تھا تو غریب انسانوں کو اور زیادہ مشکل پیش آتی
تھی۔ ایک کو مناؤ تو دوسرا رُوٹھ جاتا۔ دوسرے
کی آؤ بھگت کرو تو تیسرے کی ناراضی جی بٹھا دیتی۔
یعنی مذہب کے معاملہ میں بھی مال و زر، جان و تن
کا سوال پیش پیش ہی رہا۔ ہمیشہ مندروں، کلیساؤں
اور معبدوں میں خزانہ موجود ہے۔ یعنی زمانۂ
قدیم سے ہی مذہب کی ضرورت انسان کے لئے ایسی
ہی ناگزیر رہی جیسے روح و بدن کا تعلق قایم رکھنا،
اور مذہب کے رشتہ کا اظہار جن ذرائع سے ہوسکتی
ہے ان کا تعلق براہ راست معاشیات سے ہے۔

حالیہ دَور میں تفریح گاہ یا کلب وغیرہ
کا قایم ہونا بغیر روپے کے ممکن نہیں۔ قایم ہو بھی
جائے تو اس کے اخراجات کے لئے کسی نہ کسی مستقل
آمدنی کی ضرورت لاحق ہوتی ہے۔ لہٰذا کئی کئی گھماؤ
پھراؤ کے بعد بات وہیں آکر رک جاتی ہے کہ کائنات
کے سارے کاروبار مالیات سے بہت گہرا تعلق

رکھتے ہیں۔ اور مالیات علم معاشیات کا اہم شعبہ ہے۔

اس سارے بیان کا مقصد یہ ہے کہ معاشیات انسان سے اس قدر وابستہ ہے کہ یہ سمجھنا دشوار ہے کہ انسانی زندگی کا وہ کونسا پہلو ہے جس پر معاشیات بلا واسطہ یا بالواسطہ طور پر اثر انداز نہیں ہوتی۔ شاید یہی وجہ ہے کہ علم معاشیات کی تعریف کرتے وقت خود معاشیئین نے غلطی کی ہے اور ان میں آپس میں اس قدر اختلافات پائے جاتے ہیں کہ مبتدی پریشان ہو جاتا ہے۔ نہ صرف اس علم کے نام ہی میں اختلافات پائے جاتے ہیں بلکہ کام بھی الگ الگ ہیں۔ بعض اس سے مراد دولت یا اصل لیتے ہیں۔ تو بعض کے نزدیک معاشی زندگی اور اجتماعی زندگی کی تربیت اور ان دونوں میں ہم آہنگی پیدا کرنا علم معاشیات کا مقصد ہے اگر ایک طرف ہم کو ان لوگوں سے سابقہ پڑتا ہے جو معاشیات کی طرفداری میں زمین آسمان کے قلابے ملاتے ہیں تو دوسری طرف ان سے واسطہ پڑتا ہے جو اسے دوزخ میں پہنچانے والا علم بتاتے ہیں۔

بعض ناقدین نے تو اپنی جرأت پسندی کا دل کھول کر ثبوت دیا ہے۔ اور علم معاشیات کو بیکار مضحکہ خیز علم بتایا ہے۔ غریب آدم اسمتھ خود ستائی کا ملزم گردانا گیا ہے۔ اور ریکارڈو کو "یہودی دیوالیہ" کہا گیا ہے۔ اور اسی طرح اور بھی معاشیئین کی خوب خوب گت بنائی گئی ہے چند ایسے بھی حضرات ہیں جن کا مسلک صلح کل ہے۔ وہ مانتے تو ہیں کہ علم معاشیات کوئی علم ہے مگر ساتھ ہی کہتے ہیں کہ اس کے اصول فرضی ہیں جن کا تعلق حیات انسانی سے دور کا بھی نہیں۔ غرض جتنے منہ اتنی باتیں۔

لیکن ہمیں ان نکتہ چینیوں کے بیان سے ہمت نہ ہارنی چاہیئے اور نہ محض تعریف سے خوش ہو جانا چاہیئے اور نہ یہی سمجھنا چاہیئے کہ معاشیات کا تعلق کسی فلسفہ سے ہے خواہ وہ فلسفہ حیات ہو خواہ فلسفہ سماج۔ نہ ہی یہ سائنس ہے کیونکہ لفظ سائنس آج کل جن معنوں کو ظاہر کرتا ہے وہ تو مظاہر قدرت کی دریافت ہے اور معاشیات کا کام تو سماجی مسائل کا حل بتانا بھی نہیں۔ سچ پوچھیئے تو یہ علم ہماری زندگی کے چند خاص پہلوؤں پر بحث کرتا ہے۔

زندگی خواہ بین الاقوامی ہو خواہ قومی، خواہ اجتماعی ہو خواہ انفرادی ہے بہرحال زندگی۔ لہذا علم معاشیات جب زندگی کے پہلوؤں سے بحث کرتا ہے تو اس میں انفرادیت بھی آجاتی ہے اور اجتماعیت بھی۔ قومیت بھی شامل ہو جاتی ہے اور بین الاقوامیت بھی۔ غرض ان معنوں میں

ایک عالمگیر علم ہے۔ ذرہ کی طرح سمٹ جانیوالا اور صحرا کی طرح پھیل جانیوالا علم۔

یہ تو رہی خود علم کی تعریف۔ اب قوانین کو لیجئے۔ قوانین معاشیات کی نسبت کہا جاتا ہے کہ یہ قوانین زندگی ہیں اور جو تعریف معاشیات کی اوپر کیگئی ہے اس کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ غلط بھی نہیں اور یہ قوانین یا تو استخراجی ہیں یا پھر استقرائی۔ جیساکہ ہم جانتے ہیں علم تحقیق کے بالعموم دو طریقہ ہیں۔ ایک تو یہ کہ نتیجہ پر غور کرکے تفصیلات کا پتہ چلانا۔ اسی کا نام استخراجی طریق کار ہے۔ دوسرے تفصیلات معلوم کرکے نتیجہ تک پہنچنا یہ استقرائی طریق کار ہے معاشیات کی تحقیقات میں یہ دونوں طریقہ مربوط نظر آتے ہیں۔ دراصل علم معاشیات کو جس قدر بھی ترقی ہوئی ہے اور جب سے اس علم کو علم کی حیثیت سے جانا گیا ہے وہ آدم اسمتھ ہی کی بدولت ممکن ہوا۔ آدم اسمتھ کو بقول ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب معاشیات کا "باوا آدم" کہنا بیجا نہ ہوگا۔ اسی زمانہ میں ڈسکارٹ استخراجی طریق کار کی بنیاد ڈالتا ہے فرانسس بیکن اور نیوٹن سائنس کی تحقیق میں استقرائی طریق کار سے کام لیتے ہیں اور معاشیات پر ان دونوں طریق ہائے کار کا اثر پڑتا ہے انقلاب فرانس ۱۷۸۹ء کے بعد سے تو معاشیات نے حیرت انگیز طور پر ترقی کی۔ کچھ عرصہ بعد یعنی انیسویں صدی کے اوائل میں انگلستان میں جب نفع پرستی کا بول بالا ہوا تو اس کی اہمیت اور بڑھ گئی۔ یوں علم معاشیات نے ان ساری تبدیلیوں اور ہنگاموں سے گزرتا ہوا آہستہ آہستہ بڑھتا ہم تک پہنچا ہے۔ اور موجودہ دور میں تو اس کو اخلاقیات، فلسفہ، اور مذہب سے بالکلیہ الگ کرکے پڑھا اور سمجھا جارہا ہے۔ گویا اب یہ کہنا درست ہوگا کہ علم معاشیات زندگی کے پہلوؤں سے بحث کرتا ہے اور ہماری حالت ان راہروؤں کی سی نہیں جو صرف پیشروؤں کے نقوش قدم پر چلنا ہی کافی سمجھتے ہیں، بلکہ ہم آنیوالی نسلوں کے لئے رہبری کا کام بھی انجام دے رہے ہیں۔

آج کل جو ترقی پسند ادب کا وجود عمل میں آیا ہے وہ انہی معاشیاتی مسائل کا مرہون منت ہے مزدور سرمایہ دار کی الجھنوں کو جن ادیبوں نے سلجھایا انہیں زندگی کے مسائل کا صحیح ترجمان سمجھا گیا۔ جن شعراء نے روٹی اور اخلاق پر شعر کہے ان کی شاعری کو مظہر حیات قرار دیا گیا۔ ادب زندگی کی تفسیر ہے۔ اور اس کو زندگی بخشنے والا عنصر ہی علم معاشیات ہے۔ چنانچہ آج کل ہر ادیب کسی نہ کسی طرح "چکی پیسو روٹی کھاؤ" ضرور ہی کہتا ہے۔ لیکن یہ خیال یورپی ادبیات سے مستعار لیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس علم معاشیات کو جو بھی ترقی ہوئی

اور اس نے جتنی بھی تربیت پائی وہ یورپی ممالک کے زیرسایہ پائی۔ مشرقی ممالک خصوصاً ہند وتہران کی بابت تواب تک بھی زیرغور رہا کہ کن قوانین معاشیات کا اس زخم نصیب ملک پر اطلاق ہو سکتا ہے، اور کن کا نہیں۔ بس اس سے زیادہ ہمارے ملک کو معاشیات سے تعلق نہیں۔ البتہ امریکہ۔ انگلستان اور جرمنی وغیرہ میں جنگ سے قبل بھی اور دوران جنگ میں بھی معاشیات کی کارگزاریاں غور بین حضرات کو دعوت فکر وعمل دیتی رہیں یہاں ہم اندیشہ بیش وکم میں گھرے ہوئے ہیں جب کہ وہاں ذوق طلب ہے۔ آگے بڑھے جانے کی خواہش ہے کمال کو پہنچنے کا شوق ہے۔ مادی ترقی کی چاہ ہے نہ صرف چاہ ہے بلکہ انسان کی ساری توانائی سمٹ کر مادی ترقیات کی نذر ہو گئی ہے۔ سوچئے تو وہاں کیا نہیں ہے اور یہاں کیا ہے۔ خصوصاً صنعتی انقلاب کے بعد سے سائنس کی ایجادات نے پیدائش دولت میں خاصہ اضافہ کیا۔ اور سوچنے والے دماغوں کے لئے ایک بہت بڑی راہ نکل آئی۔ یہاں تک کہ ترقی یافتہ ممالک کی ذہنی کاوشیں زیادہ تر صنعت وتجارت کی طرف صرف ہونے لگیں۔ تاکہ مادی دولت سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھایا جائے گویا آدم اسمتھ کی یہ رکھی ہوئی بنیادوں پر ستھرویں اور اٹھارویں صدی میں ایک عالیشان عمارت تعمیر ہوئی۔ اس وقت سے ابتک اس میں نقش ونگار بنتے رہے ہیں اور ہنوز اس کی زیبائش پایہ تکمیل کو نہیں پہنچی۔

دیکھا آپ نے! اس آباد دنیا کے ہم جیسے بسنے والوں نے کیا کیا کر دکھایا۔ اور زندگی کی دوڑ میں ہم کس قدر پیچھے رہ گئے ہیں۔ کاش اس آباد اور وسیع محلہ میں بسنے والا کوئی تو پڑوسی ہمارا ہمدرد ہوتا۔

اٹھو وگرنہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی
دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا!

معراج

دے ولولہ شوق جسے لذت پرواز
کرسکتا ہے وہ ذرہ مہ ومہر کو تاراج
مشکل نہیں یاران چمن! معرکہ، باز
پرسوز اگر ہو نفس سینہ دراج
ناوک ہے مسلمان! ہدف اس کا ثریا
ہے سرسراپردہ جان نکتہ معراج
تو معنی والنجم نہ سمجھا تو عجب کیا
ہے تیرا مدوجزر ابھی چاند کا محتاج

علامہ اقبال

غیر مہذب رسمیں

ہندوستان اپنی رسومات کی وجہ سے تمام دنیا میں مشہور ہے۔ زمانہ حال تک بھی جبکہ دنیا کے اور ممالک نے پرانی بندشوں کو توڑ کر نئے طریقہ پر بود و باش اختیار کر لی ہے۔ ہمارے ہاں ہی ڈھاک کے تین پات والا قصہ پیش نظر ہے ایک ہندوستانی بعض اوقات رسم و رواج کی پابندی میں اس طرح جکڑا جاتا ہے کہ اسے اپنی زندگی تک اجیرن دکھائی دیتی ہے۔ اور اگر اسے اپنی جان بھی دینی پڑے تو شاید وہ دریغ نہ کریگا۔

میں ہندوستان کی تمام رسموں کے خلاف نہیں ہوں۔ در اصل ہم انہیں رسومات کی وجہ سے آپس میں میل جول کا بہانہ پا لیتے ہیں اور اگر تمام رسموں کا ملیامیٹ کر دیا جائے تو انسان ترقی کرنا بند کر دے۔ دنیا میں انسان اگر اپنی زندگی بنانے میں ایک دوسرے کا محتاج نہیں تو مددگار ضرور ہوتا ہے۔ یہی انسانیت کا تقاضا ہے۔ اس لئے رسومات پر کار بند رہنا کسی حد تک دنیا کی ترقی میں ہاتھ بھی بٹاتے ہیں۔ صرف قابل اعتراض وہ رسمیں ہیں جو حد سے تجاوز کر جائیں اور انسان کو ایسا بننے پر مجبور کر دیں گویا دنیا میں وہ رسموں کیلئے پیدا ہوا ہے نہ کہ رسمیں اس کے لئے۔

ویسے تو ہندوستان کے تمام گوشوں میں رسومات کی پابندی ہوتی ہے۔ اور ہر ملت و ملت کے افراد اپنے مخصوص رواجوں میں بستے چلے آرہے ہیں۔ لیکن صوبہ سرحد پابندی رسومات کی وجہ سے تمام پر سبقت لیتا نظر آرہا ہے۔ مجھے باقی صوبوں کے حالات کا اتنا مشاہدہ نہیں لیکن ترقی کی رو سے چونکہ سرحد پسماندہ ہے اس لئے اس کی پسماندگی کی ایک بڑی وجہ غیر مہذب رسومات کی پابندی پر بھی عائد کیگئی ہے

ثریا پروین
بی۔ اے
(پشاور)

کہنے کو تو ہزاروں ہی رسمیں نکل آئیں۔ لیکن میں ان سب کا ذکر کر کے رسالہ کے قیمتی صفحات نہیں بھرنا چاہتی اس لئے چند رسومات کا مختصر بیان کروں گی۔

پیر اور قبر پرستی میں لوگوں کا بہت اعتقاد ہے بیماری کے موقع پر بھی پیروں کا علاج ہوتا ہے۔ اور چاہے بیماری کتنی ہی خطرناک صورت اختیار نہ کرے یہ ڈاکٹر کے پاس لے جانے سے گریز کریں گے۔ کیونکہ ان کے خیال میں انگریزی دوا میں شفا نہیں

ایسی حالت میں مریض کو کبھی ایک زیارت پر لے جاتے ہیں اور کبھی دوسری پر۔ چونکہ ان کا پختہ اعتقاد ہے کہ ایسا کرنے سے مرض دور ہو جاتا ہے اس لئے کئی بار مریض واقعی صحت یاب ہو بھی جاتا ہے اگرچہ بیماری اور صحت تو خدا ہی کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ لیکن کئی بار مرض دائمی ہو کر رہ جاتا ہے۔ پچھلے ہی دنوں میں میں نے ایک گھرانے میں (جن کے مرد کافی تعلیم یافتہ ہیں) سب کی آنکھوں کو خراب پایا میں نے پوچھا "کیا آپ ان کا علاج نہیں کرواتے" تو جواب ملا "کئی زیارتوں پر لے جا چکے ہیں۔ لیکن کچھ افاقہ نہیں ہوا" اور نہ جانے کون کونسی دوائیں آنکھوں میں ڈالتے ہیں جن سے الٹا آنکھیں خراب ہو رہی ہیں۔

بیٹے کی پیدائش یہاں سب کے لئے خوشیوں کا پیغام لاتی ہے۔ غریب سے غریب شخص بھی بیٹا پانے پر اپنی حیثیت سے کہیں زیادہ خرچ کر کے برادری میں نام پیدا کرنے کا خواہشمند ہوتا ہے اور وہ اپنی خواہش کو یا تو قرض لے کر یا گھر کا کوئی زیور بیچ کر پایہ تکمیل تک پہنچاتا ہے۔ بیٹی کی پیدائش پر سب کے منہ اترے سے نظر آتے ہیں۔ یہ کمزوری تو ہندوستان کے ہر حصہ ہی میں پائی جاتی ہے۔ لیکن یہاں تو یہ عالم ہے کہ کسی کے ہاں دوسری سے تیسری لڑکی پیدا ہو گئی تو ہمسایہ میں افسوس کرنے چل نکلتیں ہیں۔ حالانکہ شریعت پر ناز کرنے والے گھر سے باہر جا کر تحریروں۔ تحریکوں اور تقریروں سے لڑکی کو اس کا جائز حق دلوانے پر کوشاں ہیں۔

جس دن لڑکے کا عقیقہ ہو اس دن گھر میں میلہ سا لگ جاتا ہے۔ اس تقریب میں سب واقف کاروں کو دعوت دی جاتی ہے۔ یہ تو کسی حد تک مناسب ہے۔ بیشک خوشی کے موقع پر اپنے عزیز واقارب کو اکٹھا کرنا برا نہیں۔ لیکن اعتدال سے جو بات باہر ہو جائے اس میں خوشی اور سادگی کا لطف نہیں رہتا۔ اسی تقریب پر گانے والیوں کو بلوایا جاتا ہے جن کی فضول حرکات دیکھ کر انسان کو ہنسی بھی آتی ہے اور رونا بھی۔ اور اگر بالفرض کسی نے گانے بجانے کا انتظام نہیں کیا تو سماج کی نظروں میں اس نے کچھ نہیں کیا۔ حالانکہ یہ سب کو بخوبی معلوم ہے کہ ایسے رواج کی پابندی میں ان کی کتنی رقم پر پانی پھر جاتا ہے لیکن یہ ڈرتی ہیں اور رسومات پر قایم رہتی ہیں۔ مبادا سماج میں ان کی ناک نہ کٹ جائے۔

ختنوں کے موقع پر تو اچھی خاصی شادی کا سماں بندھ جاتا ہے۔ ویسے بھی جو مبارکبادی کیلئے آتی ہیں ان کی مہمان نوازی اور خوشنودی کے لئے کچھ کم خرچ نہیں ہوتا۔ لیکن خاص مقررہ

دنوں پر تو سب دوستوں کو مدعو کیا جاتا ہے۔ لڑکے کو چاہے وہ کتنا ہی کمسن ہو پھولوں کا سہرا پہناتے ہیں۔ صرف لڑکے ہی کو نہیں۔ بلکہ اس کے سب بھائیوں اور چچیرے بھائیوں کو بھی پھول پہنائے جاتے ہیں۔ صبح سے لے کر شام تک روٹی چائے، شربت وغیرہ مہمانوں میں تقسیم ہوتا رہتا ہے۔ قسم قسم کی مٹھائیاں بنتی ہیں جو مہمانوں کو رخصتی کے وقت دیجاتی ہیں۔ اپنے رشتہ داروں اور خاص خاص دوستوں کو تو کپڑے بھی ملتے ہیں غرضیکہ یہ تقریب بھی شادی سے کسی درجہ کم خرچ نہیں ہوتی دو برس کی بات ہے اسی قسم کی ایک تقریب پر مجھے بھی دعوت ملی۔ معاملہ بھی گاؤں کا تھا۔ اس لئے مجھے بہت مسرت تھی۔ کیونکہ شہری تعاریب تو کئی بار دیکھ چکی تھی۔ متذکرہ تکلفات کے علاوہ انھوں نے خاص ہمارے لئے الگ الگ پلیٹوں کا انتظام کیا۔ ورنہ یہاں ایسے مواقع پر چار چار یا پانچ پانچ ایک ہی جگہ کھانے لگجاتی ہیں۔ میں نے باتوں باتوں میں ایک لڑکی سے پوچھا "آپ کے خیال میں اتنا زیادہ خرچ فضول نہیں۔ اگر آپنے چند دوستوں اور عزیزوں ہی کو بلوایا ہوتا تو کافی نہ تھا اور غریبوں میں خیرات بانٹ دی ہوتی" تو وہ فرماتی ہیں "روز روز ایسے موقع تو نہیں آتے۔ خوشی مناتے وقت پیسے کی کیا پرواہ"

چاہے بعد میں قرض کی وجہ سے عدالت کی سیریں ہی کیوں نہ کرنی پڑیں۔

بیٹی کی پیدائش تو ان کے لئے باعث رنج ہوتی ہے لیکن اس کی شادی پر یہ خوش ہوتے ہیں۔ خوش اسلئے کہ ان میں لڑکی دینے کے معاوضہ میں رقم ملتی ہے۔ گویا ایک قسم سے یہ لڑکی بیچتے ہیں۔ یہ رسم کسی حد تک مٹتی جا رہی ہے لیکن صرف ان لوگوں میں جن کے دماغ تعلیم سے اچھی طرح منور ہو چکے ہیں۔ دیگر شریعت بل جو حال ہی میں پاس ہوا ہے اس کے لحاظ سے لڑکی کو اب باپ کی جائداد میں سے بھائی کی نسبت تیسرا حصہ بھی مل سکتا ہے۔ لیکن یہ طبقہ ابھی نابود ہی سمجھ عام لوگوں میں لڑکی کے خلاف ابھی وہی متعصبانہ زاویہ برقرار ہے جس میں لڑکی کو پرایا دھن اور والدین کے گھر کی مہمان سمجھا جاتا ہے اس لئے ابھی بیچاری کی عمر تیرہ یا چودہ برس کی بھی نہیں ہونے پاتی کہ والدین کو اس کی شادی کی فکر کانٹے کی طرح چبھنے لگتی ہے درحقیقت لڑکیوں میں تعلیم کا رواج تو ہے نہیں تاکہ تھوڑی بہت تعلیم حاصل کر لینے کے بعد شادی کا تذکرہ چھیڑے اس لئے بچپن ہی سے ماں باپ داماد کی کھوج میں لگ جاتے ہیں اور رشتہ ملنے پر منگنی کی رسم بڑے تزک و احتشام سے ادا ہوتی ہے منگ

کے موقع پر اگر سسرال کی طرف سے جوڑا ذرا معمولی آگیا تو لڑکی والے اپنے سمدھیوں کو متنفر نگاہوں سے دیکھنے لگتے ہیں۔ گویا ان کے نزدیک شادی کا نصب العین اعلیٰ کپڑوں پر مشتمل ہے ابھی چند ہی روز ہوئے میں نے ایک ایسا واقعہ دیکھا ہے۔ مجھے تو ہنسی سی آگئی اور میں نے کہہ بھی دیا "شادی تو کپڑوں سے نہیں ہو رہی۔ پھر فکر کا ہے کا" لیکن ان کے خیالات میں غرق ہوں تو ہماری باتوں کا کیا اثر۔

منگنی کی بھی کئی فضول رسومات رائج ہیں لیکن انہیں میں یہاں بیان نہیں کرنا چاہتی، اور شادی کی رسومات تو اس قدر ہیں کہ ہر ایک رسم بجائے خود ایک مضمون بنا دے اس لئے بشرط زندگی پھر کبھی اس کا ذکر کروں گی۔

محبت

ایک رومان پرور شام تھی۔ آسمان ایک حسینہ کے بے داغ چہرے کی طرح صاف تھا میں ایک فوارے کے قریب کھڑی مناظر قدرت کا لطف اٹھا رہی تھی ہوائیں سرد سرد چل رہی تھیں۔ بڑے بڑے درخت اور ننھے ننھے پودے ایک دوسرے کے گلے مل رہے تھے۔ سفید۔ سرخ اور زرد پھولوں کی بہار تھی۔

پریم پجارن

فوارے کا پانی اس حسین مجسمہ کی آنکھوں سے فضا میں موسیقی پیدا کرتا ہوا حوض میں گر رہا تھا دیکھتے ہی دیکھتے آسمان پر شفق پھولی۔ آسمان کا مغربی کونہ گلابی گلابی ہو گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی نے بوڑھے چرخ سے ہولی کھیلی ہے۔ طیور اپنے اپنے آشیانوں میں پہنچنے کے لئے شور مچا رہے تھے۔ دور کوئل کوک رہی تھی۔ میں سوچ رہی تھی کہ کاش میں شاعرہ ہوتی۔ اطراف کی چیزوں نے میرے جذبات میں ایک ہلچل مچا دی تھی۔ میں تخیلات کے بحر میں غوطہ کھانے لگی۔ کسی نے مجھے پکارا "پریم" ایسا معلوم ہوا کہ کسی نے مجھے اس بحر بیکراں میں ڈوبنے سے بچا لیا ——— میں چونک پڑی میرے سامنے میرا خالہ زاد بھیا ونود کھڑا تھا۔ اس کے خوبصورت بال پریشان تھے۔ اس کی نرگسی آنکھیں اداس تھیں۔ چہرہ ایک لاش کی طرح سفید تھا۔ ان کا چہرہ یا بدن میلا ہو چلا تھا وہ اپنے کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے کھڑے تھے۔ میں نے پہلے اس مہر سکوت کو توڑا۔

میں۔ بھیا۔ آپ کب آئے۔ ارے یہ آپ کی کیا حالت ہو گئی۔ کہئے چپ کیوں ہیں۔ اچھا آئیے اندر چلیں۔ میں انہیں گھسیٹ کر کمرے میں لے آئی وہ کرسی پر بیٹھ گئے اور ایک سگریٹ سلگایا۔

(باقی آئندہ)

"بی ہمسائی"

سلطانہ عزیز بی اے (عثمانیہ)

صبح ہوئی اور بی ہمسائی کی گرج دار آواز
آنی شروع ہوئی۔ سورج کی بڑھتی ہوئی حدت کے
ساتھ ساتھ آواز میں بھی شدت پیدا ہوتی جاتی
کبھی میاں نہنو پر برس پڑتیں "ارے کمبخت
نا نصیب۔ تجھ سے مرغیاں کھولنے کے لئے کس چڑیل
نے کہا تھا۔ دیکھ نا یہ پودینہ کا کٹا لئے بھاگ رہی
ہے ——— صورت کیا دیکھتا ہے۔ بھاگ اس کے
پیچھے موئے بادل گرج گرج کر آپ ہی آپ تھم جاتا
ہے۔ بی ہمسائی بھی شور وغل مچا کر چپ ہو رہتیں
تھوڑی دیر بھی نہ گزرتی غریب چھوٹو کی شامت
آجاتی "اے ہے یہ لونڈا تو مجھے جیتے جی کھا جائیگا۔
منحوس کہیں کا، ساری دنیا کے بچے
اگر اس قماش کے ہونے لگیں تو
مائیں دیوانی ہو جائیں دیوانی"

طوفانی آندھیاں دندناتی ابھرتی ہیں اور چپکے
چپکے دب جاتی ہیں۔ بی ہمسائی کی آواز دھیمی ہوتے
ہوئے فضا میں غائب ہو جاتی۔ کائنات ایک
سکون کا سانس لینے لگتی۔ ہمسائی ایسے لاکھوں
سکوت اپنی پاٹ دار آواز سے چکنا چور کر چکی
تھیں۔ پھر وہی ہنگامہ بپا ہو جاتا۔ چیخوں میں لپٹی
ہوئی ڈانٹوں کی بوچھاڑ بیچارے بچوں سے شروع
ہوتی اور خاموش نوکرانی پر بخیر وخوبی انجام پاتی
کبھی کبھی بی ہمسائی کا موسلادھار مینہ غریب
شوہر پر بھی برس پڑتا جو شاعری سے زیادہ
عبادت کرنے کے عادی تھے۔ بیچارا مسجد کی راہ
لیتا۔ بی ہمسائی بغیر سانس لئے بولے جاتیں ناک
میں دم کئے جاتیں ——— ہاں تو ہماری بی ہمسائی
سپاہیانہ قسم کی عورت ہیں۔ فطرتاً جنگجو واقع ہوئی
ہیں۔ بغیر لڑے انہیں سکھ نہیں ملتا۔ کسی نہ کسی کے
پیچھے ہاتھ جھاڑ کر پڑ جاتی ہیں۔ بے اختیار کہہ پڑتیں
"جب سے اس گھر میں آئی چین تو نصیب ہی نہ
ہوا۔ اتنی سی تنخواہ میں آٹھ نو کی
پرورش۔ میرا ہی دل جانتا ہے"
بیوی کے گونجیلے راگ کے ساتھ کبھی
کبھی میاں شوہر کی آواز ایسے آجاتی جیسے نقارے
کی بلند آواز میں نفیری کا ہلکا سا سر۔

بیوی چیخ پیٹ کر چپ ہو رہتیں میاں ایسے
خاموش ہو جاتے جیسے انہیں سانپ ہی تو سونگھ
گیا ہو۔ غرض پڑوسن کے ہاں ہر وقت پٹاخے
اور پھلجھڑیاں چھوٹتی رہتیں۔ کبھی کبھار ایک آدھ

دھماکہ بھی ہو جاتا جس سے سارا محلہ لرز کر رہ جاتا۔ ساری فضا میں زلزلہ سا آجاتا۔ دن یوں ہی سرکتے جا رہے تھے۔ صبح ہوتی اور شام ہو جاتی۔ بی ہمسائی کی زندگی بھی اسی بے ڈھنگی رفتار سے بیت رہی تھی۔ آج صبح ہی صبح خلاف معمول ہنسی اور قہقہوں کی آوازیں ابھرنے لگیں ــــ سامنے لٹکے ہوئے کیلنڈر کی سنجیدہ لڑکی ناچتی دکھائی دینے لگی۔ وہ بدصورت چڑیا جو گھنٹوں آئینے سے لڑا کرتی۔ اپنی چونچ پٹخا کرتی آج ایک چڑے کے ساتھ اٹھلاتی ہوئی خوبصورت سی لگنے لگی۔ آج ہر چیز بی ہمسائی کی ہنسی کے تال کے ساتھ متحرک رہی تھی۔ ہماری باورچن جو محلے والی ابے سرے نغموں سے اکتا گئی تھی کہنے لگی، خدا خیر کرے آج تو پڑوسن ہنس رہی ہیں ذرا خبر تو لے آؤں ــــ میں سوچنے لگی۔ بھلا ایسی کیا چیز تھی جس نے چٹان ایسی سخت عورت پر ہنسی کے دورے طاری کر دیئے ــــ شاید ان کا لڑکا کامیاب ہو گیا ہے۔ مگر یہ بات تو اتنی فرحت بخش نہیں جس پر قہقہے لگائے جائیں۔ شاید ــــ شاہد میاں صاحب کی تنخواہ بڑھ گئی ہے ــــ بھلا اس پر ہنسنے کی کون بات ہے ــــ میں ان ہی خیالات میں گم تھی کہ باورچن کے آنے کی آہٹ ہوئی۔ میں تیز تیز پہنچی۔ پوچھا "یہ آج بی ہمسائی اس قدر کلبلین کیوں کر رہی ہیں" کہنے لگی اے بی بی۔ یہ قہقہے خسر کی موت پر لگائے جا رہے ہیں ــــ جنھوں نے بہت کچھ چھوڑا ہے"

میں نے کہا ــــ اور میاں اپنی چہیتی بیگم کی یہ خوش فعلیاں بیٹھے دیکھ رہے ہیں"۔ اس نگوڑے کو کیا خبر۔ وہ تین دن پہلے ہی اپنے باپ کی علالت کی خبر سن کر گاؤں سدھار چکے ہیں" میں سوچنے لگی۔ عورت ہے یا لوہے کی چادر۔ غم کے آنسو نہ بہائے گئے۔ خوشی کے قہقہے لگائے جا رہے ہیں کھلے دل سے کا تو غم کیا ہوتا کم از کم۔ خوشی نہ چھپائی گئی کم ظرف سے۔ میرا خون کھولنے لگا۔ بی ہمسائی کی انسانیت سوز حرکت پر سر کی رگیں ٹکرانے لگیں۔ ایک دوسرے سے۔ کئی دن خاصی چہل پہل رہی۔ بی ہمسائی کی سہیلیاں بطور پرسے کے آتیں لیکن مبارکباد کے تحفے دئے جاتیں۔ کئی ہفتے گذر گئے۔ واقعات کے نقوش وقت نے دھندلا دئے ــــ

ایک خموش اور ویران رات۔ ایسی ویران جیسے قبرستان۔ آسمان کے سنہرے داغ بھرے ہوئے زخموں کی طرح چمک رہے تھے۔ کراہنے کی دردناک آواز بلند ہوتے ہوتے فضا میں گونجنے لگی دفعتاً کسی پرند کی چیخ سنائی دی۔ کرب و اضطراب میں ڈوبی ہوئی۔ ساتھ ہی ہوا سسکیاں سی لینے لگی۔ ــــ ڈراؤنی رات گردشیں ... کتنے گذر گئی، پو پھٹ رہی تھی۔ دور بہت دور ــــ ندی کے قریب کوئی دکھی بانسری کی غمگین تانیں ہوا میں

اڑا رہا تھا —— بی ہمسائی کے گھر سے آج بھی
آوازیں آ رہی تھیں۔ تڑپ تڑپ کر رونے لگی۔
جو چڑیوں کے کورس کے ساتھ مل جل کر چیخوں میں
تبدیل ہوتی جا رہی تھیں۔ پڑوسن دھاڑیں
مار مار کر رو رہی تھیں۔ غم کے آنسو بہا رہی تھیں
—— اپنے باپ کی نعش پر —— دیوار پر لٹکے
ہوئے کیلنڈر کی لڑکی بدستور سنجیدہ نظر آ رہی تھی۔
—— وہ بدصورت چڑیا حسب معمول آئینہ سے
لڑ رہی تھی۔ اپنی چونچ پٹخ رہی تھی —— میرے
کانوں میں وہ مسرور قہقہے گونج رہے تھے جو مالدار
خسر کی موت پر لگائے گئے تھے۔ لیکن فطرت نے
ان قہقہوں کو آنسوؤں اور ہچکیوں سے بدل دیا
تھا جو انسانی دل کی گہرائیوں سے جھرنے کی طرح
پھوٹ پڑتے ہیں —— بی ہمسائی کے یاں ہنگامہ
تھا۔ ایک بے رونق اور اداس ہنگامہ ——
روح فرسا ہنگامہ۔

"انتہا"

آفتاب اونچے اونچے درختوں کے سایہ میں ڈوب
رہا ہے اس کی پھیکی پھیکی روشنی لمحہ بہ لمحہ کم سے کمتر ہو رہی
ہے اور شام کا دھندلکا آہستہ آہستہ گہرا ہو رہا ہے
ایسے سمے میں میں اپنی حیات کی انتہا تک پہنچنے کیلئے
بیقرار رہوں اور انہیں تفکرات میں غلطاں و پیچاں!....
مقدس داور! اس شوریدہ و ناہموار زندگی کی انتہا
کیا ہے اس قدم قدم پر الجھتی ہوئی، اور ہر لمحہ سیلاب بداماں
زندگی کی انتہا جس کے راستے پیچیدہ ہیں اور پرخطر۔ جہاں مصائب
کے خار ہیں، اور تفکرات کے نشتر! میری افسردہ روح
اس طرح کانپ رہی ہے۔ جیسے گرجنے والے سمندر کی شوریدہ موجوں
پر اک ننھا سا سفینہ لرزاں ہو۔ یا کوئی شکستہ ساز
سوزاں۔ شفق کے کنارے دن کو الوداعی پیغام
دے رہے ہیں اور آفتاب گوشۂ عافیت میں
سکون پذیر ہو گیا۔

لیکن میں اب بھی قایم خیال ہوں۔ دھندلکے
کی چھپی ہوئی گھڑیوں میں انتہائے حیات معلوم کرنے کو
بے چین ہوں اور انہیں تفکرات میں کھوئی کھوئی۔

اس الجھا دینے والی عبارت کو سلجھاتے سلجھاتے
میں تھک کر رہ گئی ہوں اور ناتوانی کے سمندر میں
ڈوبی ڈوبی!.....

میری زندگی کی مثال اس رباب کی طرح ہے جس کے تار ٹوٹ کر
اس کے نغموں کو خاموش کر دیتے ہیں۔ بڑھتی ہوئی تاریکی
میں سیاہ رات جھانک رہی ہے اور درختوں میں سے ایک شوخ
ستارہ ہنس رہا ہے لیکن میں آغاز حیات میں ہی اس کے
انجام تک پہنچ جانا چاہتی ہوں۔ اس کی انتہا
معلوم کرنا چاہتی ہوں اور اس کے جلد جلد خاتمہ کی متمنی
ہوں!....

محمودہ رضویہ (کراچی)

فریب ہستی

آہ بیتے ہوئے دن زندگی کے موہوم سے خواب بن گئے
— بچپن — !شادمانی کے نغمے بجاتا ہوا رخصت ہوا
کوئی ہنسے کوئی روئے۔بس ہر جگہ سے دامن جھاڑ کر نکل گئے۔زندگی پر سکون بنی رہی کہیں ٹھوکر کھا کر گرے تو دو بول کے سہارے اٹھ گئے۔زندگی کے سمندر میں دور سے پانی ہی پانی نظر آیا۔گناہ کے سہانے ڈھول سے کان ناآشنا ہی رہے۔یہ بے فکری کی گھڑیاں بہت جلد گذر گیئں اور ہم بھی وقت کی راہ سے گذر گئے۔یہاں — بہار کے پھول چن لئے گئے۔آزادی نے گھٹنے ٹیکے اور مسکرا کر ہمارے دامن کو فکر سے بندھ دیا —

عقل کی دنیا میں — احساس کی دیوی نے استقبال کیا — یہ تو ایک ملمع ہے زندگی کا — ہر طرف گناہوں کا گلزار انسان کو اپنے فریبی جال میں جکڑ لیتا ہے - ادھر عقل کی دنیا — ادھر احساس کا میدان — دوڑیں تو پکڑ لے نہ دوڑیں تو جکڑ لے۔قدم قدم پر مشکلات اور رکاوٹیں ڈرنے والے کو اور ڈرائے۔نڈر بن کر گذرنا چاہیں تو دامن میں لاکھوں کانٹے پائیں۔ . عقل۔احساس اور شعور۔بچپن میں کاہیکو شنی تھیں ایسی باتیں کیھیں آہستہ چلیں تو ٹھوکر۔نہ چلیں تو اوروں کا چلنا بھی دیکھا نہ جائے نیا روپ۔نیا رنگ۔دل میں ہر جگہ دوڑنے کی خواہش۔ دوڑنا چاہیں تو آوازیں سدِ راہ بن کر روکتی ہیں — دھیرے دھیرے چلنا ہر طرف کانٹے ہی کانٹے بچھے ہیں۔

— کہتے ہیں عقل سے انسان کو تاج سرداری ملتا ہے لیکن بچپن کی حکومت اور کرداری یہ عقل کی دنیا میں کہاں۔اس کے میٹھے بول تو آزادی کا نغمہ الاپتے ہیں یہ محکومیت کہاں — آگے بڑھیں تو پاؤں لہولہان ہو جائیں پیچھے ہٹیں تو بربادی بلائے — آہ — باغ زندگی میں پہلے شادمانی کی کلیاں کھلتی ہیں۔پھر زندگی پر خطر گھاٹیوں اور آلائشوں سے معمور ہو جاتی ہے جس میں عقل کا چشمہ پھوٹ نکلتا ہے جو انسان کو کبھی بحر بیکراں بناتا ہے اور کبھی شمع سوزاں — !انسان کی ہستی پہلے بیفکری کی بلندی پر پہنچتی ہے اس کے بعد کبھی کامیابی اور کبھی ناکامی کی راہ سے گذر کر وہی پستی — ابدی پستی میں سو جاتی ہے — !

ورق تمام ہوا مدح اور باقی ہے
سفینہ چاہیئے اس بحر بیکراں کے لئے

ساجدہ - احمد محی الدین

3238
REGD. M. No.

رجسٹرڈ آصفیہ نمبر ۱۳۲

محمودیہ مشین پریس چار مینار میں چھپ کر دفتر شہاب دبیرپورہ حیدرآباد دکن سے شائع ہوا۔

ماہنامہ

شہاب

شہاب

جلد ۳ دی ۱۳۵۴ فصلی م نومبر ۱۹۴۴ء نمبر ۲

مرتبہ

محمد عبدالرزاق بسمل

عوام سے چندہ سالانہ (للعہ) گورنمنٹ سے (لعہ)

نقد و نظر

جناب عطارد

احباب کی صحبت میں ایک نظم زیر بحث تھی یہ نظم تحت عنوان "پھول اور کانٹے" روز نامہ میزان کے خصوصی نمبر میں عبد القیوم باقی کے نام سے شائع ہوئی ہے۔ ایک نے کہا نہیں معلوم یہ کون صاحب ہیں اور کہاں کے باشندے ہیں دوسرے نے کہا کیا آپ نہیں جانتے عبد القیوم باقی ایم۔ اے لکچرار اردو عثمانیہ یونیورسٹی اور حیدرآباد کے ایک ذی علم شاعر ہیں۔ میں نے کہا شخصیت سے کیا غرض مصنف خواہ کوئی ہو مگر انصاف کی بات یہ ہے کہ اخبار میں اس نظم کو شائع نہ کرانا چاہئے تھا ایک نے جھلا کر کہا اخبار و رسایل میں شعرا کا کلام طبع ہوتا ہی رہتا ہے مگر انہوں نے اپنا کلام شائع کرایا تو برا کیا کیا۔ آخر اس نظم میں عیب ہی کیا ہے میں نے کہا قبلہ یہ نہ پوچھئے تجدد کا دور دورہ ہے نئی روشنی سے آنکھیں چندھیا رہی ہیں کبھی علم کی کمی کا رونا تھا آج طبیعتوں کی بدمزاقی کا ماتم ہے شاعر جذبات و حسیات کا مصور ہوتا تھا۔ آج مقررہ وزن پر تالیف الفاظ کا نام شاعری ہے جس حمام میں سب ہی برہنہ ہوں وہاں عیوب برہنگی کا شکوہ اور سمع قبول کی تمنا کس سے کی جائے۔ حقیقی شاعر اپنے جذبات حسیات و تخیل کو سادے سیدھے الفاظ میں اس انداز سے پیش کرتا ہے کہ محض حسن بیان اور لطف زبان ہی سے سننے والے پر اثر و انفعال کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے یا تشبیہ و استعارہ مجاز و کنایہ کی مدد سے اپنے تخیلات۔ ذہنی اعتبارات اور عقلی محتملات کی تصویر ایسے الفاظ میں اوتارتا ہے کہ سامع وجد کرنے لگتا ہے خیالی قضایا بھی قضایائے صادقہ نظر آتے ہیں بہر حال فن شاعری ایسا آسان نہیں جیسا کہ عام طور پر سمجھ لیا گیا ہے۔ سچ کہا ہے ؎ سخن گفتن و بکر جان سفتن است؛

زیر بحث نظم میں حسن بیان اور لطف زبان سے قطع نظر بعض تراکیب نادرست ہیں الفاظ بے محل اور محاورے کا استعمال غلط پایا جاتا ہے۔ انہوں نے کہا ذرا اس اجمال کی تفصیل کیجئے عرض کیا تفصیل کا تو یہ موقع نہیں مگر یہ یاد رکھئے کہ متانت بیان۔ شستگی زبان۔ سنجیدگی عبارات۔ شوخی اشارات۔ پست قافیہ اور نشست ردیف شعر کا محاسن کے اہم اجزا ہیں ائمہ فن کا تو یہ فتویٰ ہے کہ جس کلام میں قبض و بسط کی تاثیر نہ ہو اس کو شعر ہی نہ کہنا چاہئے کسی کے کلام کو جانچنے کا بس یہی معیار ہے۔

یہ نظم مسدس کے طور پر لکھی گئی ہے اس کا صدر عنوان ہے "پھول اور کانٹے" ذیلی عنوان پھول۔ کانٹے اور شاعر علیحدہ علیحدہ قایم کرکے ہر ایک کے تحت شاعر نے اپنے تخیلات کو نظم کا جامہ پہنایا۔ سرسری نظر میں جو شبہات ہیں وہ عرض کئے جاتے ہیں۔

نمبر ۱

پھول

قصیدۂ بہار ہوں شباب واردات کا — میرے لبوں پہ گیت ہے نئی تجلیات کا
میں اک نشان سجدہ ہوں جبین کائنات کا — سنا رہا ہوں ان کو میں فسانہ ساری رات کا
مجھے جو دیکھ لے کوئی خزاں بھی اک بہار ہو — ہزار بار آدمی پہ زندگی کا بار ہو

پھول کو بطور استعارہ ایک شخص فرض کر لیا مگر یہ نہیں کہلتا کہ "نئی تجلیات کا گیت" کس چیز سے عبارت ہے۔ نئی تجلی پرانی تجلی عام لوگوں کے فہم و ادراک سے بالاتر کوئی شئی ہوگی۔ "میرے لبوں پر گیت ہے" کے معنی صحیح یا غلط میں گا رہا ہوں فرض کرلے لیکن گانا پھول کی صفت نہیں ہے۔ مصرعہ ثانی میں ضمیر متکلم کی ضرورت ہے "شباب دار دات" بے معنی ترکیب اضافی ہے مگر کیا کیا جائے یہاں تو قافیہ ہی تنگ ہو رہا تھا اس لئے بلالحاظ صحت ترکیب واردات شباب کے عوض "شباب، واردات" کہہ کر شعر پورا کر دیا گیا۔ "کائنات" یعنی موجودات عالم پھول کو جبین کائنات پر نشان سجدہ قرار دینا مہمل ہے۔ چوتھا مصرعہ بھی ادعائے بے معنی اور متفرق الفاظ پر اجتماع الفاظ کی ایک مثال ہے۔ ٹیپ کا شعر بھی لفظوں کا کھلونا ہے زندگی کا بار ہزار بار ہونا کے کوئی معنی نہیں۔

ریاض زندگی میں اک کشاکش بہار ہوں — ہنسا رہا ہوں دہر کو اگرچہ دلفگار ہوں
کھلا ہوا ہوں شاخ پر کہ جبر و اختیار ہوں — ہر اک مجاہد نظر کے میں گلے کا ہار ہوں
تو ہمات دہر کا میں کوئی راز داں نہیں — میں وہ زمین عیش ہوں کہ جس کا آسماں نہیں

"ریاض زندگی" میں اضافت بیانیہ ہے "کشاکش بہار" یہاں بے معنی ہے۔ کشاکش کے معنی ہیں چھینا جھپٹی اور کنایہ ہے رنج و غم سے۔ پھول کا یہ بیان کہ "میں کشاکش بہار میں ہوں" کوئی معنی نہیں رکھتا۔ بہار ہے تو پھول بھی ہے۔ بہار کا وجود ہی پھول کے وجود کا باعث ہے۔ دوسرا مصرعہ بھی مہمل ہے

پھول کی صفت ہنسنا تو ہے مگر ہنسانا نہیں ہے۔ شاید یہ زعفران کا پھول ہے۔ "دلفگار" یعنی زخمی دل مجازاً عاشق۔ پھول کس کے عشق میں دلفگار ہے اور کیوں اوس کا دل زخمی ہوا ہے۔ یہ اوصاف تو بلبل کے ہیں وہ پھول کا عاشق اور موسم بہار میں نغمہ سرا ہوتا ہے۔ پھول کو ان باتوں سے کوئی دور کا تعلق بھی نہیں۔ تیسرے مصرعہ میں" میں جبر و اختیار ہوں مہمل جملہ ہے۔ شاخ پر پھول کے کھلنے کو مسئلہ جبر و اختیار سے کیا علاقہ۔ چوتھا مصرعہ بھی عجیب وغریب ہے "مجاہد" کفار سے لڑنے والے کو کہتے ہیں" مجاہد نظر کہہ کر خدا جانے مصنف نے اپنے ذہن میں اس کے کیا معنی قرار دے لئے۔ "گلے کا ہار ہونا" اردو کا محاورہ ہے جس کے معنی ہیں کسی سے لپٹ پڑنا یا گریبان گیر ہونا۔ ؎

میں نام پھول کا لے کر گناہ گار ہوا　　شراب جان کے قاضی گلے کا ہار ہوا　(بحر مرحوم)

ٹیپ کے دونوں مصرعوں میں معنوی ربط نہیں مصرعہ اولیٰ کا مفہوم پھول سے متعلق نہیں ہو سکتا۔ "زمین عیش" میں اضافت بیانیہ فرض کیجئے تو بھی کوئی مفید معنی پیدا نہیں ہوتے پھول کو بذاتہ عیش سے کیا واسطہ۔

پھول کی داستان پھول کی زبانی تو آپ نے سن لی اب کانٹے کی داستان کانٹے کی زبانی سنئے۔

کانٹا

غریب روزگار کی زبان نوحہ خواں ہوں میں　　کشاکش حیات کا ازل سے ترجماں ہوں میں

ہے خشک میری زندگی اگرچہ نوجوان ہوں میں　　کوئی اگر سنے مجھے تو ایک داستان ہوں میں

مرے خموشیوں میں اک پیام جاں نواز ہے　　کھٹک رہا ہے دل میں جو وہ میرے دل کا راز ہے

"روزگار" یعنی زمانہ۔ روزگار کی صفت غریب درحقیقت عجیب وغریب ہے۔ باعتبار تسمیہ کل باسم جزر روزگار سے مراد یہاں اہل روزگار ہو سکتی ہے۔ کانٹے کی تشبیہ زبان سے نہیں زبان نوحہ خواں سے دی گئی ہے۔ "نوحہ خواں" کی صفت مخصوص کی وجہ دونوں میں عقلی یا حسی کوئی وجہ شبہ نہیں پائی جاتی۔ مصرعہ ثانی کے مصنف کے ذہن میں کوئی فرضی معنی ہوں گے مگر بظاہر حالت کانٹے کے تعلق سے یہ مصرعہ مہمل ہے۔ "خشک زندگی" بے معنی ہے زندگی کی صفت خشک یا ترصحیح نہیں البتہ خشک جان یا خشک نہاد کہتے تو معنی ہو سکتے مگر کانٹے کے لئے جوانی یا بڑھاپا بے معنی ہے۔ مری ایک داستان ہے کے عوض

"میں ایک داستان ہوں" کہنا صحیح نہیں۔ ٹیپ کا شعر دولختی ہے دونوں مصرعوں میں کوئی ربط نہیں۔
خموشی دل میں وہ کیا پیام ہے جس کو جان نواز کہا گیا "کھٹک رہا ہے دل میں جو" یہاں لفظ جو صفت
ضمیری ہے اور اسم چیز یا شئی محذوف۔ یعنی "دل میں جو چیز کھٹک رہی ہے وہ مرے دل کا راز ہے"
مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کھٹک کس کے دل میں ہو رہی ہے اور فعل تذکیر کا استعمال اس موقع پر
بوجہ اس کے کہ جو اسم محذوف فرض کیا جاتا ہے وہ تانیث ہے درست ہو سکتا ہے یا نہیں۔ چونکہ
کانٹا "غریب روزگار کی زبان نوحہ خواں ہے" اس لئے اگر یہ کھٹک اہل روزگار یا افراد روزگار
کے دل میں فرض کی جائے تو یہ بھی بوالعجبی ہوگی کہ ایک کے دل کا راز دوسرے کے دل میں کھٹک
رہا ہے۔ کانٹے کے خموشیوں کا "پیام جان نواز" اور "کانٹے کے دل کا راز" اگر کچھ ہے تو اس کا
وجود شاعر کے ذہن میں ہوگا خارج میں اشارتاً کنایتاً بھی اس کا پتہ نہیں۔

غزل

جناب میر تراب علی خاں صاحب باز

خالق نے کیا بنائے ہیں اس سیمتن کے پاؤں — کتنے حسین ہیں میرے نازک بدن کے پاؤں

میں پاؤں چومنے جو گیا دیکھتا ہوں کیا — ڈالے ہوئے وہ بیٹھے ہیں اندر لگن کے پاؤں

اہل غرض ہیں جو بھی کریں سب بجا درست — پڑتے ہیں ہم ہر اک صنم و برہمن کے پاؤں

علم قیافہ جاننے والوں سے پوچھ لو — ہوتے ہیں خاص ساخت کے ہر اہل فن کے پاؤں

گلشن کی ہر روش پہ ہیں نقشے بنے ہوئے! — دیکھے نہیں ہیں آپ نے اک گل چمن کے پاؤں

معراج میں حضور سے کہتی تھیں حور عین — آنکھوں سے کیوں لگائیں نہ شاہ زمن کے پاؤں

آرام سے بہشت میں لیٹے ہوئے ہیں وہ — حوریں دبا رہی ہیں شہید وطن کے پاؤں

اب ماننے لگے ہیں ہمارے سخن کو وہ — اب چومنے لگے ہیں وہ اہل دکن کے پاؤں

کروبیاں کو **باز** کے اشعار یاد ہیں!
پہنچے ہوئے ہیں چرخ پہ اہل سخن کے پاؤں

پڑوسی

جناب سید نور الحسن صاحب بی۔ اے

مرزا نصرت اور پنڈت کشوری لال ایک ہی شہر میں ملازم تھے اور ایک ہی محلہ میں رہتے تھے۔ مکان سے مکان ملا ہوا تھا۔ صرف ایک دیوار بیچ میں تھی اس میں بھی آمد و رفت کے لئے کھڑکی بنالی گئی تھی۔ مرزا صاحب اور پنڈت جی گو طبیعتوں میں ایک دوسرے کے ضد تھے لیکن باوجود اس کے دونوں میں گہری دوستی تھی۔ مرزا صاحب کا بدن گداز، رنگ صاف، آنکھیں چمکیلی تھیں اور اُن میں ہمیشہ لال لال ڈورے پڑے رہتے تھے۔ اُن کی آواز بلند اور چال میں امیرانہ تمکنت تھی۔ اِس کے برخلاف پنڈت جی چھریرے بدن کے تھے۔ رنگ گندمی تھا، طبیعت میں نفاست بہت تھی، آہستہ آہستہ باتیں کرتے تھے اور چلتے وقت اِدھر اُدھر نہیں دیکھتے تھے بلکہ گردن نیچی کئے ہوئے زمین پر نگاہ جمائے راستہ چلتے تھے جیسے کسی کھوئی ہوئی چیز کو ڈھونڈ رہے ہوں۔ مرزا صاحب پکّے دہریئے تھے اور منہ کو جو آتا تھا واہی تباہی بک دیتے تھے لیکن پنڈت جی اپنے مذہب کے بےحد پابند تھے اور اکثر مرزا صاحب کو اُن کی اول جلول باتوں پر وعظ و پند کیا کرتے تھے۔

مرزا صاحب کی بیوی بھولی بھالی، سیدھی سادی تھیں اور میاں جو کچھ کہتے خاموشی سے سُن لیتی تھیں۔ اُن کے مذہب میں میاں کو جواب دینا گناہ عظیم تھا لیکن پنڈت جی کی بیوی اِس کے برعکس بہت تیز پانی کی تھیں۔ ذرا سی بات میں بگڑ جاتی تھیں اور جب بگڑتی تھیں تو تریاہٹ کے مصداق ہفتوں بلکہ مہینوں اٹوائی کھٹوائی لئے پڑی رہتیں اور نہ کھیلتی تھیں نہ منہ بولتی تھیں۔ پنڈت جی جب یہ رنگ دیکھتے تو فوراً رادھا کی بڑائی، تعریف اور توصیف کا بھجن الاپنا شروع کر دیتے اور واقعی پنڈت جی کا بھجن تیر بہدف ثابت بھی ہوتا۔ گھر والی کا غصہ خود بخود اتر جاتا اور پنڈت جی کی جان میں جان آتی اور پھر روزمرہ کی زندگی شروع ہو جاتی جیسے کچھ ہوا ہی نہ تھا۔

پنڈت جی کے سر کے بال آہستہ آہستہ گر رہے تھے اور مرزا صاحب اکثر مسکرا کر مذاقاً کہا کرتے کہ یار بھابی نے تمھیں آخر گنجا کر ہی دیا۔ پنڈت جی فرماتے کہ ان کے گھر میں شخصی آزادی ہے۔

ہندوستان کو حکومت خود مختاری سوراج ملے یا نہ ملے لیکن میں نے تو گھر والی کو خود مختاری دیدی۔ میں تمہاری طرح تو ہوں نہیں کہ بیوی کی حلق بندی کروں اور بیچاری کو لال لال آنکھیں دکھا کر دن رات ڈرایا کروں۔

مرزا صاحب۔ اجی پنڈت جی۔ بیوی پاؤں کی جوتی ہے جب چاہے پہنی جب چاہے اُتار کر پھینک دی۔ اُس کو زیادہ سر نہیں چڑھانا چاہئیے ورنہ حشر خراب ہوتا ہے انگلی پکڑنے دو، تو پھر بیگم صاحبہ پہنچے اور ہاتھ پر نہیں روکتیں بلکہ گردن پر سوار ہو جاتی ہیں اور جینا دوبھر کر دیتی ہیں۔

پنڈت جی۔ خوب یہ فلسفہ زندگی آپ ہی کو مبارک۔ ہمیں تو ہمارے بزرگوں نے یہ بتایا ہے کہ بیوی گھر کی دیوی ہوتی ہے۔ اس کا رکھ رکھاؤ اور دیکھ ریکھ ہمارا فرض ہے۔ ہم ہی اُس کی دلجوئی نہ کریں تو پھر کون کرے گا۔ ہاں مرزا صاحب اور سنو۔ بیوی کو سخت و سست سنانا نہ شرافت ہے نہ بہادری۔ ؎

کسی بیکس کو اے بیداد گر مارا تو کیا مارا
جو آپ ہی مر رہا ہو اُس کو گر مارا تو کیا مارا

مرزا صاحب نے قہقہہ مارتے ہوئے کہا خوب! پنڈت جی خوب۔ آپ تو عورتوں کے حقوق پر اچھا خاصا لیکچر ٹھونکنے لگے۔ عورتیں عقل کی اندھی ہوتی ہیں۔ ان کو مساوی درجہ نہیں دیا جاسکتا۔ آزادی کا وہ صحیح استعمال نہیں کرسکتیں اور ذرا بھی پڑھ لکھ کر آزاد ہو جانے کے بعد وہ نہ صرف خود گمراہ ہو جاتی ہیں بلکہ اپنے ماں باپ کے ماتھے پر بھی کلنک کا ٹیکہ لگاتیں اور خاندان بھر کا منھ کالا کرتی ہیں۔

پنڈت جی۔ ایشور نے بھلا ہی کیا جو آپ کے کوئی لڑکی نہ ہوئی ورنہ آپ اُس کو پیدا ہوتے ہی مار ڈالتے اور اگر قانون کے ڈر سے ایسا نہ کرتے تو تمام عمر جاہل رکھتے۔ ڈرا ڈرا کر اس کو بزدل بنا دیتے اور وہ جب بڑی ہوتی اور ماں بنتی تو اس کے بچے بزدل، غلامانہ ذہنیت کے ہندوستانی نکلتے۔ سلسلہ گفتگو یہیں تک پہنچا تھا کہ شانتا کودتی اور ہنستی ہوئی کمرے میں آگئی اور مرزا صاحب کی گود میں بیٹھ کر اُن کی جیبیں ٹٹولنے لگی۔ مرزا صاحب نے شانتا کے سر پر محبت سے ہاتھ پھیرا اور کہا۔ کہو، شانتا بیٹی آج میلے سے تمہارے لئے کیا لاؤں شانتا نے مرزا صاحب کے رخساروں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا لڈو، گڑیا، لٹو، پتنگ، سپاہی، موٹر اور . . . . مرزا صاحب نے بات کاٹتے ہوئے

اور ہنستے ہوئے کہا بس بس بیٹی بس۔ چچا کا دیوالیہ نکل جائیگا۔ مرزا صاحب نے شانتا کو گود سے اتارا۔ پیار کیا۔ اور دونوں دوست ایک دوسرے کی صورت دیکھتے ہوئے اور مسکراتے ہوئے دفتر چل دئے۔ شام کو دفتر سے آتے آتے مرزا صاحب بازار سے شانتا کے لئے اس کی فرمائش کے مطابق سب کھلونے لائے اور اپنے بیٹے محی الدین مرزا سے کہا کہ جاؤ یہ کھلونے اپنی بہن شانتا کو دے آؤ۔ کہنا کہ تمہارے چچا لائے ہیں۔ محی خوش ہوگیا اور کھلونوں کی ٹوکری اٹھا کر بھاگا۔

محی نہ معلوم کیوں شانتا کو دیکھکر خوش ہوجایا کرتا تھا۔ کوئی کھانے کی چیز اس کو ملے تو وہ پہلے شانتا کو کھلانا چاہتا تھا۔ کھلونوں سے خود نہیں کھیلتا تھا بلکہ چپکے سے شانتا کو دے دیتا تھا۔ دن بھر دونوں ساتھ ساتھ کھیلتے تھے۔ شانتا ذرا ذرا سی بات پر خفا ہوجاتی تھی محی اپنی روٹھی ہوئی شانتا کو ہاتھ جوڑ جوڑ کر مناتا تھا۔ بار بار کہتا تھا۔ شانتا، میں ہاتھ جوڑتا ہوں، معافی مانگتا ہوں، قصور ہوا معاف کرو، اب کبھی ایسی غلطی نہیں ہوگی۔ شانتا ٹھنک ٹھنک کر کہتی کہ تم ہمیشہ شرارت کرتے، مجھ کو ستاتے اور پھر معافی مانگا کرتے ہو۔ پرسوں ہی تم نے وعدہ کیا تھا کہ اب تم کبھی میرا گھروندا نہیں بگاڑو گے آج پھر وہی حرکت کی۔ اب میں تمھیں کبھی معاف نہیں کروں گی۔ کبھی تمہارے ساتھ نہیں کھیلونگی۔ محی دوڑ کر اس کے پیر پکڑ لیتا اور آنسو آنکھوں میں ڈبڈبا کر تھرائی ہوئی زبان میں کہتا۔ شانتا سچی میں نے تمھارا گھروندا نہیں دیکھا تھا۔ تمہاری قسم۔ ٹھوکر لگی اور یکایک میں تمہارے گھروندے پر گر گیا۔ اس میں میرا کوئی قصور نہیں۔ اگر میرا قصور سمجھتی ہو تو مجھے جو چاہو سزا دے لو لیکن میرے ساتھ کھیلنا نہ چھوڑو۔ شانتا۔ اچھا۔ کان پکڑو، توبہ کرو، اور دس مرتبہ اٹھو بیٹھو۔ مرزا جو تمہارا حکم۔ ایک...... دو...... تین ...... دس۔

اب ماشاءاللہ شانتا اور محی کی عمریں بارہ اور چودہ برس کی ہوگئی تھیں۔ دونوں تعلیم پا رہے تھے۔ اب دونوں کو ساتھ ساتھ کھیلنے کا موقع نہیں ملتا تھا۔ ہاں کبھی کبھی دونوں مدرسہ آتے جاتے یا کسی اور موقع پر باتیں کر لیا کرتے تھے۔ محی اب بھی پنڈت جی کے گھر میں آتا جاتا تھا اور شانتا بھی مرزا صاحب کے گھر میں جب جی چاہتا آتی تھی۔ محی شانتا کو اور شانتا محی کو کنکھیوں سے دیکھا کرتے تھے۔ شانتا محی سے باتیں کرتے ہوئے شرماتی تھی۔ جب کبھی بھی باتیں ہوتیں تو وہ پڑھائی لکھائی کی بابت ہوتیں۔ شانتا اور

دونوں ایک ہی جماعت میں تھے لیکن دونوں علٰحدہ علٰحدہ مدرسوں میں پڑھتے تھے۔ محی اور شانتا دونوں ہر سال امتحان میں کامیاب ہوتے گئے اور دونوں نے میٹرک اور پھر اُس کے بعد ایف۔ اے کے امتحان کامیاب کئے۔

مرزا صاحب پہلے سے ارادہ کرچکے تھے کہ محی کو ڈاکٹری پڑھائی جائیگی۔ پنڈت جی نے شانتا سے پوچھا کہ اس کا کیا ارادہ ہے۔ شانتا نے کہا کہ ہندوستان میں ہندوستانی لیڈی ڈاکٹروں کی کمی ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ ڈاکٹری پڑھوں اور اپنے وطن کے غریبوں کی سیوا کروں پنڈت جی کو یہ خیال بہت پسند آیا اور شانتا بھی میڈیکل کالج میں داخل ہوگئی۔ اس کالج میں تعلیم مخلوط تھی یعنی لڑکے اور لڑکیاں ساتھ ساتھ پڑھتے تھے۔ لڑکی اور لڑکوں میں کسی قسم کا امتیاز نہیں تھا وہ آپس میں ہنستے بولتے تھے اور ہر وقت مل جل سکتے تھے۔ شانتا اور محی دونوں گھر سے ساتھ ساتھ نکلتے اور ساتھ ساتھ گھر واپس آتے۔ راستہ میں دونوں اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے لیکن محی شانتا کو کبھی نظر بھر کر نہیں دیکھتا تھا۔ باتیں کرنے میں اُس کا دل دھڑکتا رہتا تھا اور کوئی چیز شانتا کو دیتے وقت اس کی انگلیاں اور ہاتھ پیر کانپنے لگتے۔ اس کی آواز باتیں کرتے کرتے اکثر تھرّانے لگتی، حلق خشک ہوجاتا اور بہ مشکل اپنے جملوں کو پورا کرتا جس میں اکثر پاس بیٹھنے کا اتفاق ہوتا اور جماعت اور تجربہ خانہ میں اکثر دونوں ساتھ ساتھ بیٹھتے یا اپنا اپنا کام کاج کرتے۔ محی تجربہ کرتے کرتے رک جاتا اور شانتا کی طرف دیکھنے لگتا اور تھوڑی دیر کے لئے کھو یا جاتا۔ شانتا شرم سے لجاتی جاتی لیکن بناوٹی ہنسی ہنستے ہوئے کہتی، مرزا غائب دماغ، کس باغ کی سیر ہو رہی ہے آپ بھی بس شیخ چلی ہیں، ہوا میں قلعے بنایا کرتے ہیں۔ اجی، مولانا تجربہ خراب ہوا جاتا ہے اور آپ ہیں کہ خیالی پلاؤ پکا رہے ہیں۔

محی چونک کر مسکراتا اور کہتا، معاف کرنا شانتا۔ مجھے اپنے بچپن کا زمانہ یاد آگیا تھا جب تم اور ہم دونوں معصوم تھے اور دن رات بیخوف کھیلا کرتے تھے۔ مجھے کبھی یہ امید نہیں تھی کہ بڑے ہوکر دونوں پھر ساتھ ساتھ ملیں گے اور میڈیکل کالج کے تجربہ خانہ میں علمی کھیل کھیلیں گے۔ شانتا شرما جاتی اور کہتی کہ جب بھی تم مجھ کو ستاتے تھے اور میرے بنے بنائے گھروندوں کو بگاڑتے اور بعد میں معافی مانگتے تھے اور اب بھی میرے تجربوں کا ستیاناس کرکے معافی مانگتے رہتے ہو۔ مرزا ہاں مگر فرق

صرف اتنا ہے کہ جب تم مجھ پر بگڑ تیں، خفا ہوتیں، روٹھ جاتیں اور صلواتیں سناتی تھیں اور اب

. . . .

شانتا- ممی باتوں باتوں میں گھنٹہ ختم ہوا جاتا ہے- تجربہ ادھورا رہ جائیگا- پھر دونوں کام میں لگ جاتے- دن گزرتے گئے- پانچ برس کے بعد دونوں میڈیکل کالج سے کامیاب ہو کر نکلے-

پنڈت جی نے شانتا پر زور دینا شروع کیا کہ اب وہ شادی کرلے لیکن اُس نے منت سماجت کی کہ اس کی تعلیم ادھوری رہ جائیگی- اس کی حسرت تھی کہ انگلستان جائے اور لندن کی جامعہ سے S. C. R. F. کی ڈگری لائے- پنڈت جی بڑی مشکل سے راضی ہوئے اور شانتا ڈاکٹری کی اعلیٰ تعلیم کے لئے انگلستان روانہ ہوئی- ممی شانتا کو چھوڑنے اسٹیشن گیا- اس کا دل تو چاہتا تھا کہ بمبئی جائے لیکن اس نے مناسب نہیں سمجھا- بہت ممکن ہے کہ یہ سوچا ہو کہ اگر جہاز روانہ ہوتے وقت وہ مفارقت کی تاب نہ لا سکا تو بھانڈا پھوٹ جائیگا-

شانتا کو لندن گئے ہوئے ایک سال کا عرصہ گزر گیا- ممی گو ڈاکٹر ہو گیا تھا لیکن اس کا کسی کام میں جی نہیں لگتا تھا اس کی دل کی دنیا لٹ چکی تھی- اس کی جوانی کی بہار خزاں رسیدہ ہو چکی تھی- وہ جیتا تھا شانتا کو دیکھ کر اور شانتا سات سمندر پار ہزاروں میل کے فاصلہ پر بیٹھی تھی اب ممی جیتا تو کس کے لئے- اس نے اکثر سوچا کہ اس زندگی سے موت بہتر ہے- دل میں کہتا تھا- ع

'خاک ایسی زندگی پر تم کہیں اور ہم کہیں'

لیکن ممی پھر بھی پڑھا لکھا اور سب سے بڑھ کر سلجھا ہوا سمجھدار آدمی تھا- اپنے خیالات پر جلد قابو پا لیتا اور یہ کہکر دل بہلا لیتا کہ خودکشی بزدلی اور کم ہمتی ہے- شانتا کے لئے میرا تڑپنا حماقت ہے- شانتا نہ میری تھی اور نہ میری ہو سکتی ہے- وہ ہندو اور وہ بھی برہمن اور میں مسلمان- بھلا وہ کیوں میرے لئے سماج کے بندھنوں کو توڑے گی- پھر مجھ میں کونسے ایسے سرخاب کے پَر لگے ہیں- کون سا میں ایسا حسین ہوں؟ کونسا ایسا دولت مند ہوں؟ کونسی میری قابلیت کا ڈنکا بج رہا ہے؟ اب رہا محبت تو مجھے اس سے محبت سہی لیکن اُس کو مجھ سے قطعی محبت نہیں- محبت ہوتی تو کیا چھپ سکتی تھی باتوں سے، انداز سے، کردار سے معلوم ہو جاتا- محبت ہوتی تو مجھ کو تڑپتا چھوڑ کر کیوں چلی دیتی- ہوش کے ناخن لو- ممی تمہاری عقل چلی گئی ہے-

دیوانہ نہ بنو۔ اسی طرح سر جھکائے گھنٹوں وہ اپنے دل سے باتیں کرتا رہتا تھا۔ ایک دن محی اخبار پڑھ رہا تھا کہ اس کی نظر اس سرخی پر پڑی کہ حکومت ایک لڑکے کو وظیفہ دے کر انگلستان ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے بھیجنے کا ارادہ رکھتی ہے جو اپنے آپ کو اہل سمجھتے ہیں درخواست دیں۔
محی نے فوراً درخواست لکھی اور اپنے باپ سے کہا کہ قسمت آزمائی کرتا ہوں اگر منتخب کر لیا گیا تو پھر کیا ہے دن پھر جائیں گے۔
مرزا صاحب نے کہا۔ محی تم اتنے بڑے ہو گئے لیکن بچوں کی طرح باتیں کرتے ہو۔ اعلان تو محض تکمیل ضابطہ ہوتا ہے۔ اعلان کرنے سے پیشتر ہی تصفیہ کر لیا جاتا ہے کہ کس کو وظیفہ دیا جائیگا۔ دولت والوں، اثر والوں اور برسر حکومت افراد کی اولاد کو چھوڑ کر تم کو کون وظیفہ دینے چلا۔ غریب کو اور اس کی اولاد کو کون پوچھتا ہے۔
محی نے کہا "یہ تو آپ سچ فرماتے ہیں لیکن میں درخواست دید یتا ہوں۔ انسان کو مقدور بھر ہاتھ پیر مارنا چاہیئے پھر یا قسمت یا نصیب۔
مرزا نے کہا۔ جو تمہاری مرضی قسمت آزمائی کر کے دیکھ لو۔ درخواست دی گئی محی کی قسمت یاور تھی۔ محی کے کالج کا پرنسپل بھی انتخاب کرنیوالی کمیٹی کا رکن تھا۔ وہ صاحب اثر اور غریب پرور تھا۔ اس نے محی کے واسطے بہت زور لگایا۔ ایک انگریز بھی محی پر مہربان ہو گیا اور آخر کار وہ منتخب کر لیا گیا۔ محی انگلستان روانہ ہوا اور راستہ بھر شانتا کی تصوری تصویر سے باتیں کرتا ہوا گیا۔ انگلستان پہنچ کر وہ بھی جامعہ لندن میں داخل ہوا جہاں شانتا زیر تعلیم تھی۔ شانتا سے ملاقات ہوئی۔ چند مہینوں میں محی ہر دلعزیز ہو گیا۔ انگریز اور ہندوستانی دونوں اس کو قدر کی نظر سے دیکھتے تھے اور علمی مجلسوں میں اس کی بہت آؤ بھگت کیجاتی تھی لیکن اس میں کبھی غرور پیدا نہیں ہوا اُس کو سوائے اپنی تعلیم کے اور شانتا سے ملنے کے اور کوئی کام نہیں تھا۔ شانتا اور محی اکثر مل کر سیر و تفریح کو جاتے تھے کسی پُر فضا پہاڑی مقام پر، یا سمندر کے کنارے وہ اپنی تعطیلات صرف کیا کرتے تھے۔ وہ علمی بحث مباحثہ کے علاوہ اکثر مذہب اور سماج کی بندھنوں کی بابت بھی تبادلہ خیال کرتے تھے۔
ایک دن وقت سہانا تھا اور موسم خوشگوار، سامنے سمندر موجیں مار رہا تھا اور ایک چھوٹی سی کشتی موجوں کے تھپیڑوں سے ہچکولے لے رہی تھی، یہ معلوم ہو رہا تھا کہ اب ڈوبی تب ڈوبی۔
محی تھوڑی دیر تک خاموشی کے عالم میں ہچکولے لیتی ہوئی کشتی کو دیکھتا رہا اور پھر ایک ٹھنڈی

ٹھنڈی سانس بھر کر کہا ع
'کشتی خدا پہ چھوڑ دے لنگر کو توڑ کر'
شانتا جو ریتی پر پیر پھیلائے۔ آدھی لیٹی اور آدھی بیٹھی تھی اور مہی کی صورت کو غور سے دیکھ رہی تھی اوٹھ کھڑی ہوئی اور مہی کے کاندھے پر ہاتھ رکھکر کہا۔ خیریت قبلہ، بیچاری کشتی کا کیا قصور ہے جو لنگر کو توڑ کر ڈوبنے کے لئے چھوڑ دیا گیا۔ ہمت کرو، ہاتھ پیر مارو، خود بھی بچو، اور اس بے زبان کو بھی تیرا لیجاؤ۔ موجوں کے طوفان سے گھبرا گئے۔ مہی نے اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے کہا، نہیں شانتا گھبرایا نہیں۔ کشتی کو آنچ آتے نظر نہیں آتی۔ وہ توڈوب نہیں سکتی کسی نہ کسی کنارے پر ہچکولے کھاتی، گرتی پڑتی پہنچ ہی جائیگی اور پھر انند سے زندگی گزارے گی لیکن اگر میں اس سے چمٹا رہا تو ضرور میرے بوجھ سے ڈوب جائیگی۔ خیر مجھے اپنی پرواہ تو ہے نہیں۔ کشتی کا خیال ہے کہ میری وجہ سے وہ کیوں مصیبت میں پھنسے۔

شانتا مسکرائی اور اس نے کہا "قاضی کیوں دُبلے شہر کے اندیشہ سے"، پہلے اپنی خبر لو۔ یہ تو کہتے نہیں کہ اپنی جان عزیز ہے۔ اسی لئے کشتی کو چھوڑ اور لنگر توڑ بھاگے جاتے ہو۔

مہی۔ دیکھو شانتا چھیڑو نہیں ورنہ ایک مدت کا آبلہ پھوٹ رہے گا۔

شانتا۔ تم تو ایسی باتیں کر رہے ہو جیسے کسی کو کسی سے عشق ہو گیا ہو۔

مہی۔ عشق تو بہت بڑی چیز ہے۔ عشق کے نام کو میں بدنام بھی نہیں کرنا چاہتا۔ ہاں اُنس ضرور ہو گیا۔

شانتا۔ ہنستے ہوئے۔ خوب، خوب۔ اچھا آپ بھی انگلستان کی ہوا لگی۔ میڈکی کو بھی زکام ہوا۔

عجب تیری قدرت عجب تیرا کھیل
چھچھوندر کے سر میں چنبیلی کا تیل

اچھا بتاؤ تو سہی کہ وہ کون خوش قسمت ہستی ہے جو ہماری بھابھی بننے والی ہے۔

مہی۔ تم سنو گی تو شرماؤ گی۔

شانتا کی کنپٹی، ماتھا اور رخسارے لال لال ہو گئے اور پیشانی پر شرم کی وجہ سے پسینہ کے قطرے جھلمل جھلمل کرنے لگے اُس نے نظریں بچاتے ہوئے کہا میں کیوں شرمانے لگی۔ میں تو خوش ہوں گی۔ بھابھی کو شادی کا ایسا تحفہ دوں کہ وہ تو وہ تم بھی پھڑک جاؤ۔ اور ہاں! یہ یاد رکھو میں نیگ لیلوں گی ورنہ پھر عین موقع پر تم حیلہ حوالہ کرو تو خواہ مخواہ رنگ میں بھنگ پڑے گا۔ میں لڑوں گی اور بغیر من مانا نیگ لئے رخصتی نہ ہونے دوں گی۔

مہی۔ سُننا چاہتی ہو تو سُنو لیکن خدارا کان دھر کر۔ مجھے تم سے محبت ہے۔ میری آشاؤں کی دنیا تم ہو۔ تمہارے بغیر میرا جیون سُونا میری زندگی اداس ہے۔

تم جب میرے پاس نہیں ہوتیں تو چاند کی چاندنی باغ کی بہاریں میرے لئے بے معنی چیزیں ہو جاتی ہیں۔ تم ساتھ ہوتی ہو تو آبشار ایک دلنواز راگ گاتے معلوم ہوتے ہیں۔ میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ محی کی زندگی بغیر شانتا کے بیکار ہے۔

شانتا۔ اچھا۔ اب مجھے جانے دو۔ تم بہکی بہکی باتیں کرنے لگے۔

محی۔ اچھی شانتا۔ روٹھ گئیں۔ دیکھو میں اس دن کے لئے ڈرتا تھا یہ میری خطا نہیں تمہارا قصور ہے۔ تم نے اس ساز کو چھیڑا اور جب اس نے اپنا درد بھرا راگ نکالا جو اس میں بھرا ہوا تھا تو تم خفا ہو کر اس ساز ہی کو توڑ دینا چاہتی ہو۔ اچھا توڑ کر دیکھو۔ پھر وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خاموش ہو جائیگا۔ بالکل خاموش، ساکت، پھر اگر تم بھی اس کو بجانے کی کوشش کرو گی تو نہ بجے گا۔

شانتا۔ محی میں روٹھی نہیں اور نہ خفا ہوئی ہوں۔ یہ عمریں ہم لوگوں کے روٹھنے، بگڑنے اور خفا ہونے کے نہیں ہیں۔ اول تو جو کچھ تم کہہ رہے ہو اس کا مجھے یقین نہیں آتا اور دوسرے اگر مان بھی لوں تو میرا تمہارا رشتہ کیسے ممکن ہے۔ میں ہندو وہ بھی برہمن اور تم مسلمان۔ میں اپنے ماں باپ کو کیا منہ دکھاؤں گی اور تم چچا ابا کو کیا جواب دوگے۔

محی۔ ہندو مسلمان یہ سب لغو بحث ہے۔ ابھی ایک ہی ہفتہ ہوا کہ تم خود کہہ رہی تھیں کہ ہندو مسلمان دونوں اللہ کے بندے ہیں۔ انسان انسان سب برابر ہے۔ ان میں کسی قسم کا امتیاز اور فرق نہیں ہونا چاہیئے۔ اونچ ذات اور نیچ ذات کوئی چیز نہیں ان سماجی بندھنوں کو جس قدر جلد ممکن ہو توڑنا چاہیئے اور یہ ہم نوجوانوں کا کام ہے کہ کمر ہمت باندھیں اور میدان عمل میں کود پڑیں۔

شانتا۔ ہاں جو میں جب کہتی تھی وہ اب بھی کہتی ہوں، یہ ذات پات کی پابندیاں، یہ مذہبوں کے اختلاف اور اس کی وجہ سے ایک انسان کی دوسرے انسان سے شادی نہ ہو سکنا حماقت نہیں تو کیا ہے لیکن اس بندھن کو توڑنے کے لئے اگر میں نے تم سے شادی کر لی تو اول تو میرے بوڑھے باپ کو سخت صدمہ ہوگا اور بہت ممکن ہے کہ اس ضعیفی میں وہ اس دھکے کی تاب نہ لا سکیں دوسرے ماتاجی تو فوراً بیکھنٹ باشی ہو جائیں گی، تیسرے چچا ابا یعنی مرزا صاحب کیا خیال کریں گے اور چوتھے یہ کہ دنیا کہے گی کہ سماج سدھار کا شانتا اور محی نے جوڑ ڈھکوسلہ نکالا ہے وہ اصل میں اپنے ماتھے کا کلنک اور منہ کی سیاہی دھونا چاہتے ہیں۔

محی۔ یہ میں جانتا ہوں کہ سماج ہمارے تمہارے درپئے آزار ہو جائیگا وہ ہر ممکنہ طریقہ سے ہم کو ذلیل کرنے کی کوشش کرے گا لیکن کیا کسی کے ذلیل و حقیر کرنے سے کوئی ذلیل ہوتا ہے۔ ذلت انسان کے اعمال میں ہے۔

اگر انسان بُرے کام کرے تو وہ ذلیل شخص ہے چاہے
سماج اس کو سر پر بٹھائے کیوں نہ پھرے اور چاہے
اس کے آتے ہی تمام اہل محفل اٹھ کھڑے کیوں نہ ہو جائیں
عزت کوئی جوتے مار کر بھی نہیں لے سکتا - اگر کوئی بد
معاش کسی شریف آدمی کو چوراہے پر جوتے مارے
اور گالیاں دے تو کیا ان حرکتوں سے اُس شریف
آدمی کی عزت جاتی ہے - نہیں، ہرگز نہیں بلکہ اگر
شریف آدمی خاموش رہے تو وہ اپنی شرافت اور کمین
اپنے کمینہ پن کا برسر بازار مظاہرہ کر رہا ہے - اب
رہے ماں باپ - تو شانتا سوائے چند ماں باپ کے
جن میں کچھ نہ کچھ نفسیاتی خرابی ہوتی ہے اور جن
کے دماغ کی مشین کا کوئی نہ کوئی پُرزہ بگڑا ہوا
ہوتا ہے سب اپنی اولاد کی غلطیوں کو تھوڑے
دن کے بعد معاف کر دیتے ہیں - ہمارے والدین کو
رنج ضرور ہوگا - کیونکہ ہم لوگوں کی شادی پرانی
ریت رواج کے خلاف ہو گی لیکن کچھ دن کے بعد
اُن کا غصہ اُتر جائے گا - ہم اپنی خدمت سے اُن کو
خوش کریں گے وہ بگڑیں گے ہم ہاتھ جوڑیں گے
وہ ماریں گے ہم سر جھکائے مار کھائیں گے - وہ بُرا
بھلا کہیں گے ہم خاموشی سے سنیں گے -

شانتا - ہے تو ٹھیک - ایسا ممکن تو ہے لیکن
بچپن میں تم میرے گھروندے بگاڑ دیا کرتے تھے
اب اگر گھر بنا کر بگاڑا تو . . . . . .

محی - ہنسنے لگا - اور اُس نے تھرائی ہوئی
آواز میں کہا - اچھی شانتا - مذاق نہ کرو - بتاؤ کہ
تم میری بن سکتی ہو یا نہیں -

شانتا - اگر میں نہیں کہوں تو تم کیا کرو گے -
شائد غصہ میں آکر مجھے سمندر میں ڈبو دو گے اور
پھر کسی دوسری سے شادی رچا لو گے -

محی - شانتا - تم نے مجھے کیا سمجھ رکھا ہے میں
تمہاری عمر بھر پوجا کروں گا - تم میرے من مندر کی
دیوی ہو -

شانتا - ہندوستانی فلموں سے تم نے بھی دو
چار جملے خوب سیکھ رکھے ہیں - اچھا سنو - میں تمہارے
ساتھ شادی کرنے کو تیار ہوں - لیکن شرط یہ ہے کہ
ہم دونوں کی شادی کی کسی کو کانوں کان خبر نہ ہونے
پائے - اس کے علاوہ جب تک انگلستان میں رہیں
ہم دونوں علٰحدہ علٰحدہ رہیں بالکل اسی طرح جیسے اب
رہتے ہیں - ہندوستان پہنچنے کے بعد جب دونوں
نوکر ہو جائیں اور اپنی قوت بازو سے کمانے لگیں
اس وقت باہمی مشورہ سے یہ راز فاش کیا جا سکتا
ہے - ان شرطوں کو قبول کرنے کے لئے تم تیار ہو -

محی - نہایت خوشی سے -

شانتا - مناسب یہ ہے کہ شادی انگلستان کے
باہر فرانس کے کسی چھوٹے سے شہر میں کی جائے
تا کہ کسی کو خبر نہ ہو، اور اُس کے بعد تم مجھ سے اسطرح

ملتے رہو جیسے اب ملتے ہو۔ کوئی غیر معمولی بات ہمارے تعلقات میں پیدا نہیں ہونا چاہئے۔

محی اور شانتا انگلستان سے واپس آچکے اُن کی قابلیت کا شہر میں چرچا تھا لیکن کوئی یہ نہیں جانتا تھا کہ وہ میاں بیوی ہیں۔ شانتا کے ماں باپ نے شانتا پر زور دینا شروع کیا کہ لڑکی ذات کو بن بیاہی نہیں رہنا چاہئے۔ آخر کب تک بوں ہی بیٹھی رہے گی۔ نسبت پر نسبتیں آرہی تھیں جب پنڈت جی اور شانتا کی ماں بہت مصر ہوئے تو شانتا نے ہاتھ جوڑتے ہوئے اور قدموں پر سر رکھتے ہوئے اپنے باپ کو آپ بیتی سنادی اور کہہ دیا کہ شادی کی کوشش بیکار ہے اس کی شادی مہینوں برسوں گذرے محی کے ساتھ ہو چکی۔

پنڈت جی کے دل پر گویا بجلی گری۔ وہ سکتے کے عالم میں رہ گئے۔ لیکن آدمی سمجھدار تھے۔ تاڑ گئے کہ سانپ نکل گیا اب لکیر پیٹنے سے کیا ہونا ہے شانتا کی ماں کچھ دن بیٹی سے ناراض رہیں لیکن پھر بھی ماں تھیں، رحم آگیا اور ایک دن شانتا کو گلے لگاکر خوب روئی۔ دل کا بخار اتر گیا اور تب سے ماں بیٹی میں صفائی ہوگئی۔ محی نے مرزا سے پورا حال سنادیا۔ مرزا صاحب کو مذہب سے کبھی سروکار رہا ہی نہیں۔ وہ تو اصل پوچھو تو بہت خوش ہوئے۔

خدا نے محی اور شانتا کے دن پھیرے اور دونوں ہنسی خوشی ایک ہی مکان میں رہنے لگے حسد کرنے والوں نے خوب حاشیئے چڑھائے۔ بہت بدنام کرنے کی کوشش کی لیکن سانچ کو آنچ کیا۔ ان دونوں پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ یہ دونوں شہر کے مشہور ڈاکٹر تھے اور غریبوں کی جہاں تک ممکن ہوتا تھا سیوا کرتے تھے۔ ان کی حقیقی عزت لوگوں کے دلوں میں تھی۔

گو محی اور شانتا کی شادی کو نو دس برس گزر چکے تھے لیکن اُن کے پریم میں فرق نہیں آیا تھا۔ محی اب بھی باتیں باتیں کرتے کرتے کھو یا جاتا تھا، اور اس کی آواز تھرانے لگتی تھی اُس کے بچے جب دوڑتے ہوئے آتے تھے اور کوئی اس کی گود میں اور کوئی کاندھے پر سوار ہو جاتے تھے تو مسرت کی وجہ سے اُس کے آنسو نکل پڑتے تھے۔ وہ اب بھی شانتا کے سرہانے بیٹھ کر گھنٹوں اُس کی موہنی صورت کو دیکھتا تھا اور دل میں کہتا تھا کہ میرے من مندر کی دیوی میں تیرا ایک حقیر پجاری ہوں۔ خدا ہر ایک کو ایسی پوجا نصیب کرے۔

بتے دارم کہ گرد گل ز سنبل سایہ بان دارد

شریکِ زندگی سے خطاب

جناب جوشؔ ملیح آبادی

اے شریکِ زندگی! اس بات پر روتی ہے تو — کیوں مرا ذوقِ ادب ہے مائلِ جام و سبو؟
کس لئے اس پر نہیں روتی کہ مصنوعی صلوٰۃ — خم کئے دیتی ہے اپنے وزن سے پشتِ حیات
کس لئے اس پر نہیں روتی کہ دشمن کا عتاب — تیری ہم جنسوں کی راہوں میں الٹتا ہے نقاب
کس لئے اس پر نہیں روتی کہ ہے گرمِ فغاں — سبحہ و زنار میں جکڑا ہوا ہندوستان
کس لئے اس پر نہیں روتی کہ تیرے نونہال — بن رہے ہیں مغربی تہذیب سے رنگیں جمال
کس لئے اس پر نہیں روتی کہ تھے جو شہسوار — آج ان لڑکوں میں ہے لیلیٰ و سلمیٰ کا نکھار
کس لئے اس پر نہیں روتی کہ ہندی نوجواں — کھو چکا ہے صف شکن اسلاف کی روحِ تپاں
کس لئے اس پر نہیں روتی کہ شمشیرِ وطن — بن چکی ہے بزمِ مملوکی کی شمعِ انجمن
کس لئے اس پر نہیں روتی کہ ملت کا شباب — شیب کی ناوقت یورش سے ہے جویائے خضاب
کس لئے اس پر نہیں روتی کہ بیٹے کی جبیں — باپ کے ماتھے کی سی تابندگی رکھتی نہیں

چھوڑ کر چہرے کے دھبے آئینہ دھوتی ہے تو
میری درویشانہ میخواری پہ کیا روتی ہے تو

(ماخوذ)

کٹیا

جناب محمد فیض الدین صاحب ربانی

ہوسکتا ہے کہ پاداش اعمال کی تمنا مکافات معاصی کا خوف، اور کامل ترین عبادتیں بھی ہمارے کردار کو بلند کرنے میں ناکام رہیں۔ مگر آہ..... ایک پلکوں میں لرزتا آنسو، ایک گریہ آلود لہجہ۔ ایک مسترحم نگاہ ہمارے دلوں میں ایک وہ آگاہی لگا ہوں میں ایک وہ عبرت پیدا کر دیتی ہے کہ جس کے ذریعہ ہم انسانیت کے اعلیٰ ترین مقصد کو سمجھنے لگتے اور غفلت سے بیدار ہوتے ہیں۔

یہ کہکر ہمارا دلچسپ اور محبوب ترین دوست ایک طویل وقفہ کے لئے ساکت ہوگیا اور ہم چھ دوستوں کو جو اس کو گھیرے ہوئے تھے یکے بعد دیگرے ایسے دیکھنے لگا جیسے وہ ہماری حیرتوں کا غائر مطالعہ کر رہا ہے اور اپنی کامیابی پر مسرور ہے۔

ہمارا یہ معمول تھا کہ فرصت کے دنوں اوس کے ہمراہ چھ سات دوست حوالی شہر میں کسی پُرفضا مقام پر جمع ہوتے اور وہ ہم کو نادر واقعات اور انوکھے تجربات اپنے مخصوص پُر اثر انداز میں سناتا۔ جب وہ آنیوالے لمحات کے اثرات میں اپنے کو پوری طرح کھو چکا اور ہماری مشتاق نظریں ہماری موجودہ اثر پذیری ذو کی الحسی کی ترجمان بن گئیں تو وہ یوں گویا ہوا:۔

"ہاں تو ہم انسانیت کے اعلیٰ ترین مقصد کو سمجھنے لگتے اور عالم روحانی کے اثرات سے آشنا ہوتے اور غفلت سے بیدار ہوتے نہیں سنو۔ ایک دن کا ذکر ہے یہ واقعہ جس کو میں بیان کرنیوالا ہوں شہر۔م۔ کا ہے جس میں میں پانچ سال پیشتر تفریحاً چند دن کے لئے مقیم تھا۔ بارش ابھی تھمی تھی اور افق مغرب میں ابر چھٹ کر ستھرا آسمان نکل آیا تھا جس میں سورج تپتے ہوئے لوہے کی طرح سرخ نظر آرہا تھا اور اپنی ترچھی زرد کرنوں سے بھورے اور سیاہ بادلوں کے کناروں کو چمکاتا ہوا میری نظروں سے رفتہ رفتہ غائب ہو رہا تھا میرے سر پر بادل چھائے ہوئے تھے اور میں ایک بل کھائی ہوئی پگ ڈنڈی پر چل رہا تھا جس کے دونوں طرف سبزہ زار تھا اور گھنے درختوں کا ایک سلسلہ تھا جو دور فاصلہ کی پہاڑیوں پر چلا گیا تھا ہلکی ہلکی ہوا کے ساتھ درختوں اور مٹی کے تر ہو جانے کی وجہ سے ایک بھینی بھینی فرحت افزا خوشبو میرے دماغ میں بسی ہوئی تھی۔ تنا ور درختوں سے پانی کی موٹی موٹی بوندیں ٹپک رہی تھیں میں ان ہی

درختوں کے نیچے سے گزر رہا تھا اور ان بوندوں کو
جو میرے شانوں پر گر کر جذب ہو رہی تھیں بڑی
مسرت سے محسوس کر رہا تھا اور اس احساس میں
مجھ کو ایک فطری زندگی کا لطف آ رہا تھا۔ سورج
بہت جلد ہی غروب ہوگیا اور دیکھتے ہی دیکھتے
ہمارے آسمان پر ابر چھا گیا۔ چڑیوں کے بسیرے کا
وقت آگیا۔ میرے اطراف گھنے درختوں میں اون کا
شور و غوغا شروع ہوا۔ میں پگڈنڈی پر آگے ہی
آگے اس باصرہ نواز منظر کی سیر کرتا ہوا بڑھا چلا
جا رہا تھا کہ یکایک میرے کانوں میں ایک دلگداز
چیخ گونج گئی میں اچھل پڑا اور حیرت کیا یہ کیسی چیخ
تھی جو ساری فضاء میں ایک ارتعاش پیدا کر گئی۔
یہ کیا آواز تھی جو پرندوں کے اتنے شور پر غالب
آگئی میں نے اپنے چاروں طرف نگاہیں دوڑائیں
مگر وہاں کوئی نہ تھا۔ میں اس کا اندازہ بھی نہ کر سکا
کہ وہ چیخ کی آواز کدھر سے آئی۔ میں سمجھا یہ میرا کوئی
وہم ہوگا یا ہوا کی سرسراہٹ مگر پھر بھی میرے
قلب کو اطمینان نہ ہوا، اور نگاہیں دور فاصلے کے
درختوں پر جمی ہوئی تھیں دفعتاً پھر میں نے وہی
دردناک نالہ سنا جو اب کی دفعہ ایک دل کو لرزا
دینے والے شیون میں تبدیل ہوگیا۔ میں نے خیال
کیا کہ کسی گڈریے کا بچہ کسی درندے کا شکار بن
گیا ہے اور ساتھ ہی بغیر کوئی اہم ارادہ کئے آواز کی
سمت روانہ ہوا۔ ناگاہ مجھے ایک درخت کے
سایہ میں کوئی کٹیا نظر پڑی جس کا دروازہ دوسری
جانب تھا۔ میں نے اوس کی طرف کوئی توجہ نہ
کی کیونکہ مجھے اس کا یقین تھا کہ ایسی آواز
اس کٹیا سے بلند ہونے کی نہیں مگر میرے لئے
یہ کیسا تحیر خیز امر تھا کہ یہ تھرا دینے والی چیخیں
اسی کٹیا سے بلند ہو رہی تھیں اب میرے دل
میں کوئی اور خیال نہ تھا مگر یہ تشویش کہ یہ کیا
راز ہے؟ میں نے اچھی طرح اوس کی طرف کان
لگا دیئے اور آہستہ آہستہ ادھر بڑھتا گیا مجھے
اب ایسا معلوم ہونے لگا کہ کوئی کسی کو مار رہا ہے
اور زد و کوب کی آوازیں صاف سنائی دیتی تھیں
میں بے تحاشا ایک چھوٹا سا چکر کاٹ کر کٹیا
کے دروازہ پر پہنچ گیا۔ دیکھتا کیا ہوں کہ ایک
سیاہ فام بوڑھا زمین پر نیم دراز ہے اور ایک
نہایت لاغر لڑکی کو جس کی عمر تقریباً آٹھ سال
ہوگی اوس کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف گھسیٹتے ہوئے
پیٹتا جا رہا ہے اور ہر ایک زد کے ساتھ لرزتی
ہوئی آواز میں کہہ رہا ہے "لے اپنی بھوک اس سے
مٹا..... دیکھ یہ کیسی اچھی روٹی ہے....
.... تیرا پیٹ بھر جائیگا......" پھر
یکایک اوس نے لڑکی کا ہاتھ چھوڑ دیا وہ کچھ
اس انداز سے کمزور آواز میں روتی ہوئی سر کے

بل زمین پر اوندھی گر پڑی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا
کہ اوس نے بھی اپنی حالت کا اندازہ کر لیا ہے
اب بوڑھا بالکل چت لیٹ گیا اور دونوں ہاتھ
زمین پر پھیلا دیئے۔ اوس کا دم زور زور سے
پھولنے لگا اور منھ سے کچھ بے معنی سے الفاظ
نکل رہے تھے میں ان کو سمجھنے سے قاصر تھا دفعتہً
میں نے ایسا محسوس کیا کہ یہ منظر میرے بھیانک
تصورات سے ملتا جلتا ہے جنھیں میں ڈرتے
ڈرتے کبھی کبھی اپنی آنکھوں میں جگہ دیتا ہوں۔
.... میں ساکت و صامت کھڑا رہا
یک بارگی بوڑھے نے پاس سے ایک ایندھن
کی لکڑی اٹھائی اور اوس سے لڑکی کے سر اور
پشت پر زور زور سے ضربیں لگانی شروع
کیں۔ اور پہلے کی طرح بڑبڑانے لگا۔ "اب تو
روٹی روٹی نہ کہے گی۔ ..... اب راتوں کو
چین کی نیند سوئیگی۔ ..... ہائے میں بیمار
کمزور ......" لڑکی بے تابانہ چلا اٹھی "بابا
.... بابا نہ مارو بابا" اوس کے لب کانپنے
لگے۔ چہرے کی رنگت سیاہ پڑ گئی مگر بوڑھے
نے اپنی زد و کوب جاری رکھی۔ یہاں تک کہ اوس
کی پشت زخمی ہوگئی اور خون بہنے لگا اب بوڑھا
فوراً ہی اوٹھ بیٹھا اور اس کو اپنے سینہ سے چمٹا
لیا۔ اس پر ایک ہیجانی کیفیت طاری ہوگئی۔

وہ مضطربانہ کہنے لگا۔ "آہ ..... خون!!
تیرے کہاں زخم آیا ..... میری بچی ..... نہ نہ
.... ہاں بیٹیا تو بھوک سے ضد کر رہی تھی
.... نہیں نہیں ..... (خالی ہاتھ دکھلاتے
ہوئے) لے بیٹیا روٹی لے ......" لڑکی
اوس کے ہاتھ پر نظریں جمائے اوس کی گود میں
بیہوش ہوگئی۔ رونے کا شور یکایک موقوف
ہوگیا اوس کی آنکھیں بند ہوگئیں بوڑھا از خود
رفتگی کے عالم میں لڑکی کو اپنے ہاتھوں پر سنبھالے
اوٹھ کھڑا ہوا۔ اوس کی گردن ڈھل گئی سر کے
بال برگد کی خارجی جڑوں کی طرح زمین کی طرف
لٹکنے لگے میں دو قدم آگے بڑھا یقیناً بوڑھے نے
مجھے دیکھ لیا مگر میری کچھ بھی پروا کئے بغیر وہ خون
کے بند کرنے کی تدبیریں کرنے لگا میں چاہتا تھا
کہ اوس کی کچھ مدد کروں مگر اوس نے فوراً کٹیا
کے ایک گوشہ سے کپڑے کی ایک میلی دھجی نکالی
اور بڑی خود اعتمادی کے ساتھ اوس کو زخم پر رکھ کر
جلدی جلدی دابنا شروع کیا ایسا معلوم ہوتا
تھا کہ اس وقت وہ اپنی ہی تدبیروں کو بڑی کارگر
سمجھ رہا ہے اور لڑکی کے مزاج سے بخوبی واقف ہے
یہ دیکھ کر میں نے محسوس کیا کہ میں لڑکی کی کچھ
چارہ گری نہیں کر سکتا۔ پایانِ کار میں نے دریافت
کیا "آخر یہ کیا ہوا ....؟" اس سوال کے

کرتے ہی وہ بہ ہزار مسرت کٹیا سے باہر نکل پڑا۔ اور مجھ سے نہایت سادگی کے ساتھ باتیں کرنے لگا جیسے وہ مجھ سے پیشتر سے آشنا تھا اوس کے لہجہ میں ایک عجیب معصومیت تھی۔ بیہوش لڑکی کو میرے نزدیک کرتے ہوئے کہا ”بیٹا میرے ساتھ یہ بھی اکثر بھوکی رہ جاتی ہے اور راتوں کو جگا کر سب سے مجھے سخت حیران کرتی ہے ..... میں بڑا اس سے تنگ ہوں بیٹا ..... بڑا تنگ ہوں .....“ بس وہ آگے اور کچھ نہ کہہ سکا آواز گریہ آلود ہو گئی حلق بند ہو گیا اور ہونٹ تیزی سے کانپنے لگے اور چند لمحوں کے لئے اپنی گردن میں ذرا سا خم دے کر وہ مجھے دیکھتا رہا۔ اس کی سرخ آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا رہے تھے اور اون کی شورش میں محسوس کر رہا تھا، میں وہاں سے بھاگ نکلا۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ میں دنیا کی بڑی سے بڑی بات سمجھ سکتا ہوں وہ رات عجیب حالت میں گذر گئی۔ جب صبح میں اپنے بستر سے اٹھا مجھ میں ایک استغناء تھا۔ سرمدی ایک اخوت تھی ابدی۔

جب ہمارے دوست کی کہانی ختم ہو گئی تو وہ یکایک خاموش ہو گیا اور دور افق پر اپنی نظریں جما دیں۔ ہم ایک دوسرے کو تکنے لگے میں نے ایسا محسوس کیا کہ ہم سب آپس میں ایک ہیں میرے دل میں ایک تمنا بیتاب ہونے لگی کہ ان سب سے ایک سچے خلوص کے ساتھ ہم آغوش ہو جاؤں۔ آہ وہ لمحات آج تک نہیں بھولتے۔

غزل

جناب خواجہ فیاض الدین صاحب مہر

تم سے اچھا کوئی حسیں نہ سہی ۔ نہ سہی تم سا نازنیں نہ سہی

سر کسی آستاں پہ ہے دن رات ۔ نہیں سجدہ میں گر جبیں نہ سہی

دل خدا نے غنی دیا مجھ کو ۔ زر و مال و حشم نہیں نہ سہی

کیوں نہ کھالوں جو دے دیا ہے کرم ۔ زہر تو ہو گا انگبیں نہ سہی

دل میں آنکھوں میں آ کے رہتے ہیں ۔ نہیں آتے اگر کہیں نہ سہی

بس اُس کی گلی میں مر مٹنا ۔ نہیں جنت کی گر زمیں نہ سہی

مہر کی لاج رکھئے۔ اے آغا

ہے غلام آپ کا کمینہ سہی

تاریخ دکن میں سر سالار جنگ اول کی شخصیت ایک نمایاں امتیاز رکھتی ہے۔ تدبر اور تفکر کے سوا وہ فارسی کے نہایت اچھے ادیب تھے۔ جن کی پُر مغز تجویزیں اور پُر لطف تحریریں حیدر آبادیوں کے حافظہ میں آج تک محفوظ ہیں۔

۱۔ کہتے ہیں کہ دفتر پیشی کے ایک نئے امیدوار نے مُبیضہ میں لفظ "نوع" کو "نو" لکھا جب یہ مبیضہ ملاحظہ میں پیش ہوا تو آپ نے تجویز فرمائی۔ "امیدوار تو لفظ نوع را "نو" نوشتہ "عین" خطا کرد۔"

۲۔ کسی عہدہ دار کا مقدمہ رشوت ستانی زیر تحقیقات تھا انہوں نے اپنی براءت میں نواب صاحب موصوف کی خدمت میں ایک درخواست پیش کی اور آخر میں لکھا "خدا پنج انگشت یکساں نہ کرد" جب درخواست نظر سے گذری تو نواب نے لکھا "بلے لیکن بوقت لقمہ خوردن پنج انگشت ہمساں یکسان است"

۳۔ قصبہ ٹیکمال میں بعض افراد بلحاظ علم و فضل قابل احترام تھے جن کی نسبت نواب صاحب لکھتے ہیں "دریں قحط الرجال اینقدر مردم باکمال از یک قصبہ ٹیکمال بہم رسانیدن موجب خوشنودئی کمال است"

۴۔ منشی محمد حبیب اللہ ذکا جو دربار سالار جنگ کے شاعر تھے اور ہمیشہ پیشی میں رہا کرتے تھے۔ جن کے نسبت غالب نے لکھا ہے کہ ان کے کلام کو معرض اصلاح میں بنظر دشمن دیکھا کرتا ہوں اُردوئے معلی کے پڑھنے والے وہ خطوط پڑھ چکے ہیں جو غالب نے ان کے نام لکھے ہیں۔ ذکا نے قصیدہ ۔ غزل ۔ رباعی ۔ تاریخ غرض اصناف شاعری میں ہر صنف پر طبع آزمائی کی ہے۔ جن کی ہجو بذلہ سنجی لطائف اور ظرائف کی داستانیں لوگوں کو اب بھی یاد ہیں۔

۵۔ ایک مرتبہ اسی دربار کے ایک مولوی صاحب نے حج و زیارت کے لئے رخصت طلب کی، جنھیں مع تنخواہ کے چھ مہینے کی رخصت دیدی گئی۔ مولوی صاحب چھ مہینے بعد واپس ہوئے ذکا کو نہ جانے کس طرح اس کا علم ہوا تھا کہ یہ بجائے حج کرنے کے شادی کرکے واپس آئے ہیں جب واپسی کی نذر پیش کی نواب سالار جنگ نے فرمایا کیا مولوی صاحب حج و زیارت سے مشرف ہو آئے؟ اس سے پہلے کہ وہ کچھ عرض کرتے ذکا صاحب نے یہ شعر فی البدیہہ سنادیا،

طاعت کی کس کو سوجھتی ہے حظ نفس ہیں | کعبہ کو کون جائے جو گھر میں حرم رہے

مولوی صاحب شرمندہ اور نواب صاحب متبسم ہوئے۔

۶- سالار جنگ ' عید کے دربار میں نذر کیلئے تشریف لیجا رہے ہیں کسی بدخواہ نے تفنچہ سے فیر کیا یہ بال بال بچ گئے اور ذکا نے ذیل کی تاریخ لکھی:-

قصد ہلاک کرکے کسی بدمعاش نے | تا کا ہی تھا کہ آڑے ہوئے رحمت اللہ
چوکا نشانہ چوکے نہ کیوں خود تفنچہ سے | نکلی تو یہ صدا کہ خدایا تری پناہ
اس جملہ دعائیہ کو گر کریں شمار | تاریخ بھی نکلتی ہے البتہ حسب خواہ

۷- لنگر کوٹ بارہ دری کی تعمیر ختم ہو چکی ہے نواب سالار جنگ معائنہ کے لئے تشریف لاتے ہیں ذکا ایک مثنوی پیش کرتے ہیں، چند اشعار ملاحظہ ہوں:-

دیکھے کشمیر بوٹے گریاں کے | منھ کو آنچل سے شال کے ڈھانکے
تازگی کا کمال دیکھ لیا | ہر شجر کو نہال دیکھ لیا
قد بالا جو نارجیل کا ہے | سو عصا دست جبرئیل کا ہے
گر ہوا یاں کے دشت میں چلتی | شاخ آہو بھی پھولتی پھلتی
چشم نرگس کا یہ اشارا ہے | قابل دید بس یہی جا ہے
سبزہ اس طرح لہلہاتا ہے | کہ زمرد بھی زہر کھاتا ہے
یوں تو سبزہ بھی جا بجا اوگے | موتی بو دیں تو موتیا اوگے
بنتے اس خاک سے اگر آدم | خضر ہو جاتے سر بسر آدم
حسن اس باغ کا قیامت ہے | خار تک بھی مژہ کی صورت ہے
رنگ تو کیا اڑا سکے گل کا | بال ٹیڑھا کرے نہ سنبل کا!
نہر میں اس کے ہاتھ جو ڈالے | نام کوثر سے منھ کو دھو ڈالے
جس نے شفافی دیکھی پانی کی | پانی پی پی کے مدح خوانی کی
مجھ کو منھ دیکھی بات آتی نہیں | آئینہ میں بھی یہ صفائی نہیں
باغبانوں کی اچھی قسمت ہے | بیٹھے جی ان کو سیر جنت ہے

پتے کپڑکے تو یہ صدا نکلے وہ صدا کیا ہے یہ دعا نکلے
کہ رہے اوس کی مرتبت عالی جس نے اس باغ کی بنا ڈالی

کہتے ہیں کہ نواب صاحب نے خلعت وغیرہ سے سرفراز کیا۔

۸ - حضرت غفران مکان علیہ الرحمۃ کے عہد حکومت میں پہلی مرتبہ نل اور ٹیلی فون آیا - اور کچھ دنوں گھوڑوں کی ٹرام بھی چلی - نل جب ہر طرف تقسیم ہو چکا تو سررشتہ آبرسانی نے ٹکس عائد کیا اس وقت کے تمام مرشد زادوں نے احتجاجاً مکہ مسجد میں اپنا بستر لگا دیا کہ پانی جیسے کار ثواب کا معاوضہ طلب کیا جا رہا ہے - گھروں سے کھانے آتے اور یہ سب رات تمام مکہ مسجد میں بسر کرتے - شاید ہفتہ عشرہ یہ سلسلہ جاری رہا - جب غفران مکان کو اس کی اطلاع ملی تو آپ نے ٹکس معاف فرما دیا - اس زمانہ کے ایک شاعر عبدالغفار بلیغ نے سالگرہ غفران مکاں کے موقع پر برکات آصفی کا ایک قصیدہ میں تذکرہ کیا ہے جس کے چند اشعار یہ ہیں -

جب آیا شہر میں نل اوس دم اہل تعمیرات کئے یہ بحث کہ ہم ٹکس عام لیتے ہیں
سنا جو حضرت آصف نے یہ کیا ارشاد پلا کے پانی کو نی واہ دام لیتے ہیں
اگر ہو قرب تو کافی ہے ہم کو ٹیلیفون اگر ہو بعد تو ٹیلی گرام لیتے ہیں
ہے رہروں کو بھی آرام دیکھو خاص و عام نہ ہوے جو شکہ تو فوراً ٹرام لیتے ہیں
بلیغ حضرت آصف ہی کے بدولت ہے مزے جہاں کے جو ہم صبح و شام لیتے ہیں

۹ - سنا کہ عبدالرزاق آصف نواز الملک معتمد صرف خاص مبارک اپنے عہد کے مشہور معتمدین سے تھے اسی زمانہ میں صرف خاص - پائیگاہ - جاگیرات - کے پولیس کا تعلق ناظم کوتوالی اصلاح کے تفویض کر دیا گیا - چنانچہ جب حدود صرف خاص میں ایک منتظم پولیس کی جائداد خالی ہوئی تو معتمد صاحب نے عبدالکریم نامی کی سفارش کی - ناظم کوتوالی اضلاع نے جواب لکھا کہ عبدالکریم ناکارہ ہیں معتمد صاحب کو اپنے احکامات کے تعمیل کا خاص خیال رہتا تھا - جب یہ انکاری جواب آپ کی نظر سے گذرا تو غصہ آگیا فوراً جواب دیا :- عبدالکریم کارہ باشد - ناکارہ باشد - ہرچہ باشد باشد - معمور کردہ باشد - اس حکم کی آخر تعمیل کرتے ہی بنی -

۱۰ - اسی زمانہ میں ایک ملازم سرکار کے دو مہینے کی تنخواہ نہ جانے کس سلسلہ میں برآمد ہو گئی

جس نے اجرائی تنخواہ کے لئے درخواست پیش کی جس کا ایک جملہ یہ تھا "تنخواہ دو ماہ بندۂ بر سرکار سوار شدہ، غالباً یہ ترجمہ ہے کہ فدوی کے دو مہینہ کی تنخواہ سرکار پر چڑھی ہوئی ہے۔

۱۱۔ بعض حضرات کو عادت ہے کہ وہ تحریر میں نقطے نہیں لگاتے چنانچہ ایک تحریر تھی " سہ اکٹوبر سہ حال" حالانکہ غور سے پڑھئے تو صاف سمجھ میں آجائیگا کہ " سہ اکٹوبر سنہ حال" ہے مگر ایک کارفرمانے اس کو پڑھا " سہ کبوتر سہ جال"

۱۱۔ عرب کا ایک دردناک واقعہ ان اشعار سے ظاہر ہوتا ہے کہ عرب کے شاعر اصمعی اور نوجوان عاشق سے کیا سوال جواب ہوئے۔

چلا جو اصمعی خوش بیاں برائے سیر ــــ تو ایک دشت کے پتھر پہ لکھا دیکھا

" مریض عشق جواں سال کیا کرے کوئی ــــ بتائیں مجھ کو بھی وہ جو ہوئے ہیں خود شیدا"

نگاہ غور سے دیکھے یہ اصمعی نے حروف ــــ وہیں پہ درد دلی کا علاج یوں لکھا

" حضور قلب سے ہر کام کو کئے جائے ــــ خلوص دل ہو مگر راز دل نہ ہو افشا"

گذر جو بار دگر اس طرف ہوا اک دن ــــ تو اپنے شعر کے نیچے لکھا ہوا پایا

" خلوص دل ہو کہاں سے جو عشق قاتل ہو ــــ پگھل پگھل کے بہے اشک سے جو دل اپنا"

رہا وہ عالم حیرت میں پہلے تو خاموش ــــ اسی کے تحت میں پھر شعر یہ کیا انشا

" وہ جو کہ راز محبت چھپا نہ سکتا ہو ــــ سوائے موت کے کچھ بھی نہیں ہے اس کی دوا"

گیا جو بعد کو پھر اصمعی ادھر اک دن ــــ عجیب منظر عبرت فزا نظر آیا،

ہے خاک کو خون میں پڑا ایک پیکر بیجان ــــ ہجوم یاس و الم نعش بے کفن پر تھا

لکھے ہوئے تھے یہ دو شعر سنگ بالیں پر ــــ کہ جن کو دیکھ کے دل اصمعی کا بھر آیا

" کسی کی بات کو یوں سُن کے جان دی میں نے ــــ سلام پہنچے اُدھر سے جس نے وصل سے روکا

مبارک ان کو مسرت جو دہر میں خوش ہیں ــــ مبارک ایک ستم کش کو داغ الفت کا"

غرض ایسی بیسیوں دلچسپ حقائق موجود ہیں ورنہ بیڑ کو بیڑ، تیتر کو تیتر، کنٹر کو کنٹر پڑھنے والوں کی کمی نہیں ہے۔ کسی فرصت میں اور بھی ایسے دلچسپ حقائق پیش کئے جائیں گے۔

کردار

زینت ساجدہ (حیدرآباد)

"سونے کو گھس کر دیکھو آدمی کو بس کر۔" بہت پرانا محاورہ ہے۔ ہمارے بزرگوں نے کھرے کھوٹے کی پہچان کا نہایت آسان طریقہ تبلا دیا ہے لیکن آج کل کوئی بھی اس پر عمل نہیں کرتا۔ ہر ایک سمجھتا ہے کہ خدا نے اسے بصارت کے ساتھ ساتھ بصیرت سے بھی نوازا ہے۔ چنانچہ ایک نظر کسی کو دیکھا اور جھٹ اس کے "کردار" کے متعلق فیصلہ سنا دیا۔ کسی بھی بات پر اپنی رائے کا فوری اظہار اور بات ہے، اور رائے کا صائب ہونا کچھ اور۔

لفظ "کردار" کو اس کے وسیع اور صحیح معنوں میں بہت کم لوگ سمجھتے ہیں۔ لیکن اس کا استعمال اتنا عام ہوتا جا رہا ہے کہ ڈر ہے کہیں وہ اپنی اصلیت کھو نہ بیٹھے۔ اکثر تو دیکھا گیا ہے کہ برسوں ساتھ رہتے گزر گئے ہیں۔ لیکن ہم کسی کو پہچان نہ سکے۔ بعض لوگوں کو اپنے آپ پر قابو حاصل ہوتا ہے وہ اپنے آپ کو ایک خول میں محفوظ کر لیتے ہیں لاکھ کوشش کیجئے نگاہیں ظاہری خول سے ٹکرا کر واپس آ جائیں گی۔ دل کے گوشوں تک پہنچنا دور رہا۔ مگر بعض اتفاقات بیشک ایسے ہوتے ہیں کہ خول کا دھوکہ ٹوٹ جاتا ہے اور آدمی اپنی اصلیت کا اظہار کر دیتا ہے۔ لیکن یہ تو بڑی کٹھن آزمائش کی بات ہے۔ رنگین دروازوں کو دیکھتے ہیں اور ہم اس کے رنگ سے اتنے متاثر ہوتے ہیں کہ لکڑی کی طرف خیال ہی نہیں جاتا۔ اور اگر جاتا بھی ہے تو کیا کیا جائے رنگ کی تہہ سب کچھ چھپائے ہوئے ہے۔ کبھی پتھر یا کسی اور سخت چوٹ کی وجہ روغن غائب ہو جاتا ہے تب معلوم ہوتا ہے کہ اس خوش رنگ نقاب کے پیچھے کیا ہے۔ یہ ہماری فطری کمزوری ہے کہ ہم لوگ انہیں باتوں کو معیوب سمجھتے ہیں جو ہم میں نہ ہوں کسی کی اگر آواز میں سوز تان میں اثر ہے اور ہم کو گلا نہیں پھٹا بانس ملا ہے تو ہم ضرور اعتراض کریں گے کہ بھئی "گانا اور گلا بازی شریفوں کا کام ہے کیا؟" اگر ہمیں سینما دیکھنے کی باوجود کوشش و خوشامد کے اجازت نہیں ملتی تو ہم فوراً سینما دیکھنے والوں پر اعتراض کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ اور اس طرح ہم اپنی فطری جراحتوں کا اندمال چاہتے ہیں۔ حالانکہ ہم خود کو بیوقوف بناتے ہیں

آج کل "کردار" کا لفظ جو سنا گیا تو بس لگے ہاتھوں سب اس پر بحث کرنے جنہیں اس کا

حق پہنچتا ہے وہ بھی۔ جنھیں حق نہیں پہنچتا وہ بھی۔ غضب تو یہ کہ اپنے کردار کو معیار سمجھ کر لوگوں کو بُرا کہا جاتا ہے۔ ا کے پاس کردار کا اندازہ کرنا بہت آسان ہے۔ مثلاً انھوں نے سُن لیا کہ انیس "چترلیکھا" کو فن کاری کا عمدہ نمونہ قرار دیتی ہے۔ فوراً ا نے فتویٰ دیا کہ انیس کا کردار نہایت گرا پڑا ہے۔ کیونکہ چترلیکھا جیسی فحش تصویر انہیں پسند ہے۔ ب کے نزدیک کردار کا اندازہ پسندیدہ اشعار سے لگایا جاسکتا ہے۔ مثلاً انھوں نے کہیں نکہت کو گنگناتے سن لیا کہ

نہ ہاتھوں میں طاقت نہ پاؤں میں جنبش
جو دامن پکڑ کھینچوں اس دلربا کا

بس اس دن سے انھوں نے یہ اندیشہ ہر کس و ناکس پر ظاہر کرنا شروع کر دیا کہ لڑکی کا کردار پست ہوتا جا رہا ہے۔ ج نے ایک دفعہ رضیہ کو "امراؤ جان ادا" پڑھتے دیکھ لیا تھا پھر ایک دفعہ "لندن کی ایک رات" کی تعریف بھی سنی۔ اور انھوں نے ان کی اماں سے مل کر کہدیا کہ اس لڑکی کی جلد از جلد شادی کر دی جائے۔ کردار کی خرابی کا علاج کیا خوب سوچا تھا۔

ایسی ذرا ذرا سی باتوں پر بلا کسی تحقیق کے "کردار" بننے اور بگڑنے لگے تو پھر بہتر یہی ہے کہ ڈھنڈورا پٹوا دیا جائے کہ "باموقع بھی مت ہنسو کہ چھچھورا کردار والی کہلاؤ گی۔ دوا سے منہ کڑوا بھی ہو تو پان نہ کھاؤ کہ منہ پر ٹھیکرے ٹوٹیں گے۔ شعر خواہ تصوف کا ہی کیوں نہ ہو اگر 'یار' اور 'عشق' جیسے الفاظ ہوں تو نہ پڑھو کہ تمہارا کردار رکیک بن جائے گا۔ اور یہ نہ کرو کہ تمہارا کردار بگڑ جائے گا اور وہ نہ کرو کہ تم شریف نہ باقی رہو گی۔ یعنی سرے سے زندہ رہنا ہی ترک کردو۔"

خیر یہ تو رہے لوگوں کے کردار کے متعلق خیالات۔ اب ذرا اعتراض کرنے والوں کو بھی دیکھئے۔ د نے سن لیا کہ نیا ادب نہایت فحش ہے اور اس کے پڑھنے والے دنیا بھر کے مردود۔ اور یہ کہ نئے ادب کے علمبردار صرف دو ہیں عصمت چغتائی اور سعادت حسن منٹو۔ 'بو' افسانہ کی بڑی برائی سنی تھی۔ اس لئے بڑی مشکل سے 'ادب لطیف' حاصل کیا۔ اور افسانہ پڑھا۔ بس ان کے نزدیک سارا نیا ادب بدبو ہو گیا اور اس کے پڑھنے والے بھنگی۔ آپ نے وعظ بیان کرنا شروع کئے۔ کسی من چلے نے سوال کیا۔ آپ نے اسی 'بو' والے پرچہ میں 'ان داتا' بھی پڑھا تھا۔ جواب ملا۔ پڑھنے کی کیا ضرورت ہے بس اندازہ ہو گیا کہ سب فحش

مضمون تھے۔

...ق ہمیشہ نوجوانوں کو منع کیا کرتے کہ "مست
قلندر" "بیسویں صدی" اور "ساقی" نہ پڑھیں۔
"عصمت" "جامعہ" وغیرہ کا مطالعہ کافی ہے وجہ
پوچھی گئی تو معلوم ہوا کہ یہ رسائل فحش ہوتے ہیں
اور کوئی شریف ان کا پڑھنا گوارا نہ کرے گا۔
تحقیق کیگئی تو پتہ چلا کہ آپ باقاعدہ چھپ کر
اس کا مطالعہ کرتے ہیں۔ اور خصوصاً فحش اشتہاروں
کا! حیرت سی حیرت ہوتی ہے۔ جب ہم اپنے
راہنماؤں کو اتنا گمراہ پاتے ہیں۔ نوجوانوں سے
زیادہ کسی کو رہبری کی ضرورت نہیں ہوتی لیکن
اگر راہنما ایسے ملیں تو آخر کیا کیا جائے "کردار"
کو اگر کچھ دنوں ہم ان کرم فرماؤں کی شفقت کے
حوالے کر دیں تو نہ معلوم وہ آئندہ اس کا معیار
کیا مقرر کریں۔ ہماری زندگی میں ہزاروں عیوب
ہیں، ہماری روح داغدار ہو رہی ہے ہماری
آنکھیں صداقت کا نور کھو رہی ہیں۔ ہمارے جسم
میں ناسور زیادہ خطرناک ہوتے جارہے ہیں
انہیں کا علاج سوچنا اور کرنا "کردار" کا بنانا ہے
ورنہ اگر کوئی اس صداقت کا اظہار کرے تو اسے
گمراہ سمجھنا عقل وعلم کے لئے ماتم کا موقع ہے۔
ہم دوسروں کی جھونپڑی جلے آگ تاپنے کو جمع جاتے
ہیں۔ دوسروں کا خون بہے اور ہم ہولی کھیلنا
چاہتے ہیں۔ دوسروں کی ہڈیاں ٹوٹیں اور ہم
اس کی کھاد بناتے ہیں۔ ہم ایک دوسرے کو ہر
ممکن طریقہ سے دھوکا دیتے ہیں۔ ہم موجودہ قوانین
سے مجبور ہوکر جھوٹ بولتے ہیں اور بالکل
نہیں شرماتے، ہم دوسرے کو برا بناکر خود بھلے
بن جاتے ہیں۔ ہم کسی کے متعلق بھی سنی سنائی
برائی پر فوراً ایمان لے آتے ہیں۔ اور دیکھی دکھائی
نیکی پر جان بوجھ کر آنکھیں بند کرلیتے ہیں۔ ہم
اپنے سے کمینہ مگر اونچے مرتبہ والوں کو "جی حضور"
کہتے ہیں۔ اور شریف مگر اپنے سے کم رتبہ والوں
سے ایسا سلوک کرتے ہیں۔ جیسے ان کے باپ دادا
ہمارے جد امجد کے زرخرید تھے۔ ہم "بڑے لوگوں"
کے ساتھ تو بس دنیا بھر کے مہذب، متمدن اور
اخلاق والے بن جاتے ہیں۔ بات بات پر سرمایہ
داری کو کوستے ہیں۔ غرباء پر رحم دکھاتے ہیں۔
لیکن جب ہم خود بڑے ہوئے ہیں تو ہمارا سلوک
ہمارے پہلے فعل کی تکذیب کرتا ہے۔ مگر پھر بھی
کیا وجہ ہے کہ لوگ ان کے کردار کو برا نہیں سمجھتے
انگلی نہیں اٹھاتے۔ آنکھیں نہیں دکھاتے۔ اگر یہ
افعال کردار کو بنانے بگاڑنے والے نہیں تو ہم فوراً
سے کیوں الجھتے ہیں۔ آئندہ سے کوئی لفظ "کردار"
استعمال کرے تو آپ اس سے معنی ضرور پوچھ
لیں ؏

گاہے گاہے باز خواں

۱۔ منصور پچاس سال تک اسرار پوشی رہے، پھر آپ نے "انا الحق" کا نعرہ لگا کر اپنا راز فاش کر دیا۔ اہل تعقلید نے فتویٰ مانگا۔ تین سو ستر عالموں نے کفر کا فتویٰ لگا دیا۔ بغداد میں ایک سنسنی پھیل گئی۔ جب خلیفہ کو اس امر کی اطلاع ہوئی۔ اگرچہ خلیفہ منصور کا دوست تھا۔ کیونکہ اس کی کئی تصنیفات پڑھ چکا تھا لیکن عوام اور جہلا کے خوف سے اس نے منصور کے قید کئے جانے کا حکم دیدیا۔ جب منصور قید خانے میں لائے گئے۔ جیل میں اس وقت چار سو قیدی تھے۔ منصور نے آتے ہی اون سے کہا کہ تم اپنے اپنے گھر چلے جاؤ۔ قیدی بولے۔ ہم لوگ بھاری بھاری زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں کیسے جا سکتے ہیں۔ منصور نے ان کے قریب آ کر اپنا ہاتھ ہلایا، قیدیوں کی بیڑیاں کٹ کر گر گئیں۔ اس وقت قیدیوں نے عرض کی قید خانے کے دروازے بند ہیں ہم باہر نہیں نکل سکتے منصور نے ایک اشارا کیا اور دیوار میں چار سو رخنے نمودار ہو گئے تمام قیدی اٹھ باہر نکل گئے قید خانہ کا مہتمم ان کے پیروں پر گر پڑا۔ منصور نے اس کو بھی چلے جانے کا حکم دیا۔ وقفہ جیل جانے کے بعد منصور مناجات الٰہی میں مشغول ہو گئے۔

حضرت شبلیؒ حضرت جنید بغدادیؒ کے پاس گئے اور منصور کے قید ہونے کی اطلاع دی۔ چند اپنے شاگردوں کو لے کر قید خانے پہنچے وہاں جا کر دیکھا کہ مخلوق کثرت سے جمع ہو رہی ہے اجازت لے کر اندر گئے اور منصور کو ملامت کرنے لگے کہ:۔ تم نے یہ کیا دیوانگی اختیار کی ہے جو بات تم کہتے ہو وہ تمہارے پیشوا رسول اللہؐ نے بھی نہیں کہی۔ "انا الحق" کہنا کفر ہے

منصور نے جواب دیا، تم ان اسرار سے بیخبر ہو، رسول اللہؐ نے "من رآنی" فرمایا "لی مع اللہ" کہا خود خدائے پاک نے "نحن اقرب" فرمایا، تم مبتلائے تعقلید ہو، واصلین کے مرتبے کیا جانو۔ اس پر ملاقات ختم ہو گئی اور جنید باہر آ گئے لوگوں نے ان سے فتویٰ طلب کیا، انہوں نے کہا میں ظاہر پر حکم دیتا ہوں باطن سے واقف نہیں۔

بعد ازاں شبلی منصور کے پاس گئے، کہنے لگے، اے شیخ تو نے اپنا راز کیوں فاش کر دیا۔ اگر سر کی خیر چاہتے ہو تو سر کا ترک کہو۔ جواب میں منصور نے کہا۔ میں منصور نہیں ہوں بلکہ

من خدا ایم - من خدا ایم من خدا
فارغم از کبر و کین و از ہوا

تاکہ بقائے حق میں باقی رہوں مُصطفیٰؐ میرے پیشوا ہیں اور راہ یقین کے رہنما ہیں لیکن تم ان غوغائیوں سے میرے لئے ایک روز کی مہلت مانگ لو، کیونکہ میرا ایک مخلص دوست جس کا نام شیخ کبیر (عبد اللہ خفیف) ہے، کل تک یہاں پہنچنے والا ہے اور مجھ کو اس سے ایک ضروری راز کہنا ہے، اس کے بعد میں دار کیلئے تیار ہوں۔ دوسرے دن شیخ کبیر آگئے اور سیدھے منصور کے پاس گئے۔ ملامت کے لہجہ میں کہنے لگے "اے توحید پرست! تونے سرّ حق کو کیوں فاش کیا، تو پچاس سال صاحب اسرار رہا، اب کیا ہوگیا کہ اس قدر بیخود ہوگیا" منصور نے کہا "تم کو معلوم ہے کہ بحر معنی بے نہایت ہے اور انا الحق تو اس کی ایک ادنیٰ سی موج ہے تم سے اگر لوگ فتویٰ مانگیں تو دیدینا" شیخ کبیر نے جواب دیا "میں فتویٰ نہیں دیسکتا"

شیخ گفتا آں چہ گفتی نے رواست
من ہمی دانم کہ ذات تو خداست
چوں دہم فتویٰ ز جہل وارگاں
من عیاں دیدم خدا را ایں زماں

منصور نے کہا "خیر میرے کہنے سے دیدینا"

شیخ کبیر اس کے بعد چلے آئے، عوام نے فتویٰ طلب کیا۔ شیخ نے کہا۔ منصور نے کہلا بھیجا ہے کہ میں واجب القتل ہوں، مگر میری رائے ہے کہ وہ اہل ظاہر کے نزدیک واجب القتل ہے مگر باطن کے حال سے میں واقف نہیں۔ اس کے بعد سب لوگ جمع ہو گئے۔ منصور آیا اور سولی پر چڑھ گیا۔ انا الحق کے نعرے لگانے لگا۔ حالت یہ ہوئی کہ سنگ وخشت، دار اور رشتہ تک سے انا الحق کی آوازیں آنے لگیں۔ ایک ظالم نے آکر اس کا ہاتھ کاٹ ڈالا۔ منصور نے اپنا لہو بھرا ہاتھ چہرے پر مل لیا۔ شبلی نے دریافت کیا کہ تم نے ہاتھ منھ پر کیوں ملا؟ اس نے جواب دیا میں نماز عشق ادا کرنا چاہتا ہوں اور یہ اوس کا وضو ہے۔ شبلی نے پھر سوال کیا کہ تصوف کا کوئی رمز بیان کرو۔ اس نے کہا، اپنے آپ کو سب سے کمتر دیکھنا۔ ایک مرتبہ اور پوچھا کہ طریق عشق کا پتہ دو۔ منصور کا جواب تھا ؎

گفت عشق ایں جا بود گردن زدن
بعد از انش آتش اندر سوختن

ان الفاظ کے ختم ہونے پر اس کا سر کاٹ دیا گیا جب سر کٹ کر گرا۔ اوس سے انا الحق کی آواز برابر آرہی تھی۔ تب منصور کے جسم کو جلا دیا اور ہوا اُس کی خاک اڑا کر پانی میں لیگئی۔

۲ - شیخ لقمان سرخسی اپنی پوستین میں پیوند لگا رہے تھے کہ شیخ ابوسعید ابوالخیر (جو ابھی طالب علم تھے) آ نکلے - لقمان نے کچھ نجاست ان پر پھینک دی (لقمان عقلائے مجانین سے تھے) شیخ ابوسعید نے خوشی سے اس کو برداشت کیا - اس پر لقمان نے کہا - لڑکے میں تجھے اس پوستین کے ساتھ سی دوں ابوسعید نے جواب دیا آپ کی خوشی - پھر کچھ ٹانکے بھر کر بولے - لے ابوسعید میں نے تجھے سی دیا ہے اب لقمان اٹھے اور ابوسعید کا ہاتھ پکڑ کر لے چلے راستہ میں پیر ابوالفضل حسن ملے کہنے لگے، اے ابوسعید تمہارا راستہ ادہر نہیں ہے اس پر لقمان ابوسعید کا ہاتھ ان کے ہاتھ میں دے کر چلتے بنے -

۳ - شیخ جنید رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں میں نے اپنے رب کو مدینہ کی گلیوں میں پھرتے دیکھا ہے کسی نے پوچھا وہ کیوں کر، فرمایا میں مدینہ کے بازار میں جا رہا تھا کہ ایک مسکین مجھ کو ملا اس کی صحبت میں رہا اور سمجھ گیا کہ خدا اس کے ساتھ ہے کیونکہ خدا فرماتا ہے میں شکستہ دلوں کے پاس ہوں محبت کی شرط یہ ہے کہ صحبت میں لطف نہ ڈھونڈے کیونکہ آفتیں اسی سے پیدا ہوتی ہیں -

غزل

جناب نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیز

نالوں کا شب ہجر اثر دیکھئے کیا ہو
کٹ جائیگی جب رات سحر دیکھئے کیا ہو

معلوم نہیں مجھ کو تو اس جنگ کا انجام
لڑنے کو تو لڑتی ہے نظر دیکھئے کیا ہو

جینے کی تمنا ہے نہ مرنے کا ارادہ
ہوتی ہے یونہیں عمر بسر دیکھئے کیا ہو

دیوانگی عشق کا کھلتا نہیں کچھ حال
دھڑکا ہے یہی آٹھ پہر دیکھئے کیا ہو

ہر وقت انہیں دیکھتی ہے چشم تمنا
ہو جائے اگر دل کو خبر دیکھئے کیا ہو

ہنس ہنس کے مجھے گھور کے باتوں میں لگا کے
وہ لے تو گئے دل کو مگر دیکھئے کیا ہو

کل تک تو رہا حشر کا سامان الہٰی!
پھر آج سر راہ گذر دیکھئے کیا ہو

مجھ پر ہی پڑا کرتی ہیں صیاد کی نظریں
اس چشم عنایت کا اثر دیکھئے کیا ہو

مشکل ہے عزیز اپنے گناہوں کی تلافی
رہتا ہے یہی مجھ کو تو ڈر دیکھئے کیا ہو

غزل

جناب مُسلم

اے کہ ناخواستہ بیروں زحجاب آمدۂ
فرصتت باد کہ غایت بشتاب آمدۂ

تشنہ لب داشت ترا حرص جہاں اے خودکام
بہر یک جرعۂ آبے بسراب آمدۂ

لذت وصل بتاں ہمچوں تب آں نے ہست
غافل از شیب تو در بند شباب آمدۂ

موج یم زار بنالد بہ تگ و تاز حباب
ناز کم کن کہ تو ہم نقش بر آب آمدۂ

روح را کرد احاطہ جسد خاکش تو
بررخ مہر حقیقت چو سحاب آمدۂ

حاصل از آمدنت چیست کہ بے نور چراغ
در شب تیرہ برافگندہ نقاب آمدۂ

تا کنوں خیر نہ سرزد ز تو در دہر خراب
زود لے خواجہ گر از راہ ثواب آمدۂ

تا کجا فخر بریں زہد ریائی واعظ
تو ہم از میکدہ بد مست خراب آمدۂ

سیر عالم کہ نمودی ہمہ رویائے تو بود
چشم بکشا کہ در عالم تو بخواب آمدۂ

مسلما بندۂ ساقی مشو از صدق و صفا
گر بہ میخانہ پئے بادۂ ناب آمدۂ

(۴)

بہ سرپرستی
محترمہ بیگم نواب مہدی یار جنگ بہادر
صدر المہام تعلیمات
شہاب
ناہید

ناہید

جلد ۸ | دے ۱۳۵۴ ف م نومبر ۱۹۴۴ء | نمبر ۲

۱- "تعلیم نسواں" پر منیزہ کاؤس جی نے نہایت سنجیدہ مضمون لکھا ہے۔

۲- "شطرنج کا مہرہ" آنسہ معصومہ پہلی مرتبہ بزم ناہید میں آئی ہیں۔ تحریر میں شگفتگی ہے۔ بقیہ حصہ آئندہ دیکھئے کہ ایک ننھے مہرے نے کس قدر قیامت برپا کردی۔

۳- "جھلکیاں" بلقیس سید احمد کی قلمی عکاسی ہے اور نہایت رنگین الفاظ میں ہر سطر گویا خود ایک جھلکیاں ہے۔

۴- "محبت" بقیہ حصہ ہے گذشتہ فسانہ کا۔ یہ ختم ہو تو جب آپ اندازہ لگا سکیں گی

۵- ناہید کو ہمیشہ اپنے کوتاہ دامن ہونے کا عذر رہے۔ بیک وقت اتنے پھول کا سمیٹنا اس کے لئے مشکل ہی ہے اس لئے آئندہ منتخب کلیاں آیا کریں تو اس کی شگفتگی دلوں کو مسرور کرسکے گی۔

۶- چندہ کے ادا کرنے میں آپ کا تامل اب تو قابل شکوہ ہوگیا ہے۔ دو روپیہ کے لئے صبح شام وعدے تکلیف دہ ہیں۔ باور کیجئے کہ اس کا ادا کرنا اگر آپ کے لئے بارگراں ہے تو ہم تحفتہً پرچہ پیش کرنے کے لئے آمادہ ہیں۔ یا تو چندہ بلا عذر وحیلہ ادا کیجئے یا دفتر کو اپنے ارادہ سے مطلع کیجئے تاکہ تحفتہً پرچہ بھجوایا جائے۔ آپ نہیں جانتیں کہ سامان طباعت کی گرانی ہمارے مشکلات میں کیسی حائل ہے۔ ب

"تعلیم اور عورت"

مس منیرہ بانو کاؤس جی

کائنات عالم میں کوئی شئے اس وقت تک
کامل متصور نہیں ہوتی جب تک کہ اس کے کل اجزا
درجہ کاملیت تک نہ پہنچ گئے ہوں۔ شمع حالانکہ وہ
روشنی کا مبدا ہے لیکن اگر اس میں ذرا سی بھی
خرابی پیدا ہو جائے تو روشنی کا سارا لطف کرکرا
ہو جائے۔ بس یہی حال انسان کا ہے۔ چاہے وہ
کتنا ہی شریف الخاندان دولتمند۔ با اقتدار کیوں نہ
ہو لیکن اگر اس کا کردار بلند اس کے اخلاق اعلیٰ
اور اس کا دماغ علم کے نور سے منور نہ ہو تو وہ
ہرگز مستحق آفرین و تحسین نہیں۔ یہی حال قوموں کا
ہے۔ اس وقت تک کوئی قوم برگزیدہ، ترقی یافتہ
اور اعلیٰ کہلانے جانے کی مستحق نہیں جب تک کہ
اجزائے قوم یعنی افراد قوم۔ اعلیٰ اخلاق، نکھرے
ہوئے کردار اور تعلیم کی بنیادی مقاصد کی اہمیت
سے اچھی طرح واقف ہوں۔

چنانچہ سپیدۂ سحری اور طلوع شمس کی
طرح یہ بات بھی مسلم ہے کہ عورت اور مرد کا باہمی
رشتہ قانون فطرت کی نہ ٹوٹنے والی زنجیروں سے
جکڑا ہوا ہے جس کی بنا پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ
انسان کا قافلہ کسی طرح پھر بھی زندگی کی پُر پیچ
و خم منزلیں مسرت اور اطمینان کے ساتھ اس
وقت تک طے نہیں کر سکتا جب تک کہ یہ دونوں
افراد یعنی مرد اور عورت کی ذہنی اور دماغی قابلیتیں
باہم ترقی نہ کریں۔ ورنہ اگر مرد کا تخیل عرش پر ہے
اور عورت کا زمین کی سطح ہی پر گردش کر رہا ہو
تو نتیجہ اس کا ظاہر ہے کہ نہایت ہی دل شکن
نکلے گا۔

تعلیم کی جتنی ضرورت ایک مرد کو ہے اتنی
ہی بلکہ اس سے زیادہ عورت کو ہے۔ کیونکہ قدرت
نے نسل انسانی کی تربیت کا جوا عورت ہی کے
کندھوں پر رکھ چھوڑا ہے بلکہ دنیا کے بڑے بڑے
مفکرین۔ فلسفی۔ حکیم۔ تربیت ہی کو انسان کی
زندگی میں سب سے زیادہ اہم شئے قرار دیتے
ہیں۔ ایسی صورت میں عورت کی ذمہ داری
کس قدر بڑھ جاتی ہے۔ ماں ہی تو وہ ہستی ہے
کہ قومیں جس کی آغوش میں پرورش پاتیں اور
پروان چڑھتی ہیں۔ پھر بھلا کیسے ایسا کوئی تخیل
جس میں عورت کی تعلیم نے اہمیت کا تصور [illegible]

ہو- قابل تسلیم ہو سکتا ہے۔

تاریخ عالم کے اوراق پر اگر نظر ڈالی جائے تو اس امر کا انکشاف ہوگا کہ جو قومیں عروج اور ترقی کی انتہائیوں پر پہنچی ہیں ان کی سربلندی اور سرفرازی میں عورت کا نمایاں حصہ رہا ہے جس سے قوم اور افراد قوم کے بلند کردار کی تخلیق ہوتی رہی ہے۔ جن قوموں نے عورت کے وقار کو ٹھیس پہنچائی۔ اسے صرف گھر اور گھر ہی کی زینت بنا رکھا۔ انھوں نے اپنے پاؤں پر آپ کلہاڑی ماری۔ جس شاخ پر ان کا نشیمن تھا اسی کو جڑ سے کاٹ پھینکا۔ لیکن جن قوموں نے اس کے معیار کو سمجھا وہ مہذب اور شائستہ کہلائیں۔ ہاں یہ امر مسلمہ ہے کہ تعلیم سے ہرگز ہرگز یہ مقصد نہیں کہ درسگاہوں میں آکر دل بہلایا جائے یا کہ عورت مجلس کلب یا کسی انجمن کی زینت بن کر رہ جائے بلکہ تعلیم کا اصل مقصد یہ ہے کہ عورت میں تخلیق کردار کی صلاحیتیں پیدا ہوں اور وہ اپنے گھریلو فرائض ذمہ دارانہ طور پر ادا کرے کیونکہ عورت ہی کے بلند کردار اور برتری میں قوموں کی ترقی کا راز پوشیدہ ہے۔ اور اسی کی عظمت اور علو پر قوموں کی عظمت اور برتری کا دارومدار ہے اس میں شک نہیں کہ آج عورت کچھ اپنے اصلی مقام سے ہٹی ہوئی نظر آرہی ہے۔ محفل و کلب کی نت نئی دلچسپیاں اسے اس کے گھریلو اور دیگر فرائض سے دور کر رہی ہیں۔ مغرب کی اندھا دھند تقلید اسے اپنے تہذیب و تمدن سے منزلوں دور کھیچے لئے جا رہی ہے۔ تعلیم کا اصل مقصد فوت ہوگیا ہے۔ ٹیپ ٹاپ آرائش و نمائش کی تاریکیوں میں پیش پیش بڑھی چلی جا رہی ہے۔ دیکھئے کب اس کی نگاہوں پر سے غفلت کا پردہ اٹھتا ہے اور کب اسے اپنے فرائض کا احساس ہوتا ہے۔ یا یوں کہئے کہ اس طرف یہ خواب غفلت سے چونکی اور اس طرف ادائیگی فرض اس کا مقصود نظر بنا۔ پھر ہرگز وہ اپنے آپ کو گھر کی ذمہ داریوں سے بری الذمہ قرار نہ دے سکیگی۔ تب یقیناً تعلیم کا حقیقی فائدہ مرتب ہوگا۔

جب یہ امر مسلم ہے کہ عورت ہی نسلوں کے کردار کی ذمہ دار ہے اور اسی کا اعلیٰ کردار ہی نسلوں کے لئے نشان راہ کا کام دیتا ہے تو تعلیم کی ضرورت اس کے لئے اور بھی زیادہ محسوس ہونے لگتی ہے۔ تعلیم ہی وہ چیز ہے جو اس کی ذہنی اور دماغی خوابیدہ قابلیت کو بروئے کار لانے اور بیدار کرنے کا بے مثال ذریعہ ہے۔ بہرحال تحصیل علم کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا اور نہ ہی اہمیت کا دارومدار

سی فرض سے چھڑایا جاسکتا ہے۔ بشرطیکہ علم اس کے زاویۂ نظر کو وسیع بنا سکے، اور اس میں اس صلاحیت کی تخلیق کرے کہ جس سے وہ اپنے گھر کی زینت۔ ماں باپ کی آنکھوں کا تارا۔ شوہر کے دل کا سکون اور اپنی اولاد کے لئے باعث فخر بن جائے اگر تعلیم سے یہ نتائج برآمد نہ ہوسکیں تو پھر وہ ان پڑھ۔ جاہل عورت ہزار درجہ افضل ہے جس نے نہ تعلیم ہی حاصل کی اور نہ ہی تعلیم کے اصلی مقصد کی دھجیاں اڑائیں بلکہ ان ایجوکیٹیڈ عورتوں کے لئے ایک مجسم درس بنی رہی۔

حقیقت یہ ہے کہ عورت کتنی ہی تعلیم یافتہ کیوں نہ ہو۔ اگر امور خانہ داری سے بے تعلق ہے تو اس کی تعلیم ناقص اور نامکمل ہی رہے گی یہ نظریہ سراسر غلطی پر مبنی ہے کہ تعلیم یافتہ عورت کے لئے خانہ داری کے فرائض کی ادائیگی عار ہے ہرگز نہیں بلکہ یہ کہنا بجا ہے کہ تعلیم حاصل کرنے کے بعد ہی عورت میں انتظام خانہ داری اور دیگر فرائض کا صحیح مذاق پیدا ہوتا ہے اور اس طرح گھر سے اس کا تعلق اور بھی مستحکم ہو جاتا ہے تعلیم انسان کو باعمل فرض شناس اور ذمہ دار بناتی ہے اور یہ خوبیاں ایسی ہیں کہ اگر ان پر عمل کیا جائے تو گھر جنت کا نمونہ بن جائے۔

ان برائیوں کو دور کرنا والدین و سرپرست اور معلمات کے ہاتھوں میں ہے۔

والدین اور سرپرست کا فرض اولین یہ ہے کہ وہ گھر میں ایسا ماحول پیدا کرنے کی کوشش کریں جس سے لڑکیوں پر وہی اثرات مرتب ہوں جو انہیں مستقبل میں اپنے مقام سے نہ ہٹائے۔ ان کی تربیت اعلیٰ اخلاق اور کردار کی بنیادوں پر قایم کریں تاکہ فطرتاً وہ انہیں چیزوں کی طرف مائل ہوں جو انہیں حقیقی معنوں میں عورت کہلانے کی مستحق بنائے ایسے پسندیدہ کردار کی داغ بیل گھر ہی میں پڑ سکتی ہے کیونکہ لڑکیوں کی زندگی کا وہ اہم حصہ والدین ہی کے زیر اثر ہوتا ہے جب کہ دنیا ماں کی نظروں میں عجوبہ ہوتی ہے۔ کم سنی اور ناتجربہ کاری کی وجہ سے ان کی عقل برائیوں اور بھلائیوں میں تمیز کرنے سے قاصر رہتی ہے۔ ایسے وقت اگر والدین کردار کی اہمیت پر توجہ دیں تو ظاہر ہے کہ نتیجہ نہایت ہی خوش گوار نکلے گا۔ معلمات کا فرض ہے کہ وہ اپنے فرائض کی ادائیگی میں انتہائی کوشش کر کے اپنے آپ کو اخلاق و کردار کے اعلیٰ نمونہ بنا کر طالبات کے سامنے پیش کریں تو لازماً ان کے کردار اور اعلیٰ اخلاق طالبات کو متاثر کئے بغیر نہیں رہ سکتے اور حقیقت پر نظر رکھی جائے تو کچھ ایسے معلمات ہی تعلیمی اداروں میں

طالبات کی رہبری اور رہنمائی کے فرائض کا کام انجام
دے سکتی ہیں۔ جو اعلیٰ کردار، حسن گفتار اور اخلاق
حسنہ کے مجسمے ہوں جو اپنے فرائض کی ادائیگی میں
ہمہ تن گوشاں رہے جو اپنی ذمہ داریاں محسوس کریں
تا کہ طالبات میں بھی اس کا مذاق پیدا ہو جائے
اگر کائنات عالم کے یہ دو افراد یعنی والدین اور معلمات
اپنے ان اہم فرائض کی طرف سے کوتاہی کریں تو آئندہ
دن جو تعلیم کا غلط اثر لڑکیوں پر مرتب ہو رہا ہے
اس کے ذمہ دار زمانہ انہیں کو ٹھیرائے گا۔ انہیں کے
سر یہ گناہ عظیم ہوگا کہ تربیت اور تخلیق کردار کا
ایک زرین موقع ان کے ہاتھ آیا تھا اور انھوں نے
اس سے گریز کرکے اپنے آپ کو نقصان پہنچایا اور جن کا
کردار ان کی سعی و کوشش پر منحصر تھا۔ ان کو گمراہ
کیا۔ واضح رہے کہ طالبات کی زندگی میں ماں باپ
اور استاد کی ہر حرکت بیحد و اندازہ اہمیت رکھتی ہے۔
اہل دانش کا قول ہے کہ اولین درسگاہ
بچوں کی آغوش مادری ہے۔ جہاں اس کی لحد تک
کی زندگی کی داغ بیل پڑتی ہے۔ ماں ہی وہ ہستی ہے
جو اساس حیات کہلانے کی مستحق ہے تو پھر کیوں
نہ عورت اپنے اس بلند ترین مقام پر قایم رہے
اور کیوں نہیں ان فیاضیوں کی مستحق بنے جو قدرت
نے اسے عطا کی ہیں۔

الغرض تعلیم ہی وہ شئی ہے جس سے کردار
کی تعمیر ہوتی ہے اور جب عورت ہی نسلوں کے
کردار کی ذمہ دار بنی تو پھر تعلیم اس کے لئے کتنی
اہم اور ضروری ہے۔ ایسی صورت میں عورت کا
تعلیم سے گریز کرنا یا تعلیم پاکر ادائیگی فرض سے دور
رہنا کتنا مضحکہ خیز ثابت نہ ہوگا !!

خواتین کیلئے بیحد اصرار پر شہاب کا نسوانی حصہ ناہید کے نام
سے علٰحدہ دو روپیہ چندہ پر شائع کیا گیا جس کو آج سات سال کا
عرصہ ہوتا ہے بڑی بڑی توقعات لائی گئی تھیں کہ اس کو کامیاب بنانے
میں سعی و کوشش کیجائیگی لیکن آج ہم دیکھتے ہیں کہ مستقبل کی وہ زرین
امیدیں کس طرح نذر یاس ہو گئیں اور خواتین کی جدوجہد کا یہ نتیجہ ہے کہ
اس عرصہ میں پانسو خریدار بھی بہم نہ پہنچے اور بڑھتے ذوق کے
مد نظر بیشتر خواتین بجائے ناہید کے شہاب خرید رہی
ہیں جو ہمارے لئے امید افزا ہے کاغذ اور سامان
طباعت کی گرانی میں البتہ ہمارے لئے یہ مسئلہ
پیچیدہ بن گیا ہے کہ کیا ناہید دو روپیہ چندہ میں
علٰحدہ جاری رہے ؟ یا ناہید کا نام حذف کردیا
جائے ؟ اس سوال کا حل آپ بتائیں ورنہ دو چار
مہینوں کے انتظار کے بعد شاید ناہید مطلع
شہاب سے روپوش ہو جائے۔ مگر خدا نہ کرے کہ
آپ کی جدوجہد کا اتنا مایوس کن نتیجہ نکلے اگر آپ دلچسپی
لیں تو اب بھی موقع ہے کہ ناہید کی تابانی بدستور
باقی رہ سکتی ہے دو روپیہ کیلئے آپ سات سالہ باغ کو
تباہ و تاراج نہ ہونے دیجئے۔

”شطرنج کا مہرہ“

آنسہ معصومہ جنگ بہادر

عنوان دیکھکر آپ خیال کر رہی ہونگی کہ میں شاطر ہوں اور اپنی قیمتی معلومات سے آپ کو آگاہ کروں گی نہیں جناب! یہ بات نہیں نہ مجھکو اس کھیل سے دلچسپی اور نہ اس کا شوق۔ شطرنج گھر میں ہے ضرور۔ لیکن وہ تو ہمارے بھائی ہیں اس نامعقول کھیل سے اپنا دل بہلاتے ہیں۔

کہیں آپ یہ نہ سمجھئے کہ میں اس کھیل سے بالکل ناواقف ہوں اور کھیلنا ہی نہیں جانتی ”اجی“ میں تو اتنا اچھا کھیلتی ہوں کہ اپنے حریف کو مات دئے بغیر چین نہیں لیتی۔ یہ اور بات ہے کہ جب کوئی مشکل چال ہو تو بھائی جان یا ظفر بھائی کو مدد کے لئے بلا لوں۔

”خیر“ چھوڑئے اس بحث کو یہاں تو شطرنج سے نہیں بلکہ اس کے مہرہ سے مطلب ہے کہ اس ننھے سے فتنہ نے ایک دفعہ ہمارے گھر میں کس قیامت کا ہنگامہ برپا کیا ہے۔ جی ہاں ہنگامہ بلکہ پورا غدر۔

خورداد تیر کا موسم کتنا ہی تکلیف دہ سہی لیکن طالب العلموں کے لئے تو خوشیوں اور مسرتوں کا پیغام لے کر آتا ہے۔ سب کے زبان پر یہی رہتا ہے کہ یا اللہ خیر پھر یہ دوزخ جیسے دن آگئے اجی سب کون وہی لوگ جنھیں پڑھنا وڑھنا تو ہے نہیں ان کے لئے سال کے بارہ مہینے برابر ہیں۔ کوئی ہمارے دل سے پوچھے کہ دس مہینے اسکول کی حاضری اور دماغ پاشی کے بعد کس بے چینی سے ان چھٹیوں کا انتظار کرتے ہیں تو بس یہی خورداد یا تیر کا مہینہ تھا۔ میرے دونوں بھائی بھی چھٹیوں میں حیدرآباد سے آئے ہوئے تھے دن عید اور رات شب برات کا مزہ آرہا تھا۔ دن بھر سوائے کھیلنے اور کھانے کے کچھ کام نہ تھا، اور کام ہی کیا ہوتا ہم طالب العلموں کو سوا، پڑھنے کے سو پڑھائی کی طرف سے تو اطمینان تھا۔ امتحان ہو چکا اور نتیجہ بھی نکل آیا۔ اور آپ کی دعا سے ہم اچھے نمبروں سے کامیاب بھی ہو چکے تھے۔ ”اچھا چٹنک کر کے ہی سہی آپ کو اس سے کیا؟ . . . . . .

البتہ بھائیوں کا نتیجہ ابھی نہیں نکلا تھا۔ کیونکہ وہ کالج میں ہیں نا؟ بڑوں کے کام بھی بڑے ہوتے ہیں۔ ہم بیچارے اسکول والے امتحان ختم ہوا چلو اسی وقت نتیجہ بھی مل گیا۔ پاس ہوئے تو خوش ورنہ منہ لٹکا کے گھر چلے آئے۔ تھوڑی دیر اس کا رنج رہا۔ پھر دو ماہ کی طویل تعطیلات کی خوشی نے اس غم کو دبا دیا۔

توبہ توبہ میں بھی کہاں سے کہاں پہنچ گئی آپ بھی کہتی ہوں گی کہ کیا باتونی "لڑکی" ہے۔ کہاں مہرہ کا ذکر تھا اور کہاں اپنی چھٹیوں اور پڑھائی کا دکھڑا لے بیٹھی۔ تو جناب! ذرا صبر کیجئے نا؟ یہ بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ جب تک کہ نمک مرچ نہ ہو قصہ چٹپٹا نہیں ہوتا۔

ہاں تو یہی گرمیوں کے دن تھے۔ دونوں بھائی بھی آئے ہوئے تھے اور ہمارے دن بڑے عیش سے گزر رہے تھے۔ نت نئے کھیلوں سے دل بہلاتے۔ کبھی برج ہوتا، کبھی "کیرم" کبھی مونا پلی۔ چاندنی راتوں میں آنکھ مچولی ہوتی وہ گھوڑ دوڑ مچتی کہ توبہ بھلی۔ پھر اس پر ہمارے بھائیوں کا حلق پھاڑ پھاڑ کر چیخنا اپنی موٹی موٹی آوازوں میں۔ امی بیچاری تو تنگ آگئی تھیں۔ ہمارے ہر وقت کے کھیل سے۔ اس سال گرمیوں میں ہماری قسمت زوروں پر تھی۔ قدرت بھی مہربان۔ خدا کی قدرت دیکھئے کہ ایک صبح میں مونا پلی کی چیزیں ٹھیک کر رہی تھی۔ کیونکہ طے یہ ہوا تھا کہ آج دن بھر کھیلا جائیگا اتنے میں رضا بھائی نے آ کر مجھ کو جھنجھوڑ ڈالا غصہ تو بہت آیا۔ لیکن بعد میں ان کی مضحکہ خیز صورت دیکھ کر بے اختیار ہنسی آگئی۔ "ارے پگلی" چھوڑ اس کو ایک خوشخبری سناؤں کان کے پاس منہ کر کے خوب زور سے چلائے۔ ظفر بھائی اور باجی "آ رہی ہیں۔ میں خوشی سے سچ مچ اچھل پڑی۔ پہلے تو یقین نہ آیا۔ لیکن جب امی سے خط لے کر پڑھا تو واقعی باجی اور ظفر بھائی آ رہے تھے۔ اور دو گھنٹہ بعد ہی صبح میں پٹنہ سے خط آیا۔ اور گیارہ بجے یہ لوگ آ رہے تھے۔ امی تو کھانے وغیرہ کے انتظام میں لگ گئیں۔ سب بھائی باجی کے لینے کو چل دئے۔

یہ ظفر بھائی کون ہیں۔ ان کی بھی ذرا تعریف سُن لیجئے۔ "اجی" ہمارے ایک بہنوی ہیں بڑے مزے کے آدمی، روتوں کو ہنسانا تو ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ غرض ان سے ہر ایک خوش رہتا ہے۔ نئی نئی ترکیبیں دل بہلانے کی سوچتے رہتے ہیں۔

باجی تو بس اپنے بچوں ہی میں حیران پریشان۔ ان کے آنے کی تو اتنی خوشی بھی نہ تھی

ہاں! ظفر بھائی کی طرف سے ہماری چھٹیوں کا لطف
دوبالا ہو جائے گا۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ مجھ کو
ایک فکر بھی لگ گئی۔ آپ کہیں گی وہ کیا؟ تو سنئے
ہمارے ظفر بھائی! جب آتے ہیں تو بس دو کھیل
کو بہت چمٹ جاتے ہیں۔ ایک تو پریل۔ دوسرا
شطرنج۔ مجھ کو نہ معلوم کیوں ان دونوں کھیلوں
سے سخت نفرت ہے۔ شطرنج سے تو بچ بھی سکتی
ہوں۔ لیکن پریل پارٹی جمی اور شروع ہوا ان لوگوں
کا چیخنا۔ کہاں ہو بھئی معصومہ! چلو آؤ بس
تم کو تو نخرے کرنا خوب آتے ہیں۔ اب لاکھ کہو
کہ بھئی مجھ کو اس سے دلچسپی نہیں یا یہ کہ میرے
پاس پیسے نہیں۔ لیکن کون سنتا ہے۔ زبردستی
کھینچ کھانچ کر لا پٹکیں گے۔ دیکھی آپ نے
ان لوگوں کی زبردستی۔ ایک دن شام میں
امی اور باجی بیٹھیں کچھ باتیں کر رہی تھیں۔
میں بھی انہیں کے پاس بیٹھی ان لوگوں کی
دلچسپ گفتگو سننے میں محو تھی۔ ظفر بھائی اور
رضا بھائی بیٹھے شطرنج کھیل رہے تھے۔
جب بازی ختم ہو گئی تو پھر پریل کی طرف متوجہ
ہوئے۔ بیچاری شطرنج اور اس کے مہرے
وہیں پڑے لڑھکتے رہے اور باجی کے بچوں نے
اس پر قبضہ جما لیا۔ ایک دم نفیس! (باجی کی
لڑکی) نے آکر مجھ سے کہا کہ انٹی اشتیاق! (باجی کا
نور نظر) نے ایک مہرہ حوض میں ڈال دیا۔ ارے
میں نے کہا تو نکال لو نا؟ ساتھ ہی ظفر بھائی
حوض کی طرف لپکے۔ لیکن وہاں تو کوئی مہرہ نہ
تھا۔ (واضح رہے کہ یہ مہرہ لکڑی کا ہے) البتہ
حوض کے اطراف سب پہلے پڑے تھے حساب
لگایا گیا تو ایک سفید پیادہ غائب۔ سب جگہ
ڈھونڈا لیکن اس کا پتہ نہ تھا۔ میں نے کہا کہ
شاید حوض میں ڈوب گیا ہو۔ اس پر ایک
قہقہہ پڑا، اور میں خفیف سی ہو گئی۔ ظفر بھائی
نے کہا۔ معصومہ! تم تو عقل کے پیچھے لٹھ لئے
پھرتی ہو۔ پگلی لکڑی کا مہرہ ڈوبے گا کیسے۔
بس جناب! مجھ کو بڑا غصہ آیا۔ اور میں نے کہا
کہ آپ کچھ کہئے۔ بہرحال وہ ضرور حوض میں ہے
ورنہ پھر کہاں غائب ہو گیا۔ ابھی ابھی تو آپ
لوگ کھیل رہے تھے۔ سب جگہ تو ڈھونڈھ لیا۔
کہیں بھی تو نہیں۔ حوض میں اگر نہیں تو پھر کیا
ہوا۔ اس پر ایک فرمائشی قہقہہ لگا۔ اور بڑے
بھائی تقی نے کہا جو بڑا فلسفی بنتا ہے "کل
صبح سورج مغرب سے نکلے گا۔ کیونکہ جب لکڑی
ڈوب سکتی ہے تو پھر سورج کیوں نہ اپنی رفتار
بدل دے۔ غصہ کے مارے میرا برا حال تھا بڑبڑاتی
ہوئی اپنے کمرہ میں چلی گئی۔ اور یہ لوگ مہرہ کی
تلاش میں لگے رہے۔ (باقی)

جھلکیاں

بلقیس سید احمد

کسی کی جھلک بھی بعض اوقات توجہ کا مرکز بن جاتی ہے۔ چند لمحوں کو حسین بنا دیتی ہے اور پھر جھلکیاں جب جھلکنے لگیں تو معلوم ہوتا ہے کہ کسی کا سارا جیون جھوم رہا ہے۔ ناچ رہا ہے، جھلک رہا ہے۔ ان جھلکیوں میں روئے سخن کسی کی طرف نہیں۔ کوئی اپنے کو نہ سمجھ لے یہ تو ہیں صرف چند خیالوں میں بسنے والوں کی جھلکیاں۔ کیونکہ صرف حسین تخیل ہی وقت کو حسین بنا سکتا ہے۔ یہ جھلکیاں ہیں خیالوں میں رہنے والوں کی پیاری پیاری میٹھی سی دلچسپ جھلکیاں

۱۔ الف لیلہ کے افسانوں کی ہیروئینوں جیسا حسن رکھتی ہیں، وہی حسن جو صرف خیالوں میں رہتا ہے۔ جس حسن اور حسین اداؤں کو ہم صرف سوچ سکتے ہیں۔ جب وہ سامنے آتی ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ تخیلات کا حسن سچ مچ جاگ رہا ہے۔ وہی گلابی گلابی چہرہ۔ پتلے سے ہونٹ اور بالوں کی ایک لٹ ہمیشہ پریشان رہتی ہیں۔ کاش اسے کوئی سنوار دے کبھی کبھی ہلکی سی مسکراہٹ اور کبھی لپٹتے قہقہے بس اس سے زیادہ کچھ نہیں بھلا حسن کو سادگی سے کیا واسطہ۔ حسن اور غرور تو ہمیشہ ساتھ ساتھ رہتے ہیں۔ اپنے آپ سے شرما جانا اور آنکھوں میں مسکرانا تو کوئی ان ہی سے سیکھے۔ شفق کی رنگینیوں کا عکس، شاید ان ہی میں جھلکتا ہے پہلے پہلے تو بہت معصوم ہیں۔ بہت سادگی پسند۔ دشمن سے بھی دوستی کر لینا چاہتی ہیں۔

دوست تو خیر دوست ہی ہوتے ہیں۔ کسی کی بہت دوست نہیں۔ ایسی بھی دوستی کہ جس پر ستارے رشک کریں۔ ستارے صرف رات بھر ہی ساتھ ساتھ رہتے ہیں اور پھر شاید صبح ہوتے ہوتے اڑ لیتے ہیں کہ دن بھر نظر نہیں آتے یا کبھی ایک ٹوٹ جائے تو ــــ دوسرا اکیلا ہی سفر کرتا ہے۔ ہاں تو دونوں بہت دوست تھے۔ جیسے ایک روح اور دو جسم ہوتے ہیں۔ جب کوئی دو معصوم روحیں مل جائیں تو دنیا کتنی حسین بننے لگتی ہے۔ ایسا سنگت ہے جیسے تن ناچ رہا ہے۔ من ناچ رہا ہے۔ دنیا ناچ رہی ہے ...... مگر ... مگر چاندنی بھی تو چند دن رہتی ہے۔ اس کے بعد وہی بھیانک سی اندھیری راتیں ــ اسی طرح دنیا بھی بدل جاتی

اور جب دنیا بدلتی ہے تو اس کے ساتھ انسان اور ان کے دل بھی بدل جاتے ہیں اب انہیں احساس برتری ہونے لگا۔ احساس حسن۔ احساس علم سب ہی کچھ۔ جب اتنی ساری چیزوں کا احساس ہونے لگے تو دوستی کا احساس کہاں رہے گا۔ وہ بھی مدہم ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ مٹ گیا مٹا ڈالا گیا۔ اب نیا ماحول۔ نئی دنیا۔ نئی دلچسپیاں۔ نئے دوست۔ نئے احساس نیا حسن سب ہی میں غرق ہیں۔ لباس زیادہ حسین ہوتا جا رہا ہے ہنسی زیادہ دلکش۔ آواز زیادہ مترنم۔ کیوں نہ ہو حسین جو ہیں اور سب سے زیادہ حسن کا احساس۔ بہرحال ایک قیافہ شناس کے لئے بہترین فنی مطالعہ کا موضوع بن سکتی ہیں۔

۲۔ ان کے گھنگھریالے بال ایک سمندر کی طرح لہریں لیتے رہتے ہیں۔ مغربیت پسند بہت ہیں لباس کی وضع اور آرائش کا انداز بالکل مغربی طرز کا ان کو دیکھنے سے عمر خیام کا شاعرانہ خواب جیتی جاگتی صورت میں نظر آتا ہے۔ ان کے دوستوں کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ بہت ہی وسیع تخیل سے بھی زیادہ اتنے دوست رکھتی ہیں اور چاہتی ہیں کہ "ن" بھی ان کی دوست بن جائے۔ وہی فضول سی "ن" جس کے نزدیک دوستی کی کوئی حقیقت نہیں جو دوستی کو ایک کھیل سمجھتی ہے۔ ٹھیک بھی تو ہے جو دوست دوستی کو زندگی بھر نبھا نہ سکیں وہ دوستی ہی کیا۔ ن کے نزدیک زندگی بھی ایک کھیل ہے۔ ایک حسین خواب ایک بے بنیاد سپنا۔ تو پھر ایسی فضول سی لڑکی سے دوستی کر کے انہیں کیا مل جائیگا۔ خدا معلوم کوئی ان ہی سے پوچھے۔ بہت گہری فطرت ہے نئی تہذیب کی ایک چمکدار جھلک ہیں۔ کسی کو بہت جلدی سمجھ لیتی ہیں۔

۳۔ ایک ایسی جھلک جو ہمیشہ جھلکتی ہے ضرورت سے زیادہ محنت کو کمزوری سمجھتی ہیں۔ ٹھیک تو ہے لاحاصل محنت سے فائدہ۔ خوش رہنا۔ خوش دیکھنا۔ اور خوش رکھنا چاہتی ہیں۔ دنیا ان کے نزدیک بہت دلچسپ اور حسین ہے۔ تو بھی ایسی ایسی دنیا میں جو حسین بھی ہے اور ہمیشہ مسکراتی ہے ہم کو تو بھی مسکرانا چاہئیے۔ زندگی کو بہت enjoy کرنا چاہتی ہیں مگر مواقع بہت کم ہیں۔ چاہتی ہیں کہ دنیا کا یہ نظام ہی بدل جائے۔ یہ پرانے طریقے۔ پرانی باتیں۔ پرانی چیزیں۔ آخر یہ فرسودہ اور کہنہ نظام کب تک۔ کیوں نہیں یہ بدل جاتے اور یہ بدلنے کی کوشش کریں بھی تو نہیں بدل سکتیں۔ کوئی شعلہ کی طرح بھڑکنا چاہتے تو ہمارا ماحول ہماری تہذیب اس شعلہ کو بجھا ڈالتی ہے۔ کچھ نہیں کر سکتیں تو اسی پر قانع ہیں مگر یہ چنگاریاں بجھیں گی کیسی۔ بہت مستقل مزاج ہیں۔ مصیبتوں پر قہقہے لگانا خوب آتا ہے۔ بیکار تمناؤں

نہ قبول ہونے والی دعاؤں اور پوری نہ ہونے والی امیدوں پر بھروسہ کبھی نہیں۔ صرف اپنے آپ پر بھروسہ ہے۔ محفل کی جان۔ دوستوں میں ہر لعزیز ہیں۔ یہ نہ رہیں تو ان کی سہلیاں کچھ اداس اداس سی رہتی ہیں۔ نور لازوال ہے۔ حاضر جواب اور خوش اخلاق ہیں۔ بہترین رہنما ہیں۔

۴۔ ان کو ہر کام کا سلیقہ آتا ہے صنف لطیف کو ایسا ہی لطیف ہونا چاہیئے۔ بہت عقلمند ہیں۔ کہتی ہیں دوستی کی جائے تو ہمیشہ نبھایا جائے۔ یا پھر دوستی کی ضرورت ہی نہیں۔ امیدوں کی دنیا بہت بڑی ہے اس کا انہیں کافی احساس ہے۔ بہت خوش مزاج ہنستی اور ہنساتی رہتی ہیں۔ بہترین سیون جانتی ہیں۔ آرٹ اور صنف لطیف جب ایک ہو جائیں تو کیسا حسین تخیل بندہ جاتا ہے وہ مخصوص حسین چیزوں کو بہت پسند کرتی ہیں۔ بہت ہی زیادہ، اس لئے کہ وہ حسین ہیں ایک تو ہے "آسمان حسن" کا ستارہ اور دوسرا "آسمان ادب" کا درخشاں تارہ۔

۵۔ ایک ایسا جاذب جو ہر خوبی کو جذب کرلے۔ ڈومسٹک سائنس سے بہت دلچسپی ہے عمدہ اخلاق کی حامل۔ غریبوں کے لئے دل میں بہت درد رکھتی ہیں۔ مسلمانوں کی حالت سے سخت متاثر ہیں نصیحت کا بڑا اثر ہوتا ہے۔ بہت شرماتی ہیں۔ سہیلیوں کے بہت کام آتی ہیں۔ کالج میں اپنی لکچرار سے کچھ سمجھ میں نہ آئے تو پوچھنا تو چاہتی ہیں مگر پوچھ نہیں سکتیں۔ شاید کئی جوڑ آنکھیں انہیں دیکھنے لگیں گی اس سے ڈرتی ہیں۔

۶۔ یہ بہت سنجیدہ۔ خاموش اور حساس ہیں۔ ادب سے کافی دلچسپی ہے۔ دنیا کا درد دل میں رکھتی ہیں۔ ڈرتی بہت ہیں۔ یہاں تک کہ چھوٹے چھوٹے کیڑوں سے بھی۔ لوگوں کی نظروں سے خود کو بچاتی ہوئی اس جگہ سے رفو چکر ہو جاتی ہیں۔ ہر ایک کی زندگی میں ناکامی موت کی طرح یقین ہے موت کی طرح۔ خدا جانے یہ یہاں تک خیال یہ تاریک تصور کیسے کر بیٹھیں اگرچہ ابھی تک کبھی ناکام نہیں ہوئیں۔ شرماتی بہت ہیں۔ اپنے آپ سے بھی بعض وقت۔

۷۔ "ن" وہی ن جسے کئی ایک جانتے ہیں۔ اور بعض نہیں جانتے۔ ایک لاپروا لڑکی جس کے نزدیک زندگی بھی ایک کھیل ہے۔ وہیں ایک حسین خواب۔ "ن" میں کئی جھلکیاں ناچتی ہیں جس کی ہر نئی جھلک بہت سوں کی توجہ کا مرکز بن جاتی ہے یہ ایک کلی کی طرح معصوم اور حسین لڑکی ہے۔ مسکراتی ہوئی آنکھیں گلاب کی طرح ہونٹ اور سفید رنگ۔ اس کا دمکتا ہوا چہرہ اور کسی ملکوتی نور سے روشن آنکھیں کوئی دیکھ لے تو چاند اور

چاندنی کو بھی بھول جائے۔ ہاں حسین چیزیں سب
کچھ بہلا دیتی ہیں۔ اس میں موجوں کی سی بے کلی
پھولوں کی خوشبو، پانی کی روانی سبھی کچھ ہے۔
کسی چیز کے لئے مخصوص نہیں بہت کچھ کر لیتی ہیں
کالج میں بھی ـــ اس کی سفید انگلیاں تیز نشتر
بھی پکڑ لیتی ہیں۔ پنسل سے کھیلتے کھیلتے بہترین
پھول پتے اتار لیتی ہیں۔۔ کس کے مشکل
پرابلم بھی حل کر لیتی ہیں اور جب لکھتی ہیں تو بہت
کچھ لکھ ڈالتی ہیں۔ دو آنکھیں ہمیشہ اس کا
تعاقب کرتی رہتی ہیں۔ مگر "ن" نے کبھی پیچھے
پلٹ کر نہ دیکھا۔ خدا معلوم وہ اس سے کیا
چاہتی ہیں۔ کنول کی معصوم کلیاں "ن" کیلئے
اپنے اندر بہت کشش رکھتی ہیں۔ ہمیشہ مسرور
رہتی ہے۔ "ن" کا خیال ہے کہ دنیا بہت حسین
جگہ ہے اور انسان کی زندگی خدا کا بہترین
عطیہ اور پھر انسان کو ہمیشہ خوش رہنا چاہئے
اس چھوٹی سی زندگی میں رنج کا کیا کام۔ ہر
نئی صبح اس کے لئے ایک خوشگوار پیغام اور
ایک مسکراتا ہوا دن لاتی ہے۔ بہت ہمدرد
دل ہے۔ کسی اداس چہرہ کو دیکھکر تڑپ جاتی
ہیں۔ بہت کوشش کرتی ہیں کہ کسی کا غم بانٹ
لیں کسی کی آنسو بھری آنکھوں میں نئی زندگی
پیدا کر دیں۔ بہت سی سہیلیاں ہیں مگر لوگوں کا
خیال ہے کہ عنقریب "م" سے بہت گہری دوستی
ہو جائیگی۔ یہ تو پہلے صرف "ف" اور "ظ"
کہتے تھے۔ مگر اب سب کہنے لگے۔ بھلا "ن"
اسے کیسے دوستی کر سکتی ہے۔ جبکہ "ر" اس سے
بہت دور ایک دور کے شہر میں ہے اور
اس کو "ر" سے سخت نفرت ہے۔ جب اس نے یہ
سنا تو اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں اور ایسا
معلوم ہونے لگا کہ جیسے کہر میں لپٹی ہوئی دو
جھیلیں بہہ رہی ہیں۔ ہاں تو "ن" کے خیالات
"ن" سے بھی زیادہ حسین ہیں۔

"ن" ایک حسین مجسمہ ہے جو صرف خیالوں
میں ہے۔ وہ بھی حسین خیالوں میں۔

شمس بازغہ (مصنفہ آنسہ محمودہ رضویہ مدیرہ شعاع اردو کراچی۔ قیمت عہ) کی یہ نئی تصنیف ہے اور یہ اتنی
کتابوں کی مصنفہ ہیں کہ ان کی فہرست زبانی
یاد رہنا ذرا مشکل ہی ہے۔ مختلف عنوانات
جیت ہار۔ فتح مکہ۔ ہجرت حبش وغیرہ کے
تحت رسول مقبولؐ کے سوانح مقدس بیان
کئے گئے ہیں۔ لکھوائی چھپوائی اچھی ہے لیکن ٹائٹل
سے ہمیں اختلاف ہے کہ ایسے مقدس ذات کیلئے ایک
تصویر کا تخیل کیوں پسند ہوا۔ اگر اس کو دیدہ زیب ہی
بنانا تھا تو مکہ معظمہ۔ مدینہ منورہ۔ غار حرا زیادہ
موزوں ہوتے۔

"محبت"

آنسہ پریم پجارن

(بسلسلۂ گذشتہ)

سگریٹ سلگاتے وقت میں نے دیکھا کہ ان کے ہاتھوں میں مہندی لگی ہے مجھے کچھ شبہ ہوا۔ میں فوراً پوچھ بیٹھی۔

میں۔ بھیا۔ آپ نے عورتوں کی طرح دونوں ہاتھوں میں مہندی لگا رکھی ہے۔ کیا الگ الگ بیاہ کر لیا؟

وہ۔ (چونکے) بیاہ۔ آہ۔ پریم ہماری آنکھیں دھوکا کھا گئیں۔ میرے ہاتھ مہندی سے نہیں بلکہ ایک نردوش کے خون سے رنگے ہیں۔ ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

ملیر ا۔ بھیا ایشور کے لئے پہیلیاں نہ بجھوایئے صاف کہئے معاملہ کیا ہے۔ واہ اچھا بیاہ کیا ہمیں خبر تک نہ ہوئی۔ ہماری بھابی کو کہاں چھوڑ آئے

وہ۔ پریم انسان کی زندگی خود ایک پہیلی ہے کیوں ٹھیک ہے نا۔ وہ شدت غم سے کانپ رہے تھے

میں۔ بھیا آپ ہماری باتوں کا جواب کیوں نہیں دیتے۔ آپ کی شادی خانہ آبادی کو ہوئے کتنے دن ہوئے۔

وہ۔ رنجیدگی سے۔ شادی خانہ آبادی نہیں، ہرگز نہیں بلکہ خانہ بربادی۔ آہ پریم ظالم سماج نے مجھے آج سے ایک ماہ قبل بیاہ کے بندھن میں جکڑ دیا اس بندھن نے میرے ارمانوں کا خون کیا۔ میرے ارمانوں کی ناؤ جس کا کھویا۔ صرف میں ہی نہ تھا بلکہ اوشا میری دیوی بھی تھی۔ سماج کے ہاتھوں نراس کے بحر میں ڈبو دیگئی۔ اب ان کی نرگسی آنکھوں سے آنسو ٹوٹی ہوئی مالا کی دانوں کی طرح گرنے لگے۔

میں۔ بڑی دیر کے بعد آپ کی پہیلی حل ہوئی تو یہ کہئے کہ آپ کو اوشا سے محبت تھی اور شادی ہو گئی۔ دوسری سے کیوں بھیا ٹھیک کہتی ہوں نا ۔۔۔ بھیا مجھے آپ سے کافی ہمدردی ہے۔ گو آپ میری ہمدردی کے مستحق نہیں اس کی زیادہ قابل تو اوشا ہے۔ آہ ۔۔۔ آپ مرد ہیں آپ کی اچھی بھلی گزر جائیگی۔ لیکن اوشا ۔۔۔۔ اوشا۔ بیچاری عورت ہے ۔۔۔ ایک کمزور ہستی۔ میرے بھیا۔ میں آپ سے التجا کرتی ہوں کہ آپ مجھے اپنی دکھ بھری کہانی سنائیں تاکہ آپ کا بوجھ ہلکا ہو جائے۔۔۔

وہ۔ میری کہانی ۔۔۔ پریم اگر تم نہ سنو تو بہتر ہے میری دکھ بھری کہانی سن کر تیرے ننھے سے دل کو دکھ ہوگا۔

ہیں۔ (بھیا کا ہاتھ محبت سے دبا کر) میرے بھیا میں آپ کو اپنا سگا بھائی سمجھتی ہوں۔ میں اپنے پریم کا واسطہ دے کر کہتی ہوں کہ آپ اپنا قصہ سنائیں۔ اگر آپ نہ سنائیں گے تو میرا دل ٹوٹ جائیگا۔

وہ۔ جب تم اتنا مجبور کرتی ہو تو سنو۔ اتنا کہکر انھوں نے اور ایک سگریٹ سلگایا اور کہنا شروع کیا۔ پتاجی کے سورگ باش ہونے کے بعد ہم ملو سیشرم میں آبسے۔ ماتاجی نے پرمیلا کو ایک مشن اسکول میں داخل کر دیا تو میں بھی کرائسٹ کالج میں تھرڈ ایر میں شریک ہوگیا۔ ایک دن ماتاجی نے صبح صبح ایک چھٹی دیکر کہا کہ بیٹا یہ بہت ضروری ہے۔ ہمارے کرشن ماما کو دے آؤ۔ کرشن چند میرے دور کے رشتہ کے ماموں تھے۔ وہ کافی متمول تھے۔ ماتاجی نے مجھے بتایا کہ ان کی صرف ایک ہی بیٹی ہے اوشا اگر میں اس کے قابل ثابت ہوا تو بیاہ اسی سے ہوگا۔ سیکل پر ٹانگ ڈال کر ماما کے گھر کی راہ لی راستہ تمام تفکرات میں کٹا۔ کبھی سوچتا کہ اوشا صبح کی دیوی کی طرح حسین ہوگی۔ کبھی خیال کرتا کہ وہ بدصورت ہوگی۔ غرض راستہ کٹ گیا۔ میں نے برساتی میں سیکل کھڑا کی اور ہندوستانی طریقہ کے مطابق دستک دی۔ ماما کرشن خود باہر نکل آئے مجھے دیکھکر بہت خوش ہوئے گلے لگا کر پیار کیا۔ پتاجی کی یاد آگئی۔ ان کی بوڑھی آنکھوں میں آنسو جھلکنے لگے۔ وہ مجھے [illegible] اندر لے گئے۔ مامی بھی بڑی محبت سے پیش آئیں۔ میری آنکھیں اوشا کو ڈھونڈنے لگیں۔ انتظار کرتے کرتے دم لبوں پر آگیا۔ آخر نہ رہا گیا اور پوچھ بیٹھا۔ مامی اوشا بھی نظر نہیں آتیں۔

وہ۔ کالج جانے کے لئے تیار ہو رہی ہے ابھی بلاتی ہوں۔ مگر ونیود کیا تم اسے پہچان سکوگے۔ وہ تو اب کافی بڑی ہو گئی ہے۔

اوشا اری اوشا۔ دور سے آواز آئی۔ آئی مما۔ ایک لمحہ بعد پردہ ہٹا اور اوشا میرے سامنے تھی۔ سرخ سفید رنگ۔ نیلی بال سمندر کے پانی کی طرح نیلگوں آنکھیں۔ پتلے پتلے گلاب کو شرماتے ہوئے لب۔ بڑے بڑے بھورے گھنگروالے بال۔ سرو کو شرما دینے والا قد۔ چہرہ کو غازہ اور لپ اسٹک نے اور زیادہ دلکش بنادیا تھا۔ ایک ہاتھ میں سونے کی چار چوڑیاں اور دوسرے میں خوبصورت بیضوی گھڑی میں اسے دیکھنے میں محو تھا۔ مامی کی آواز نے چونکادیا "ونیود اچھی طرح دیکھ لینا۔ اس ایک جملہ نے مجھے شرم سے پانی پانی کر دیا۔ میرا چہرہ سرخ ہوگیا۔ ادھر اوشا بھی شرما گئی۔ (باقی)

محمودیہ مشین پریس چارمینار میں چھپکر دفتر شہاب بیرون حیدرآباد سے شائع ہوا

ماہنامہ

شہاب

جلد ۳ بہمن ۱۳۵۴ فصلی م دسمبر ۱۹۴۴ء نمبر ۳

(مرتبہ)

محمد عبدالرزاق بسمل

چندہ سالانہ عوام سے (للعہ) گورنمنٹ سے (۱عہ)

شکوہ و جواب شکوہ!

جناب سردار کریم نواز خان صاحب ایم اے (پنجاب)

تو اے محو سخن گستران پیشینی مباش منکر غالب کہ در زمانہ تست

حال ہی میں سرزمین بنگال کے جو انسال اور جواں فکر ادیب الطاف حسین صاحب نے مرشدنا علامہ سر محمد اقبال رحمۃ اللہ علیہ کی معرکۃ الارا نظم شکوہ و جواب شکوہ کا انگریزی میں منظوم ترجمہ شائع کیا ہے۔ الطاف حسین صاحب کی مولد و مسکن سرزمین یعنی بنگال سحر آفرین، ہندوستان میں علم و فضل کا ایک قدیم مرکز رہی ہے اور یہاں کی خاک سے جس درجہ کے اہل کمال پیدا ہوئے، جس پایہ کے فضلا اُٹھے، علمی مصنفات و فنون علمیہ میں جیسا عظیم الشان حصہ انھوں نے لیا۔ تاریخ ہمیشہ اُن کا تذکرہ ادب سے کرتی رہیگی۔ بنگال نے ہندوستان کی مجلس علم و فضل میں ایسے اسماء الرجال کی عزت دی جن کا مفصل تذکرہ ایک مطول تاریخ کے اوراق و بطون پر بھی بھاری ہے۔ بلالی رنگت اور دراز گیسوؤں کی سرزمین کے اُن نامور ادیبوں میں جناب الطاف حسین کا نام اپنی ادبی کوشش کی پہلی جست میں وہ بلند مقام حاصل کر گیا جس کے لئے ضخیم جلدوں کے کہن سال مصنف رہین انتظار رہتے ہیں۔

اقبال کے فیز جیرالڈ کے لئے ہماری آنکھیں یورپ کے مستشرقین کی جانب لگی ہوئی تھیں لیکن خیامی صہبا سے مخمور یورپ میں اقبالی جرعہ کی پذیرائی نہ ہوئی۔ چنانچہ جہاں خیام کو گارنر، ہنری دی فرنان، نیکولاس، والانتین ز.کوفسکی VALETIN ZHUKOVSKI. مسز پورین۔ ہانفیلڈ اور فیز جیرالڈ میسّر آئے وہاں (جہاں تک میرے علم میں ہے) اقبال کو ایک رینلڈ نکلسن ملا جس نے اسرار خودی کے الفاظ کو تو انگریزی سانچے میں ڈھال لیا مگر اسرار خودی کے محرک جذبات کو انگریزی آئینہ میں نہ اتار سکا۔ پروفیسر نکلسن کی علمی بلندی کا کس کو اعتراف نہیں لیکن اسرار خودی کے ترجمہ کی یہ خامی نکلسن کے بس کا روگ نہیں جو نگاہیں جلوۂ مطلوب سے مستیز اور جو کان نغمۂ وصال سے سرفراز ہوں وہاں محرومی و ناکامی کی صدا اور خلش افتاد کی ندا اگر راہ پیدا

بھی کرلے تو الفاظ کے ماورا الوراقلبی کیفیات اور دل کی گہرائیوں کے جذبات کا اندازہ ممکن نہیں۔ اسرار خودی کے دیباچہ میں ایک شعر ہے۔

باغباں زور کلامم آزمودا مصرع کارید و شمشیرے درود

پرفیسر نکلسن نے اس کا ترجمہ یوں کیا:۔

The gardener tried the power of my song
He sowed my verse and reaped a swold

لفظی ترجمہ کے اعتبار سے بلاشبہ یہ درست ترجمہ ہے مگر جو صاحبان انگریزی اور فارسی دونوں زبانوں سے آشنا ہیں وہ خود اندازہ کرلیں کہ یہ ترجمہ اقبال مرحوم کے شعر کے جذبات و محرکات کی کس درجہ آئینہ داری کرتا ہے۔ ہرچند مشرقی شاعری اور مغربی ادبیات اصولاً اس درجہ باہم تخالف ہیں کہ دونوں میں تبائن و تضاد کا ایک اطلانیک بہہ رہا ہے اسے عبور کرنے میں فیز جیرالڈ کو الطاف حسین ہی کی ہمت کام کرگئی اور وقت و حالات جدت و حداثت، اتحادِ خیال و مشرب اور نیز جماعت کے وقتی انفعال و تاثیر نے ایک مرتبہ ان کا ساتھ دیدیا۔ یہ باتیں ہمیشہ و ہر شخص کے حصہ میں نہیں آسکتیں۔

"یہی سبب ہے کہ پروفیسر نکلسن کا ترجمہ ایک ادبی مترجمہ ذخیرہ سے زیادہ وقعت حاصل نہ کرسکا اور اس سے صرف یہ کام لیا گیا کہ غیر فارسی دان اقبالی ادبا اُن کے ذریعہ اقبال کے نام سے آشنا ہوگئے۔ تاہم وہ فیز جیرالڈ کی طرح عشاق اقبال کے وسیع حلقہ میں کوئی ادبی محبوبیت حاصل نہ کرسکا اور نہ ہی انگریزی ادبیات میں ایک داخلی جزو شعری کی طرح اسے قبولیت ہوئی۔

فیز جیرالڈ کا کارنامہ "سوئن برن" کے الفاظ میں یہ ہے:۔

"وہ یورپ کا خیام ہے، اس نے ترجمہ نہیں کیا بلکہ انگریزی میں خیام کی روح شعری کو تشکل و متمثل کردیا ہے۔ اگر خیام انیسویں صدی کے اندر انگلستان میں پیدا ہوتا اور فردوسی کی جگہ چاسر (یعنی انگریزی) کی زبان میں رباعیات کہتا تو یقیناً وہ ایسی ہوتیں جو مغربی خیام کے دل پر مشرقی فیضان لاہوتی سے القا ہوئی ہیں۔"

اگر سوئن برن کے الفاظ کا اعادہ خیام کے لئے اقبال اور فیز جیرالڈ کی بجائے الطاف حسین صاحب

کے لئے کیا جائے تو میں کہوں گا کہ بالکل درست اور حقیقت کی نقاب کشائی ہے۔ اس ترجمہ کی سلاست۔ عذوبیت اور حسن ترکیب اور تاثیر بیان اس پایہ کا ہے کہ فی الحقیقت انگریزی ترجمہ کو پڑھ کر وہی وجدانی کیفیت حاصل ہوتی ہے جو اصل اردو کے مطالعہ سے پیدا ہوتی ہے۔

ہماری بدنصیبی ہے کہ ہم مشرقیوں نے اپنے ادیبوں سے مجرمانہ غفلت برتی ہے۔ اس میں صرف ہندوستان ہی درخور ملامت نہیں بلکہ ایران عرب اور تمام دنیائے مشرق کی ذہنیت اس معاملہ میں یکساں رہی ہے ہندوستان میں ویدوں کی اگر تلاش کی جائے تو سارے ہندوستان میں ایک مکمل نسخہ بھی دستیاب نہیں ہوتا اور اس کے لئے ہمیں میونخ یونیورسٹی لائبریری کی الماریاں دیکھنی پڑتی ہیں۔ ایران میں عمر خیام کی رباعیات کا صحیح اور الحاقی منسوبات سے معرا نسخہ ہمیں کہیں نہیں ملتا اور اگر تلاش کریں تو سر گوراوسلی کے نسخہ کا جو بولڈن (آکسفورڈ) کے کتب خانہ میں ہے یا بیرن وکٹر روزین معلم السنۂ شرقیہ پیٹر برگ کے نسخہ کا جو سینٹ پیٹر برگ کے کتب خانہ میں ہے۔ یا روسی مستشرقین موسیو اموانوف کا مرہون ہونا پڑتا ہے علیٰ ہذا القیاس ہمارے کتنے علماء، شعراء مشاہیر و اعاظم مصنفین ہیں جن کی مصنفات ہر عہد اور ہر حصۂ عالم میں معروف و متداول رہیں۔ اگر یورپ میں یہ لوگ جنم لیتے تو ان کی تصنیفات ہی نہیں بلکہ ان کے گھروں کی اینٹوں کو بھی محفوظ کیا جاتا مگر ہمارے تغافل و تساہل کی یہ حالت ہے کہ سینکڑوں الحاقی کتب و دواوین ان کے نام سے منسوب ہو گئے اور ہم نے ان غلط تصنیفوں کو بھی ان عظام کا کلام سمجھ لیا۔ آج کتنی تصنیفات ہیں جو امام ابو حنیفہؒ، جابر طرطوسی، ابن قتیبہ، امام غزالیؒ۔ ابو معشر فلکیؒ، فخر الدین رازیؒ۔ بو علی سیناؒ۔ معلم ثانی، ابن عربی، محقق طوسی، ناصر خسرو، فردوسی، خواجہ حافظ جلال الدین رومی اور حکیم سنائی سے منسوب ہیں۔ اگر ان تصنیفات کو دقت نظر سے دیکھیں تو اندازہ ہو سکتا ہے کہ کس قدر کلامی اصلی اور الحاقی ہے اور ابعد کو اغلاط رواۃ و کاتبین اور سہو و التباس ناقلین یا بعض وسائس و اغراض شخصیہ و دینیہ سے ملا دیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر اس رباعی کو لیجئے:۔

من بندۂ عاصیم رضائے تو کجا ست؟   تاریک دلم نور و صفائے تو کجا ست؟
ما را تو بہشت اگر بطاعت بخشی   ایں بیع بود لطف و عطائے تو کجا ست؟

اکثر تذکرہ نویسوں نے اس رباعی کو خیام کے ترجمہ میں لکھا ہے مگر خیامیوں کو یہ سن کر تعجب ہوگا کہ یہ رباعی خیام کی نہیں ہے بلکہ سلطان ابوسعید ابوالخیر قدس اللہ سرہٗ کی ہے۔ اسی طرح شیخ جامی کے سوانح لمعات، شرح ابن فوضی وغیرہ رسائل میں جو رباعیات وحدۃ الوجود کے متعلق بکثرت درج ہیں ان کو بھی بعض ناقلین نے خیام کے نام سے منسوب کر دیا۔ تو غرض کم علمی و فقدان تحقیق و تجسس نے ہمارے ادبا اور علماء سے جو سلوک کیا وہ ہر قوم کے لئے شرم اور ندامت کا باعث ہے اور جب کبھی کسی نے قدیم علوم و فنون کی مرثیہ خوانی کی ہے تو سرزمین مشرق نے اشک شوئی کے لئے اپنے اوراق پھیلا دئے ہیں اور ع۔ ناخلف باشم اگر من بجوئے نفروشم، کی مثال ہم پر صادق آتی ہے۔

جہاں پنجاب کے احسان فراموش مسلمانوں نے علامہ اقبال مرشدی کے کلام کو پھیلانے اور پیغام کو پہنچانے میں مجرمانہ اعراض برتا وہاں بنگال کے ایک نوجوان ادیب کی یہ حسین کوشش تبریک و مبارک باد کی مستحق ہے اور اس کو جس قدر سراہا جائے کم ہے۔ چند صفحوں کی یہ مختصر کتاب الطاف کو اقبال مرحوم کے حلقۂ عشاق میں جو محبوبیت کا درجہ دے گئی وہ ابتک کسی کو حاصل نہیں ہوا۔ ار دو کتابت میں انگریزی کے الفاظ جس غلط طریقہ پر لکھے جاتے ہیں ان کا پڑھنا اور سمجھنا دشوار ہو جاتا ہے اور ترجمہ کی ساری خوبصورتی کاتب کی کم علمی اور جدت قلم سے مکمل طور پر فنا ہو جاتی ہے۔ تاہم چند اشعار بطور نمونہ پیش کئے جاتے ہیں۔

کبھی ہم سے کبھی غیروں سے شناسائی ہے ۔۔۔ بات کہنے کی نہیں تو بھی تو ہرجائی ہے

Must thou too play the fickle flirt,
With us with others day by day,
We cannot help the sinful thought
Which shame forbids our lips to say.

ے ۔

اے خدا شکوۂ ارباب وفا بھی سن لے ۔۔۔ خوگر حمد سے تھوڑا سا گلہ بھی سن لے

Hear those, o God! these sad complaints

From those of proven fealty;
From lips accustomed but to praise
Hear thou these words in blame of
Thee.

پھر بھی ہم سے یہ گلا ہے کہ وفادار نہیں ہم وفادار نہیں تو بھی تو دلدار نہیں

If our meed still the obloquy
That we have shirked the faithfuls' part,
How then canst thou make claim to be
The kindly faith-compelling heart.

طعن اغیار ہے رسوائی ہے ناداری ہے کیا ترے نام پہ مرنے کا عوض خواری ہے

Yet foemen taunted, grace-deprived
And poorest of the poor are we!
Is this thy recompense to those
Who sacrifice their lives for thee?

آئے عشاق گئے وعدۂ فردا لے کر اب انہیں ڈھونڈھ چراغِ رخِ زیبا لیکر

They came glad lovers, begging love;
With future promise turned away:
Go, shine thy beauty's lamp about.
And seek and win them if thou may!

کتاب عمدہ فیدر ویٹ کاغذ پر چھپی ہوئی ہے اور چھپائی نہایت دیدہ زیب شیخ محمد اشرف کشمیری بازار لاہور پبلشر ہیں جن کے ہاں سے میرے محترم استاد علامہ عبد اللہ یوسف علی کا ترجمہ قرآن کریم چھپ کر اپنی صوری و معنوی خوبصورتی کے باعث تحسین حاصل کر چکا ہے۔ دیباچہ چودھری غلام احمد صاحب پرویز مصنف معارف القرآن کے قلم سے ہے مگر انھوں نے دیباچہ میں اختصار سے نہیں بلکہ بخل سے کام لیا ہے اور انگریزی ترجمہ کے ساتھ اردو متن بھی نہیں دیا گیا۔ امید ہے کہ آئندہ ایڈیشن میں اس کمی کو بھی پورا کر دیا جائیگا۔ بعض توضیح طلب اصطلاحات کی تشریح مصنف کی بنت عم پروفیسر پرشین لیڈی برابوان کالج کلکتہ نے کی ہے۔ اور یہ ترجمہ بھی جیسا کہ دیباچہ سے عیاں ہے ان ہی تحریک و تشویق سے بروئے کار آیا عربی کے بہترین دواوین بنت عم کی تحریک کے ممنون رہے ہیں۔ خوشی کا مقام ہے کہ ہندوستان کی ایک بنت عم کی تحریک و توجہ سے اقبال کو فیز جیرالڈ میسر آگیا اور یہ ہمارے مستقبل کے لئے نیک فال ہے۔ ہمارا جناب الطاف حسین صاحب سے تقاضا ہے کہ وہ علامہ مرحوم کی دیگر تصنیفات کا ترجمہ کر کے نیازمندان اقبال کو مزید تشکر کا موقع بخشیں کیونکہ شکوہ و جواب شکوہ کے ترجمہ نے ہمارا یہ خیال قوی کر دیا ہے کہ یہ سعادت اُن کے حصہ میں لکھی ہے اور وہی بطریق احسن سرانجام دے سکتے ہیں۔ اس کتاب کی قیمت صرف دو روپیہ ہے جو ان محاسن کے اعتبار سے بہت ہی کم ہے۔

غزل

بامداداں کہ صبا زلف تو برہم افگند ... ربط شیرازۂ عالم ہمہ از ہم افگند
طور شد گوزۂ خاکستر و موسیٰ بیہوش ... حسن یک صاعقہ افگند ولے کم افگند
پاکبازان ہدف تیر ملامت باشند ... بخت بد تہمتے بردامن مریم افگند
جائے فریاد نباشد ز ستمگاری او ... زخم خود داد و خود پنبہ و مرہم افگند
من نخواہم دیت خویش ز قاتل مسلمؔ ... در ملتی عمر مرا دست فلک سم افگند

مسلم

نقد و نظر

جناب عطارد صاحب

مولوی عبدالقیوم صاحب باقی کی نظم زیر عنوان "پھول اور کانٹے" مندرجہ خصوصی اشاعت اخبار میزان کے دو حصے ہیں نمبر۱ نمبر۲ - پہلے نمبر۱ کے نو اشعار پر جو شبہات وارد ہو رہے تھے وہ رسالہ شہاب بابتہ ماہ دی ۱۳۵۴ف میں عرض کئے گئے آج کی صحبت میں نمبر۲ کے نو اشعار پیش کئے جاتے ہیں -

آج کل کی جدید شاعری پر کہنے کی تو بہت گنجائش ہے مگر کہیں کس سے اور یہ دل کو لگی سنائیں کس کو - ہر شخص زبان دان اور شاعر شیوا بیان ہونے کا مدعی ہے - طبیعت فطرتاً موزوں ہو تو شعر کہنا چنداں مشکل نہیں لیکن محض کلام منظوم پر شعر کی تعریف صادق نہیں آتی - شعر کی بنیاد تخیلی اور محاکات پر ہے - حسن بیان اور لطف زبان - بندش کی خوبی اور طرز ادا کی دل آویزی محاسن شعری ہیں لفظ تخیل سے غلط فہمی پیدا نہ ہونی چاہیئے - شاعری میں تخیل سے مراد قوت اختراع ہے - ماہران فن اور ارباب سخن ہی تصفیہ کر سکتے ہیں کہ کس کا شعر اور کونسا شعر اس معیار پر پورا اترتا ہے - سہو یا غلطی مقتضائے بشریت بھی ہے اور دلیل ناواقفیت بھی - ایک اپنے عیوب سے مطلع ہو کر اصلاح کی سعی کرتا ہے دوسرا اصرار ع عیبے بہ عیبجو د نہ رسیدن نمی رسد -

نمبر۲

زبان زندگی یہ ہے اثر مرے شباب کا — تلاطم اک سوال کا تبسم اک جواب کا
میں رہنما نہ ہو سکا ہر اک خیال و خواب کا — مگر مرا علم ہوا نشان انقلاب کا
جو میرا آشنا ہوا وہ پھول بن کے رہ گیا — جو مجھ سے دور ہو گیا وہ بھول بن کے رہ گیا

ان اشعار کا کوئی ذیلی عنوان نہیں مگر معلوم ہوتا ہے یہ بھی پھول ہی سے متعلق ہیں - اور ضمیر متکلم کا استعمال پھول کے واسطے ہوا ہے - مصرعۂ اولیٰ میں "زبان زندگی" استعارہ ہے زندگی کو اک شخص فرض کر لیا اور اس کیلئے زبان بھی تجویز کی گئی فارسی میں ایسی اضافتیں کثیر الوقوع ہیں مثلاً

استخوان خیال بہ معنی استخوان شخص خیال ۔

بتوصیف خان جہان نو ال کنم مغز در استخوان خیال

اُردو میں ایسی اضافتوں سے احتراز اولیٰ ہے۔

پھول کا یہ کہنا کہ میرے شباب کا اثر زبان زندگی (زبان شخص زندگی) پر ہے کوئی معنی نہیں رکھتا۔ زبان پر ذائقہ کا اثر رہ سکتا ہے نہ کہ شباب کا زبان زندگی پہ ذکر ہے کہتے تو مصرعہ بامعنی ہوتا۔ مصرعہ ثانی بھی منت پذیر معنی نہیں امواج کے باہم ٹکرانے کو تلاطم کہتے ہیں بطور مجاز کسی چیز کی کثرت سے بھی عبارت ہے ۔

چو برخاک افگند جودش تلاطم برد بر گنج قارون حسرت انجم

پس ایک سوال کا تلاطم اور ایک جواب کا تبسم دونوں غلط۔ تیسرا مصرعہ بھی حامل معنی نہیں "خیال وخواب" کو پھول کی رہنمائی کیسی خیال وخواب کسی کی رہنمائی کے محتاج تو نہیں ہوتے یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کے ثبوت کی ضرورت نہیں۔ چوتھے مصرعہ میں "مراعَلَم" سے کیا مراد ہے علم بفتحتین کے اصلی و مجازی کوئی معنی بھی یہاں چسپاں نہیں۔ آخر پھول کا علم کس کو قرار دیا گیا ماقبل یا مابعد کسی مصرعہ یا شعر سے کنایتاً اشارتاً اوس کے وجود کا ثبوت نہیں ملتا۔ لفظ "انقلاب" کا بھی یہی حال ہے محض اجتماع الفاظ اور بے معنی ادعا کے سوا اور کچھ بھی نہیں۔ ٹیپ کے شعر میں "پھول بن کے رہ گیا"، کے ہم یہ معنی فرض کر لیتے ہیں کہ پھول کی عطریت سے پھول کا آشنا بھی معطر ہو جاتا ہے حالانکہ لفظ "آشنا" کا یہاں استعمال بے محل ہے دوسرا مصرعہ باعتبار محاورہ زبان مہمل ہے اردو میں بانے تازی سے "پھول بن کے رہ گیا" ایک بے معنی جملہ ہے۔ پھول اور کانٹے کی داستان ختم ہو گئی۔ اب شاعر کی زبانی شاعر کے حالات ملاحظہ ہوں ۔

شاعر

مجھے ملے ہیں پھول بھی مجھے ملے ہیں خار بھی
میں اک نشاط جبر بھی میں درد اختیار بھی

میں ایک شادمان بھی میں ایک دل فگار بھی
جفائے آسمان بھی ہوں وفائے روزگار بھی

سکون دل مجھے ملا ہے روح بیقرار سے
شہید زندگی ہوں میں اسی کی ذوالفقار سے

پہلا مصرعہ صاف ہے دوسرے کی ترکیب عجیب و غریب واقع ہوئی ہے۔ اپنے آپ کو "نشاط جبر"

اور "درد اختیار" کہنا مہمل ہے۔ "ایک شادمان ایک دلفگار" میں لفظ "ایک" تو برائے بیت ہے مگر شادمان کی نون کا اعلان ذوق سلیم پر گراں گزر رہا ہے۔ شاعر اپنے آپ کو جفائے آسمان اور وفائے روزگار قرار دے رہا ہے اس کی وجہ تو شاعر کے ذہن میں کچھ ہو گی مگر "میں جفائے آسمان ہوں" کے معنی از آسمان جفاکشیدہ ہوں نہیں ہوسکتے۔ آسمان کی صفت دغاباز۔ سنگدل۔ جفاکار۔ کج رفتار۔ ستیزہ کار وغیرہ مشہور ہے بحالت موجودہ "میں جفائے آسمان ہوں" کا مطلب یہ ہوا کہ میں مجسمہ جفائے آسمان ہوں۔ اسی طرح وفائے روزگار ہوں بھی بے معنی ہے۔ روزگار بہ معنی زمانہ۔ زمانہ کی صفت باوفا نہیں وہ تو بیوفا۔ سفلہ اور کمینہ مشہور ہے۔ روح یعنے جان اگر جان بیقرار ہے تو دل کو سکون کیسے نصیب ہوسکتا ہے یہ غلط مفروضہ ہے "شہید زندگی" کے اس مصرعہ میں تو کوئی معنی نہیں۔ " اوسی کی ذو الفقار" سے کس کی ذو الفقار مراد ہے ضمیر "اوسی" کا مرجع روح ہے تو روح کی ذو الفقار کسے کہتے ہیں غرض یہ شعر مضحکہ خیز لفظوں کا مجموعہ ہے۔

ہو شعلہ بار زندگی تو مرحبا جنون مرا — اچھل رہا ہے ہر طرف حیات بن کے خون مرا
سکون و درد اگر ملے تو یہ بھی اک فسون مرا — پکارے ہائے ہائے دل ہمیشہ ارغنون مرا
یہ مد و جزر ہے عطا جہان بے ثبات کو — رہیں گے یاد میرے دن ہمیشہ کائنات کو

زندگی کو "شعلہ بار" کس مناسبت سے کہا گیا کچھ نہیں کھلتا۔ مرحبا کا لفظ کچھ عجیب طرح استعمال ہوا ہے۔ پہلا مصرعہ جملہ شرطیہ ہے اور حرف شرط محذوف اس مصرعہ کی نثر یہ ہو گی۔ اگر زندگی شعلہ بار ہو تو میرا جنون مرحبا ہو گا۔ ظاہر ہے کہ یہ جملہ بے معنی ہے اگر اس مصرعہ کے یہ معنی فرض کئے جائیں کہ اگر زندگی شعلہ بار ہو تو میرے جنون کو خوش آمدید کہا جائیگا تو اس حالت میں بھی اوس کے مہمل ہونے میں کوئی فرق پیدا نہیں ہوتا۔ کیا شعلہ بار زندگی مورث جنون ہوتی ہے یہ ایک حل طلب معمہ ہے۔ شاعر کا خون فقط جسم میں نہیں بلکہ ہر طرف اچھل رہا ہے بفرض غلط ہر طرف سے اطراف جسم مراد ہو تو اس میں ندرت ہی کیا ہے۔ خون اچھلنا اردو کا محاورہ نہیں۔ "خون" کی نون کا گلا دبا کر فصاحت کا خون کر دیا گیا۔ حیات ضد ممات۔ خون اور حیات میں لازم و ملزوم کی نسبت ہے۔ خون ہے تو حیات بھی ہے یا حیات ہے تو خون کا وجود بھی ہے پس خون کا حیات بن کے اچھلنا کیا بلحاظ معنی و مفہوم کیا باعتبار محاورہ زبان صحیح نہیں۔

تیسرے مصرعہ میں فعل "ملے" کا مفہوم "سکون و درد" ہے لیکن مفعول بعید یعنی جس کو سکون و درد ملا اوس کا کہیں ذکر نہیں۔ "سکون و درد" ملنا تو شاعر کی فسوں کاری ٹہیری تو پھر شاعر کا ارغنون ہائے ہائے دل کیوں پکار رہا ہے آخر اس کی کوئی وجہ۔ ارغنون ایک باجے کا نام ہے لیکن "میرا ارغنون" کہہ کر ایک تخصیص پیدا کی گئی جس سے یہ ثابت ہو رہا ہے کہ ارغنون شاعری کے لوازمات میں سے ہے جیسا کہ گوئیے کے لئے تنبورہ۔ ارغنون کے ساتھ فعل پکارنا کا استعمال صحیح نہیں کیا اردو میں ستار پکارتا ہے رباب پکارتا ہے کہہ سکتے ہیں؟ جاہل دیہاتی ستار پکارتا ہے ارغنون پکارتا ہے کہیں تو عجب نہیں مگر کوئی تعلیم یافتہ ایسا نہیں کہتا۔

ٹیپ کا شعر بھی مہمل ہے "عطا" کا فاعل کون ہے مدو جزر اگر سکون و درد کیواسطے مشبہ بہ ہیں تو دونوں میں وجہ شبہ کی کوئی گنجائش نہیں۔

یہ نظم تو یہاں ختم ہوگئی لیکن مجھے ایک بات اور عرض کرنی ہے پہلے بھی بارہا عرض کر چکا ہوں کہ جس شعر میں اثر نہ ہو یا جو شعر جذبات کو برانگیختہ نہ کرسکے اوس کو شعر کہنا ہی غلط ہے شعر میں واقعیت کا اثر پیدا کرنا ہی شاعر کا بڑا کمال ہے یہ خوبی انتخاب الفاظ پر موقوف ہے۔ اسی سے ناممکن کو ممکن بنا کر پیش کیا جاسکتا ہے لیکن افسوس یہ ہے کہ آج کل اسی سے بے اعتنائی برتی جاتی ہے الفاظ کا انتخاب محض وزن شعر کی خاطر ہوتا ہے اس پر مطلق غور نہیں کیا جاتا کہ ترتیب و تناسب الفاظ سے وہ اثر بھی پیدا ہو رہا ہے یا نہیں جن جذبات کے تحت شعر موزوں کیا جارہا ہے اس غلط طریق عمل کا نتیجہ یہ ہے شعر بے معنی بلکہ بعض دفعہ مضحکہ خیز الفاظ کا مجموعہ ہو جاتا ہے۔

یہ خبر نہایت اندوہناک ہے کہ محترم خواجہ محمد عباد اللہ صاحب اختر امرتسری کی اہلیہ نے ایک طویل علالت کے بعد انتقال کیا۔ انا للہ

خدا مرحومہ کو جنت نصیب کرے اور اون کی دو صاجزادیاں اور صاجزادو کو صبر کی توفیق عطا فرمائے۔ 'صبر کرتے ہی بنے گی غالب'

کیونکہ اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصّٰبِرِیْن ؁

"ایامِ جاہلیت"

جناب خواجہ محمد عباد اللہ صاحب اختر بی اے (امرتسری)

(بسلسلہ گذشتہ)

عدی کو معلوم ہوا تو چپکے سے نفرو ہو گیا، جذیمہ نے تلاش میں اِدھر اُدھر گھوڑے دوڑائے لیکن کہیں سراغ نہ ملا۔ بعد انقضاء ایام حمل رقاش کے بطن سے ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام "عمرو" رکھا گیا، جذیمہ کی اپنی اولاد نہ تھی اس لئے اسے متبنی بنا لیا۔

جذیمہ کی عشرت کا ایک حصہ تو ہاتھ سے جاتا رہا، اب دوسرے کی فکر ہوئی "عمرو بن الظرب" سے نائلہ کا مطالبہ کیا، عمرو کو غالباً انکار کی کوئی وجہ معقول نہ تھی۔ جذیمہ شادی کا خواستگار تھا، لیکن نائلہ نے ٹکا سا جواب دیا۔ جذیمہ ایک تو عمر میں بڑا تھا۔ دوسرے "برص" کا مرض تھا اور برص کو لوگ بہت معیوب خیال کرتے، چونکہ اس میں اور خوبیاں بہت تھیں، اس لئے لوگوں نے اس کی کنیت "ابو دفیاح" رکھی تھی، جب جذیمہ کو جواب صاف مل گیا تو لڑائی ناگزیر امر تھا چنانچہ کچھ عرصہ معرکہ آرائی ہوتی رہی، آخر ایک لڑائی میں عمرو بن حرب مارا گیا۔ جذیمہ کی جوانمردی نے گوارا نہ کیا کہ نائلہ پر بزور قبضہ کرے، اس لئے مظفر و منصور حیرہ میں واپس آ گیا۔ چند سال کا عرصہ گزر گیا لیکن جذیمہ اپنے ارادہ کا پکا تھا۔ شادی کا پیغام برابر بھیجتا رہا۔ اس وقت نائلہ باپ کی جگہ حکمران تھی اور اب ملکہ "الرباء" کے نام سے مشہور تھی۔ وہ نام و پیام میں جذیمہ کو ٹالتی رہی اور در پردہ اپنے باپ کے خون کا بدلہ لینے کے لئے تیاری میں مصروف تھی۔

قصاص کا جذبہ ہر ایک عرب کے دل میں اتنا زوروں پر تھا کہ وہ خاندان بلکہ تمام قبیلہ ذلیل سمجھا جاتا جو بدلہ لینے کی سکت نہ رکھتا یا قصاص سے دست بردار ہو جاتا۔ قصاص سے بچنے کا ایک اور طریقہ یہ تھا کہ مقتول کے ورثاء "دیت" یعنی خون بہا منظور کر لیتے، دیت سو اونٹ تک ہوتی، اور اگر بادشاہ مارا جاتا تو ہزار اونٹ، لیکن دیت کا قبول کرنا نہایت معیوب خیال کیا جاتا اور اگر دونوں فریق کسی طرح دیت پر رضامند ہو جاتے تو میدان میں نکل کر آسمان کی طرف تیر پھینکتے، اگر تیر خون آلودہ واپس آتا تو سمجھا جاتا کہ آسمانی فیصلہ یہی ہے کہ

خون کا بدلہ خون ہے، لیکن تیر ہمیشہ جیسے کے تیسے گرتے اس لئے آسمانی فیصلہ پر دونوں رضامند ہو کر مقتول کے ورثاء دیت قبول کر لیتے، یہ تجویزیں ملامت سے بچنے کے لئے اختراع کیگئی تھیں البتہ اگر مقتول کے ورثاء بدلہ لینے کی قدرت رکھتے ہوئے ایسے قتل کو معاف کر دیتے جو قتل عمد نہ ہوتا تو یہ کام بڑی عالی حوصلگی کا سمجھا جاتا۔ اور اگر قاتل کا پتہ نہ ہوتا تو جن پر جن پر شبہ ہوتا تو اس کو یا ان کو "ابین القداح" کے پاس لے جاتے جو ایسے امور میں فیصلہ کر دیا کرتا، فیصلہ کا یہ طریق تھا کہ وہ پانسے ڈالتا، ایک پر "عقل" لکھا ہوتا، اور دوسرا سادہ ہوتا اگر عقل والا پانسا نکلتا تو مشتبہ پر دیت واجب ہو جاتی، اور اگر سادہ پانسا نکلتا تو وہ بری الذمہ ٹھیرایا جاتا۔ "ابین القداح" کعبہ کا متولی اور عرب کے ہر کاہن اور کاہنہ کا حاکم ہوتا۔ ایسے اہم امور کے تصفیہ کے لئے مشہور مقامات بھی تھے جن میں سے کعبہ کو امتیاز حاصل تھا عرب کا ملک الشعراء "امراء القیس" کا باپ مارا گیا، لیکن قاتل معلوم نہ تھا جس پر شبہ تھا، اسے "ذی الخلصہ" پر لائے اور پانسا ڈالا گیا اور سادہ نکلا شاعر جھلا اٹھا اور اس نے اس بت کو مغلظ گالیاں دیں اور ایک تھپڑ مار کر کہا۔

"لو کنت یا ذی الخلص المو تو را لم تنه عن قتل العداة زورا"

"اے ذی الخلصہ اگر میری طرح تجھے بھی صدمہ پہنچا ہوتا تو فریب دے کر دشمنوں کے قتل سے منع نہ کرتا"

اگرچہ عمرو بن حرب لڑائی میں مارا گیا تھا لیکن نائلہ کے دل میں انتقام کی آگ بھڑک رہی تھی۔ جب عدی کا بیٹا بڑا ہوا تو اپنے باپ کے حسن اور شکل و شمائل سے بہت ملتا جلتا تھا، جذیمہ اس کی تعلیم و تربیت میں کوشش کرتا رہا، عمرو بن عدی کو معلوم ہوا کہ جذیمہ اس کا باپ نہیں ماموں ہے، وہ والدہ کو بھی اکثر روتے ہوئے دیکھتا، ایک روز اس نے والدہ سے دریافت کیا کہ کیا وجہ ہے کہ تم اکثر غمگین رہتی ہو، پہلے تو اس نے ٹالا لیکن آخر عدی کو تمام ماجرا کہہ سنایا، عمرو نے کہا کہ میں اپنے باپ کو اگر وہ زندہ ہے ضرور تمہارے پاس لاؤں گا اور اگر وہ مارا گیا ہے تو اس کا بدلا لوں گا، اور اگر وہ مر گیا ہے تو پھر بھی اوس کی خبر دوں گا، عمرو اس کے بعد اسی ادھیڑ بن میں رہنے لگا، اور کبھی کبھی گھر سے غائب ہو جاتا اور "عرب بادیہ"

یعنی ان قبیلوں میں پھرتا رہتا جو بادیہ نورد خیموں میں زندگی بسر کرتے ہیں، اہل حیرہ میں یہ مشہور ہوگیا کہ اس پر کوئی جن یا پری عاشق ہے جو اسے اڑا کر لے جاتی ہے۔ جذیمہ نے بہت جھاڑ پھونک سے کام لیا۔ عزیمت خوانوں سے بہت کچھ پڑھ کر دم کیا اور آخر "تنجیس" جو آخری علاج ہے کیا، یعنی مردہ کی پرانی ہڈیاں اور نجس کپڑے مریض کے گلے میں ڈالتے اور خیال کرتے اس سے بھوت پریت کا آسیب دور ہوجاتا ہے، مگر عمرو کو اس سے کچھ فائدہ نہ ہوتا تھا اور نہ ہوا۔ شروع میں جذیمہ عمرو کے گم ہونے پر بہت پریشان ہوتا، لیکن جب وہ واپس آجاتا تو اسے یقین ہوگیا کہ پریاں اسے ضرر نہ پہنچائینگی لیکن ایک دن عمرو ایسا غائب ہوا کہ عرصہ تک نہ لوٹا۔ جذیمہ اندھے کنوؤں میں جھانکتا تو گونج کی آواز سے تسلی ہوئی کہ خود واپس آجائے گا۔ یہ بھی جاہلیت کی ایک رسم تھی کہ مفقود الخبر کا نام تین دفعہ لیکر کنوئیں پر جھک کر آواز دیتے، اگر گونج کی آواز نہ آتی تو سمجھتے کہ واپس نہیں آئیگا۔ چنانچہ ایک شاعر کہتا ہے

وکم نادیتہ واللیل ساج　　　مبادی السئابر فما اجابا"

"راتوں کو میں نے ایسے پرانے اور اندھے اور گہرے کنوئیں پر پکارا، جواب نہ دیا۔"

جذیمہ نے یہ بھی اعلان کر دیا کہ جو شخص عمرو کو صحیح وسلامت لے آئیگا، منہ مانگی مراد پائیگا۔ اس کی ماں کو پہلے تو اس کے باپ کی جدائی کا سخت صدمہ تھا۔ اگرچہ اسے معلوم تھا کہ بیٹا کسی مہم پر گیا ہوا ہے۔ لیکن دل بیقرار ہورہا تھا، عمرو اب بنوایاد میں آیا۔ اسے یقین تھا کہ باپ کا سراغ یہاں ہی ملے گا، اور اگر یہاں نہ ملا تو کہیں نہیں مل سکتا، وہ ایک "مصنف" یا مہمان سرا میں آیا۔ یہاں چند آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ اجنبی نوجوان کو دیکھ کر نہایت عزت و احترام سے حسب دستور بٹھایا، اور اس کے بعد کچھ سرگوشی کرنے لگے، ایک نے کہا کہ کتنا حسین ہے، بالکل ہمارے عدی کی صورت ہے، اس عمر میں وہ بھی ایسا ہی تھا۔ دوسرے نے کہا کہ آؤ اس کا حسب نسب دریافت کریں تیسرے نے کہا بہت بری بات ہے۔ پہلے خاطر و مدارات تو کر لو، اول طعام بعدہ کلام، چنانچہ رسمی مرحبا و اہلاً وسہلاً کے بعد طعام کی دعوت دی، عمرو نے کہا کہ اے بنوایاد تم نے مجھے نہیں پہچانا۔ میں جذیمہ کا بھانجا اور آل نصر سے عدی کا بیٹا ہوں، میرا باپ مفقود الخبر ہے اور مجھے یقین ہے تم جانتے ہو کہ وہ کہاں ہے۔ بیس تمہارا مہمان ہوں لیکن تمہاری دعوت اسی حالت میں قبول کر سکتا ہوں جب تم

میرے باپ سے مجھے ملاؤ یا اس کا صحیح صحیح پتہ دو، وہ سب ایک دوسرے کا منھ دیکھنے لگے۔ جب انہیں یقین ہو گیا کہ یہ نوجوان عدی کا ہی بیٹا ہے تو عدی کو خبر کی۔ باپ کی خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی، وہ آیا اور عمرو نے پہلی نظر میں پہچان لیا کیونکہ اس کی والدہ نے حلیہ بتا دیا تھا، دوڑ کر "میرا باپ" کہتے ہوئے گلے سے لپٹ گیا، باپ بھی "میرے بیٹے" کہہ کر پیار کرنے لگا، خوشی کے آنسو دونوں کی آنکھوں میں تھے۔

چند روز عمرو اپنے باپ کے پاس رہا والدہ کا خیال آیا تو باپ سے کہا کہ میرے ساتھ چلو، عدی نے کہا کہ بیٹا ابھی میرا جانا مناسب نہیں تم پہلے اپنی والدہ کو خبر کرو، پھر جذیمہ سے اجازت لو، اس کے بعد مجھے اطلاع دو۔ عمرو نے بھی دور اندیشی سے کام لیا، اور دو شخصوں کی معیت میں جذیمہ کے پاس واپس آ گیا، ان لوگوں کو حسب وعدہ جذیمہ نے منھ مانگی مراد دی۔

جذیمہ نے آخر اتنے سال انتظار کے بعد ملکہ "الزباء" کو شادی کا پیغام بھیجا۔ ملکہ نے منظور کر لیا۔ اور جذیمہ کو اپنے ہاں آنے کی دعوت دی، جذیمہ کا وزیر معتمد "قصیر بن سعد" تھا وہ تاڑ گیا کہ جذیمہ نائلہ کے باپ کو قتل کر چکا ہے، اور اس کے بعد اس عرصہ میں کئی دفعہ جھڑپیں بھی ہو چکی ہیں، ضرور نائلہ اپنے باپ کا بدلا لے گی۔ اس لئے جذیمہ کو منع کیا مگر جذیمہ ارادہ پختہ کر چکا تھا اس لئے بے تکلف اپنے چیدہ سپاہیوں کے ساتھ ملکہ الزباء کے دارالسلطنت کی طرف روانہ ہو گیا، جب یہ لوگ شط فرات پر پہنچے تو قصیر نے کہا کہ ابھی کچھ نہیں گیا، لوٹ چلو۔ جذیمہ نے چین بہ جبین ہو کر کہا کہ کیا نامردوں کی سی باتیں کرتے ہو میں تمہارے مشورہ پر پہلے ہی اس لئے عمل نہیں کیا کہ ملکہ کہیں گی کہ جذیمہ ڈر گیا۔ اب جب کہ میں اس کے گھر کے دروازہ پر پہنچ چکا ہوں، کس طرح واپس ہو سکتا ہوں، قصیر نے کہا کہ اچھا ایک بات کا خیال رکھو، اگر الزباء کی فوج نے تمہیں گھیر لیا تو سمجھنا کہ اس کی نیت بخیر نہیں اور جس طرح ہو اس نرغہ سے باہر نکل آنا۔ لیکن جذیمہ نے اس کا بھی کچھ خیال نہ کیا، اب وزیر با تدبیر کو اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ عمرو بن عدی اور اپنے اور لشکر کے بچاؤ کی فکر کرے، اس نے عمرو بن عدی کو تو چند نوجوانوں کے ساتھ حیرہ کی طرف روانہ کرنے کا انتظام کر لیا، مگر جب عمرو کی تلاش کی تو اس کو لشکر میں نہ پایا، سخت پریشان ہوا، لیکن کیا کر سکتا تھا، خاموش ہو رہا۔ (باقی)

تفکر

خار میری نظر میں خار نہیں
کم نگاہی مرا شعار نہیں

موت کے بعد بھی تو جینا ہے
زندگانی پہ اختیار نہیں

بیقراری ہے زندگی میری
جس کو آٹھوں پہر قرار نہیں

اُس کی مرضی بھی کوئی مرضی ہے
جس کو مرضی پہ اختیار نہیں

شرح چھپنے لگی اناالحق کی
حق کی تلوار۔ آبدار نہیں

جلوہ گر ہے خودی مری ہر سُو
گو خدائی پہ اختیار نہیں

عہدِ حاضر کی زندگی میں بشیرؔ
غم ہر لحظہ سے قرار نہیں

بشیر النساء بیگم بشیرؔ

زبانِ اُردو

جناب مرزا سلیم بیگ صاحب وکیل ماہر تحریرات جعلی

دنیا میں زبانیں کیونکر پیدا ہوئیں - اور اونہوں نے کیونکر بتدریج ترقی پائی - اس کی نسبت محققین نے نہایت بیش قیمت معلومات بہم پہنچائی ہیں - یوروپین زبانیں ہر حصہ ملک کی جُدا ہیں - اون کا لب و لہجہ مختلف ہے - اور اون کے اشارے و تکیہ کلام علیحدہ ہیں - باوجود اس کے یوروپین زبانیں لاطینی طرز تحریر اور حروف سے مرکب ہیں - حروف کی شکلیں اور طریقہ تحریر ہر زبان کا ملتا جلتا ہے - البتہ روسی زبان میں دوچار حرف ایسے ہیں جو نئی وضع رکھتے ہیں ورنہ پوری تحریر لاطینی طریقہ کی ہے اور الٹی طرف سے سیدھی طرف کو لکھی جاتی ہے - ہمارے ہندوستان میں بھی تقریباً (۲۵۰) زبانیں بولی اور لکھی جاتی ہیں' اس کے علاوہ' اور بہت سی زبانیں ہیں جو بولی تو جاتی ہیں مگر لکھی نہیں جاتیں مستقل طرز تحریر رکھنے والی بہت سی زبانیں اپنی لکھت میں ایک دوسرے کے مشابہ ہیں اور بہت سی زبانیں ایسی ہیں جن کو بلا شبہ ہندوستان کی عام زبان کہنا چاہئے - اون میں بھی اردو کو اس لئے فوقیت ہے کہ وہ ہندوستان کے ہر گوشہ میں سمجھی جاسکتی ہے اور اردو جاننے والا ہر مقام پر اپنا کام کاج کرلیتا ہے - ہندی عام طور پر ایسی مروج نہیں ہے اردو کی نسبت ہندی کے لکھنے کی طرز تحریر بالکل مختلف ہے - اردو سیدھی جانب سے الٹی طرف لکھی جاتی ہے اور ہندی الٹی جانب سے سیدھی جانب - ہندی ہندوستان کی دوسری زبانوں گجراتی و مرہٹی کی طرح اپنا رسم الخط رکھتی ہے اور اردو اپنے رسم الخط کے لحاظ سے ان زبانوں سے مختلف ہے - اردو کے ایک رسم الخط کو شکستہ اور دوسرے کو نستعلیق کہتے ہیں - شکستہ اردو عام طور پر لکھنے میں آتی ہے اور نستعلیق خط کتابت وطباعت کے کام آتا ہے - اردو کا طرز تحریر فارسی سے ملتا ہے جس طرح یوروپین زبانوں میں طباعت کا رسم الخط ہاتھ سے لکھی جانیوالی تحریروں سے مختلف و قابل امتیاز ہے اسی طرح اردو اور ہندوستان کی بہت زبانوں میں یہی صورت امتیاز ہے - اردو نستعلیق کی کتابت کے بعد لیتھو میں طباعت ہوتی ہے - کیونکہ بدقسمتی سے اردو کیلئے کوئی

ٹائپ ایسا ایجاد نہیں ہوسکا ہے جو تجارتی
اصول پر نستعلیق رسم الخط کی خوبیوں کو برقرار
رکھ سکے۔ اُردو رسم الخط نے فارسی کے گہوارہ
میں پرورش پائی، اور وہی شکل وصورت اختیار
کرلی۔ حالانکہ اردو کی جنم بھومی ہندوستان ہے
اور بھاشا ہندی و فارسی کے میل سے پیدا
ہوئی ہے۔ آپ ذرا غور کرکے دیکھیں تو معلوم
ہوگا کہ ہر حصہ ملک کی گو زبان اور لکھت مختلف ہے
مگر اوس میں بہت سی خصوصیات مشترک پائی جاتی
ہیں ہندی لکھت گجراتی سے۔ گجراتی مرہٹی سے۔
کنڑی لکھت تلنگی سے۔ تلنگی تامل سے۔ تامل سنہالی
سے، اور سنہالی لکھت برمی سے ملتی جلتی شکل و
شباہت اور روش تحریر رکھتی ہے۔ بالکل اسی
طرح اردو شکستہ تحریر ہندوستان کے ہر صوبہ
اور ہر گوشہ میں بولی و لکھی جاتی ہے۔ مگر آپ کو
ذرا سا غور کرنے پر معلوم ہو جائیگا کہ صوبہ یُو۔
پی۔ کی جو شکستہ تحریر ہے وہ کچھ دلّی والوں
سے مختلف ہے۔ دلی والے شکستہ اردو جس طرح
لکھتے ہیں اوس سے پنجاب والوں کی تحریر میں
اختلاف ہوتا ہے۔ پنجاب اور حیدرآباد دکن
کی طرز تحریر میں ایک نمایاں امتیاز ہوتا ہے،
در اصل ہوتی تو وہ اردو شکستہ ہی ہے۔ مگر
بعض حروف کی کششیں۔ بعض حروف کا اتصال
بعض حروف کا دوسرے حروف سے وصل ہر
حصہ ملک کا جدا ہوتا ہے، جو بہت معمولی سے
غور کرنے پر معلوم ہو جاتا ہے۔ اور لطف یہ ہے
کہ روش تحریر میں ہی اختلاف نہیں ہوتا بلکہ
اردو بولنے والے ہر صوبہ کے اپنا خاص تلفظ
رکھتے ہیں اور بعض بعض جملوں کو خاص خاص
انداز میں ادا کرتے ہیں۔ بعض بعض محاوروں
کا محل استعمال ہر صوبہ میں مختلف ہے۔ یہ تو
ہوا، اردو بولنے اور لکھنے والوں کا انداز مگر
ایک ہندوستانی انگریزی تعلیم یافتہ جس نے
ہندوستان کے کسی گوشہ میں تعلیم پائی ہو
اوس کی انگریزی روش تحریر ویسی ہی ہوگی
جیسی کسی انگریز کی۔ کسی انگریزی تحریر کو دیکھکر
یہ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ تحریر کسی ہندوستانی
کی ہے یا انگریز کی۔ مگر اردو روش تحریر پر
قریب قریب یہ امتیاز کیا جاسکتا ہے کہ یہ
روش تحریر فلاں صوبہ کی معلوم ہوتی ہے۔

انگریزی زبان کے لئے مختصر نویسی کا
ایک خاص طریقہ اور علم قرار دیا گیا ہے تاکہ
کسی شخص کی تیز سے تیز تقریر کو بھی قلم بند
کیا جاسکے۔ مگر اردو اپنی ابتدا ہی سے اختصار
نویسی کی حامل ہے۔ کوئی تیز لکھنے والا منشی
شکستہ اردو میں کسی شخص کی تقریر کو اتنا ہی

جلد قلم بند کر سکتا ہے جتنی جلد کہ انگریزی کی تقریر
کو۔ یہ ضرور ہے کہ ہر شخص اردو اتنی جلد نہیں لکھ سکتا
مگر عادت اور مشق کرنے کے بعد تقریباً وہ مختصر
اور زود نویس ہو سکتا ہے۔ اردو میں حروف
کی شکلیں جو ایک دوسرے سے ملتی ہیں اتنی مختصر
ہیں کہ صرف ایک شوشہ یا معمولی کشش سے
الفاظ اور الفاظ سے جملے بناتی چلی جاتی ہیں
شکستہ اردو مختصر لکھی بھی جاتی ہے اور اپنا
حسن بھی پیدا کرتی جاتی ہے۔ اردو کا رسم الخط
جتنا پاکیزہ اور خوبصورت ہے یا اوس میں
جو معنوی خصوصیات اور وہ خصوصیات حسن
کو دوبالا کرتی ہیں وہ کسی اور زبان میں نہیں
ہیں۔ اگر اردو تحریر کو نستعلیق رسم الخط میں لکھا
جائے اور اس کے قواعد و اعراب کا خیال
رکھا جائے تو وہ اس قدر حسین اور جاذب نظر
تحریر ہوتی ہے کہ شاید ہی کسی زبان کی تحریر
اوس کی مثال پیش کر سکے۔ شکستہ تحریر بھی
ایک خاص خصوصیت کی حامل ہوتی ہے اور
اوس کو زود قلم منشی نہایت خوبصورتی سے
لکھتا چلا جاتا ہے۔ ہندوستان میں اردو کے
بعد کنڑی اور پھر تلنگی رسم الخط کا درجہ ہے جو
اپنے دائروں اور کششوں کی وجہ سے یکساں۔
ہموار اور حسین ہوتی ہے۔ ان زبانوں کی
تحریر کا بھی ایک معیار ہوتا ہے۔ جو مقررہ قواعد
اور اصول اردو نستعلیق کے ہیں اوسی طرح
ان زبانوں کے رسم الخط کے بھی مقررہ قواعد ہیں۔
ہے دراصل یہ کہ اردو تحریر شکستہ ہو
یا نستعلیق اپنی طرز تحریر میں خاص امتیاز اور
فوقیت رکھتی ہے۔ اردو بولنے والا ہندو ہو
یا مسلمان اپنے طرز تکلم میں خاص لطافت اور
شیرینی رکھتا ہے۔ اردو تحریر سے شائستگی،
لطافت و نرمی پائی جاتی ہے۔ اور اردو بولنے
والا مہذب۔ مودب۔ منکسر معلوم ہوتا ہے۔
اردو میں رنج و غم۔ غیظ و غضب اور شرم و انکسار
کے لئے جس طرح الفاظ جدا ہیں اوسی طرح
اون کا طرز ادا بھی جدا ہے۔ اردو زبان میں
رزم و بزم کی جتنی خوبیاں پائی جاتی ہیں وہ
ہندوستان کی کسی اور زبان میں نہیں ہیں۔

عموماً تبدیل تبدیل مقام سے دفتر کو
مطلع نہیں کیا جاتا ہے جس کے سبب پرچہ آپ تک
نہیں پہنچتا اور آئندہ شکایت پیدا ہوتی ہے
اور جب پرچہ کا مطالبہ کیا جاتا ہے تو دفتر میں
کوئی پرچہ نہیں رہتا۔ اس لئے تبدیل
مقام سے اور پرچہ کے لئے اندرون (۱۵)
تاریخ مطلع کیجئے۔

ہارٹ فیل ہوگیا

زینت ساجدہ بی۔اے (آخری) حیدر آباد

منّے بھیا جانے کون سے دو ڈھائی میل کے رشتہ سے ہمارے بھائی ہوتے ہیں۔لیکن ان کی دلچسپ باتوں نے انہیں ہم سے بہت زیادہ قریب کر دیا ہے۔شاید یہ ہماری زندگی سے نکل جائیں تو ہماری یہ ہنستی کھیلتی ایسی پرمسرت زندگی ویران سرائے بن جائے۔خدا نہ کرے جو وہ کبھی ہم سے جدا ہوں۔ چھٹیاں گزارنا تو بالکل ہی مشکل ہو جائیگا۔گرمی کے سنسان وطویل، خشک اور پھیکی چھٹیاں تو ہمیں مار ہی ڈالیں گی۔خدا نہ کرے جو کبھی وہ ہم سے جدا ہوں۔

اللہ میاں نے جب سب لوگوں کو اچھی اچھی چیزیں روز ازل تقسیم کی تھیں تو خدا جانے یہ منّے بھیا کدھر رہ گئے تھے۔کہ انہیں نہ تو علم ملا نہ ہی عقل۔لیکن قربان خدا کی قدرت کے جب بعد کو یہ دکھائی پڑے تو ان کی محرومی ہی کو ان کی دلچسپ فطرت بنا دیا ہزاروں تو کیا لاکھوں ہی میں کوئی ان کا سا بھولا بھالا مسرت بخش انسان مشکل سے ملے گا۔

ابھی پرسوں ہی کی بات ہے۔منّے بھائی کے ایک دم کئی دوستوں نے تھوڑے تھوڑے وقفے سے اچانک انتقال کیا۔بڑے گھبرائے بیچارے۔کہ یا اللہ یہ ان دوستوں کو کیا ہو گیا ہے کہ بیٹھے بٹھائے سرکتے جا رہے ہیں نہ زکام نہ کھانسی۔نہ جاڑا نہ بخار۔اے لو کل اچھے بھلے تھے صبح ہی خبر آئی کہ فلاں کو "ہارٹ فیل" ہو گیا۔جانے موت کی یہ کونسی قسم ہے کہ بغیر کہے سنے چپکے سے آ جاتی ہے۔مرنا نہ ہوا بجلی کا بٹن دبانا ہوا۔کھٹ سے دبایا اور پھر اندھیر اگھپ۔بات یوں ہے کہ قیامت قریب آ رہی ہے۔پہلے شمع موم بتی اور دیپ جلتے تھے۔رات بھر جلے، صبح کے قریب آہستہ آہستہ مدہم ہوتے جاتے تب جاکے کہیں گل ہوتے۔زندگیاں بھی ایسی ہی تھیں لمبی لمبی، اور مرنے سے ادھر کئی سال نہیں تو کئی مہینے قبل معلوم ہو جاتا کہ فلاں فلاں مرنے والے ہو رہے ہیں۔

منّے بھیا سوچتے سوچتے فلسفی ہوتے جا رہے تھے۔نظر لگ گئی خدا جانے کس کی کہ

ہنستا کھیلتا دماغ سوچنے لگ گیا۔ ایک دن انہوں نے مجھ سے پوچھ ہی لیا کہ "بھئی یہ ہارٹ فیل کوسی انگریزی بیماری ہے۔ میں نے بتایا کہ دل چلتے چلتے رک جاتا ہے۔ اور زندگی ختم ہو جاتی ہے۔ بات ٹھیک سے سمجھ میں نہ آئی۔ پوچھا کچھ اتا پتا بتاؤ تو پہلی بوجھوں بھی۔" میں بھلا کیا اتا پتا بتاتی کہا تو صرف اتنا کہ انسان کمزور ہوتا جاتا ہے اور کبھی کبھی بخار بھی آنے لگتا ہے۔ کسی کا کھانسی کے ایک ہی جھٹکے سے 'ہارٹ فیل' ہو جاتا ہے۔ پڑوسن کے بیٹے کو آدھ گھنٹے قبل سے ٹھنڈا پسینہ آنے لگا تھا۔ اور سائیس کے داماد کے بائیں ہاتھ میں دو تین گھنٹے قبل سے درد ہونے لگا تھا غرض جتنے 'ہارٹ فیل' اتنی باتیں۔ بعض کو تو توبہ کا وقت بھی نہیں ملتا۔ میں نے منے بھیا کو یوں پوری تفصیل سنا دی۔ تفسیر کر دی کسی طرح اس انگریزی آیت کی۔

اس دن سے منے بھیا بہت نیک بن گئے۔ پہلے ہی وہ کون بد تھے۔ لیکن اب تو بات بات پر توبہ استغفار کا ورد کرتے۔ اٹھتے بیٹھتے کلمہ پڑھتے۔ سوتے جاگتے۔ سب سے کہا سنا معاف کراتے پہلے کبھی بیوی سے سالن میں مرچ کی کمی زیادتی پر جھڑپ ہو جاتی۔ رات میں بچہ رو کر نیند خراب کر دیتا تو اسے ایک آدھ چپت سے نواز بھی دیتے۔ مگر جب سے انھوں نے یہ سب کچھ سنا تھا بدل ہی تو گئے۔ زندگی کے چار دن ہی تو ہیں۔ موت سر پر کھڑی ہے۔ بیوی کا دل کیوں دکھاؤ۔ معلوم نہیں مہر بخشوانے کا موقع بھی ملے کہ نہیں۔ اللہ میاں قیامت میں جو "حقوق بیویاں" و "حقوق شوہراں" کی بحث لے بیٹھیں گے تو چار آدمیوں میں کرکری ہو جائے گی۔ اور بچہ کو بھی جتنے دن رہو پیار محبت سے ہی دیکھو۔ ورنہ کونسی پدرانہ شفقت یاد کرے گا۔

ہم میں سے کسی کو بھی خیال نہ تھا کہ یہ منے بھائی خواہ مخواہ سنجیدہ کیوں بنے جا رہے ہیں ان کی توند میں قہقہے مدفون کیوں ہو گئے یہی تو ایک خوبی تھی ہنسانے کی ان میں۔ خدا کا کرنا دیکھئے۔ موسم بدلا اور منے بھائی کو ذرا سی حرارت ہو گئی۔ رات بھر غافل سوئے اور بائیں کروٹ۔ صبح حرارت کے ساتھ بائیں بازو میں درد بھی محسوس کیا۔ فوراً ماتھا ٹھنکا، انھوں نے دل ٹٹولا۔ اے لیجئے غائب۔ پھر کیا تھا ہوش و حواس نو، دو، گیارہ ہو گئے، لیجئے ابھی زندہ تھے ابھی غائب۔ دل سینہ میں ہی ہوتا ہے۔ اور کسی سے سنا تھا کہ سینہ کے بیچوں بیچ نہیں ہوتا ایک طرف ہٹ کے ہوتا ہے۔ ادھر ہی ہو گا۔ لیکن اب دل کہاں قابو میں آتا ہے۔ یقیناً

'ہارٹ فیل' ہو گیا۔ ٹھنڈے پسینے چھوٹ گئے۔ ہاتھ
پاؤں میں رعشہ آ گیا۔ بازو میں اور زیادہ درد ہونے
لگا۔ آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ یہ بھی
بھلا مرنے کے دن تھے۔ جوان بیوی، پھول سا
بچہ، اب کس پر چھوڑ جائیں گے۔ معلوم نہیں
بعد کو ان کی کیا حالت ہو۔ روپیہ کی فکر نہیں۔
اب وہ کون ملازم تھے۔ موروثی مکانات کا کرایہ
اب جیسے آتا ہے ماہ بماہ آجایا کرے گا۔ لیکن
پھر بھی سودا سلف کون لائیگا۔ دیکھ بھال کون
کرے گا۔ . . . اب ایک دو منٹ میں جان نکل
جائیگی۔

گھبرا کر بیوی کو پکارا۔ وہ بیچاری باورچیخانہ
میں ناشتہ تیار کر رہی تھی۔ دوڑی آئی۔ اُس
سے کہا سنا معاف کرانے لگے۔ غریب گھبرا ہی تو
گئی۔ اے لو بیٹھے بٹھائے انہیں کیا ہو گیا
کہتے ہیں "تمہارا سہاگ لٹ رہا ہے۔ لیکن تمہیں
میرے سر کی قسم جو تم رنج کرو۔ ننھے کو لے کر صبر سے
رہنا۔ ورنہ روح کو تکلیف ہوگی۔ میں چچا میاں
کو وصیت کر دیتا ہوں کہ تمہاری خبر گیری کریں"۔
وہ حیران پوچھتی رہی یہ کیا ہو رہا ہے۔ روتے
روتے اُن کے ہاتھ سینہ پر رکھ لیا اور بتایا کہ
'ہارٹ فیل' ہو گیا۔ دل کی حرکت بھلا دیکھو کہاں
ہے۔ واقعی اس جگہ دھڑکن نہ تھی۔ انھوں نے بھی
رونا شروع کیا۔ پرسوں ہی کلائیاں بھر بھر چوڑیاں
پہنی تھیں۔ یہ کیا ہوا، اُن کے سہاگ کو۔ پڑوسن
دوڑی آئی۔ ایک بڑھیا نے سچ مچ ہاتھ رکھکر
بتائی ہوئی جگہ کو دیکھا تھا۔ دل غائب تھا۔ بھرا
گھر میدان حشر بن گیا۔ بچہ بھی رونے لگا۔ آخر
چھوکرے کو ہمارے گھر دوڑایا۔

بابا بیٹھے ناشتہ کر رہے تھے کہ منّے بھائی
کا چھوکرا دوڑ آیا۔ "میاں کو ہارٹ فیل ہو رہا ہے"۔
ہم سب سکتے میں آ گئے۔ ہو رہا ہے۔ کیا بات۔
کم بخت جلدی میں غلط بول رہا ہے۔ ہو گیا ہوگا۔
تو چل میں چل گھبرا کے سب چلے۔ ناشتہ بھی ٹھیک
سے نہیں کیا تھا۔ بھلا کسے ہوش رہتا ہے۔
چل کے دیکھا تو معلوم ہوا کہ واقعی 'ہارٹ فیل'
ہوا نہیں' ہو رہا ہے۔ سینہ پر ہاتھ ہے۔ آنکھوں
میں آنسو۔ بیوی سہاگ کی دہائی دے رہی ہیں۔
بابا نے سب کو ڈانٹ بتائی پوچھا معاملہ کیا
ہے۔ کدہر کا ہارٹ فیل؟ کیا گپ اڑائی تم لوگوں
نے۔ منّے بھائی نے۔ یعنے وصیت شروع کر دی۔
"بچہ آپ ہی کا سمجھئے۔ . . . !" کیا بکتا ہے۔ آخر
ہو گیا کیا ہے!" بابا نے پوچھا۔ انھوں نے
جواب دیا "ہارٹ فیل"۔ "ہارٹ فیل!" ہم سب کے
منہ سے نکلا۔ کہنے لگے "دیکھئے میں نے یہاں دل
دیکھا۔ بالکل خاموش ہے۔ آپ بھی دیکھ لیجئے"

جھوٹ کچھ کہتا ہوں" بابا نے دیکھا تو سینے کے سیدھے طرف اشارا کر رہے تھے، بابا کو ہنسی آگئی کہنے لگے "عقل کے دشمن دل سیدھی طرف نہیں بائیں طرف ہوتا ہے ۔ دیکھ اِدھر!" منے بھیّا نے بائیں طرف دل محسوس کیا ۔ خاصا دھک دھک چل رہا تھا ۔ رکا کب تھا ۔

ہم سب ہنس پڑے ۔ بابا کہنے لگے ۔ "اگر بفرض محال تیرا دل رک جاتا تو تو ابھی تک زندہ بھی رہتا باتیں بھی کرتا ۔ چل اوٹھ" پھر کیا بتاؤں کیسے ہم سب ہنسی کے مارے دہرے ہو ہو گئے ۔ اور کئی دن تک یہ 'ہارٹ فیل' ہم کو ہنساتا رہا ۔

اب جو سنجوگ میں چارلی کا دل سیدھی طرف پایا تو پھر سے یاد تازہ ہوگئی ۔ اور منے بھائی کی موت یاد آگئی ۔

کون کرے

(عابد رضوی حیدرآبادی)

دیدار کی جب طاقت ہی نہیں پھر خواہش جلوا کون کرے
جب دوش پہ اپنے سر نہ رہا اس زلف کا سودا کون کرے

معلوم اگر یہ ہو جائے مرنے میں رہائی ہے مضمر
مرنے کی تمنا سب ہی کریں جینے کی تمنا کون کرے

اب وہ کہاں وحشت کی ادائیں اب وہ کہاں انداز جنوں
کس کو ہے ذوقِ دشت نوردی زینت صحرا کون کرے

چھائی ہیں گھٹائیں چھانے دو پڑتی ہیں پھواریں پڑنے دو
جب زیست میں باقی کیف نہیں پھر خواہش صہبا کون کرے

کچھ پوچھ نہ ہمدم یہ مجھ سے انجام محبت کیا نکلا
اب چھیڑ نہ حسن و عشق کی باتیں غم کو تازا کون کرے

یوں کہنے لگے وہ زیر لب عابد کے سر بالیں آکر
جب مر ہی رہا ہے کشتۂ غم ایسے میں مداوا کون کرے

یہ معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا

ماجد

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالبؔ
کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بجھے

میں اور وہ بچپن کے ساتھی اور قریبی رشتہ دار تھے۔ نہ معلوم کونسی گھڑی تھی جبکہ اپنے سارے جذبات اور اپنی ساری پرخلوص محبت اس کے بارگاہ میں پیش کردی چنگاری کب لگی۔ آگ کب بھڑکی علم نہ ہوسکا۔

دن گذرتے گئے میرے خیالات کا بس ایک ہی مرکز ہوگیا۔ یہی میری تمنا تھی جس پر مسرتوں کا دار ومدار تھا۔ رنگین خواب دیکھنے میں ایک لذت حاصل ہوتی تھی۔

کبھی کبھی خیال ہوتا کہ دنیا والے کہیں گے میرا اور اُس کا کیا جوڑا۔ لیکن اس مرکز سے انحراف میرے بس کی بات تھی۔ جوڑ اور بے جوڑ کا سوال تو سماج کے ٹھیکہ دار اور دنیا والوں کیلئے ہے جو کسی کی بربادی پر اپنی مرضی کو ترجیح دیتے ہیں۔ وہ کیا سمجھ سکتے ہیں کہ احساسات اور تمنائیں کیا ہوتی ہیں۔

مستقبل کا کبھی کبھی ایک ہلکا سا تصور میرے دل ودماغ میں آجاتا لیکن وہ فوراً بھول جاتا۔ آئندہ کے خوف اور رکاوٹوں کو کیونکہ وہ ابھی بہت دور تھیں۔ اس لئے امید کی ہلکی ہلکی کرنیں بھی میرے دل کے گوشوں کو پُرنور رکھتیں اور آس بندھتی کہ آئندہ کوئی نہ کوئی راہ میرے لئے نکل جائیگی جس کو میں نے اپنا بنالیا۔ جس کے تصور میں اپنی زندگی کے بہترین لمحات صرف کئے جس کے ایک ایک لفظ پر گھنٹوں مسرت کے جھولے میں جھولا کیا۔ اگر کسی وقت علیحدگی کا تصور کرتا تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے دل کانپ جاتا۔ پھر میں اسی رنگین دنیا میں منتقل ہوجاتا اور تمام خطرات کو دل سے نکال دیتا۔ میں نے آنکھ بندھ کرکے پھر قدم اٹھایا تھا۔ اندھا بن کر اپنا سب کچھ دوسرے کے سپرد کردیا تھا۔ اس لئے رکاوٹوں سے بالکل بے خوف تھا۔

ابتداء میں آرزو ہوتی کہ دوسری جانب بھی میری اس محبت کی پذیرائی ہو، اور مجھے کچھ نہیں تو کم از کم نظر التفات ہی ملے۔

تاکہ میں اپنے آپ پر ناز کر سکوں کہ نفرت نہیں محبت ہی پیدا کر رہی ہے اور اس طرح محبت محبت سے گلے مل رہی ہے۔

میں اوس کے طرز عمل کو سمجھ نہ سکا لیکن یہ محسوس ہوتا تھا کہ میرا اخلاص رائیگاں نہیں اس کا بدل مل رہا ہے۔ اس احساس کے ساتھ ہی میں خوشی سے دیوانہ ہوجاتا۔ جب کبھی ملتا تو گھنٹوں باتیں کرنے کو جی چاہتا۔ جب علیحدہ ہوتا تو دل میں ایک خلا سا معلوم ہوتا لیکن پھر ملنے کی امید پر زندگی کے دن گذرتے اور پھر ملاقات ہوتی۔ اس طرح اکثر بلکہ ہر ہفتہ ہم ملا کرتے۔ اِدہر اُدہر کی باتیں ہوتیں۔ کسی دن باتوں کا موقع نہ ملتا تو طبیعت پر اوداسی چھا جاتی۔ گھر والے اس غیر معمولی حالت کو دیکھکر تشویش میں پڑجاتے۔ یہ ابتدائی دور تھا۔ تقریباً پانچ چھ سال اتنی طویل مدت بھی بالکل معمولی سی تھی اور محسوس تک نہ ہوسکا کہ پانچ سال گذر گئے۔ آنے والی باتوں سے میں اب بھی غافل تھا ان کو محسوس کرتا لیکن حال کو دیکھ کر اتنا خوش ہوتا کہ مستقبل کی بھیانک شکل مدھم پڑجاتی یہ ایک فطری امر تھا۔

ایک مرتبہ قدرت کی طرف سے موقع ایسا آیا کہ ہم دونوں قریب اور قریب تر ہوگئے۔ بعض حالات کے تحت اس کو ہمارے ہاں ٹھیرا لیا گیا اور ایک مدت کے لئے۔ میری مسرت کی کوئی انتہا نہ تھی۔ میں اپنے آپ کو خوش قسمت تصور کرنے لگا۔ اور سجدہ میں جھک گیا کہ میری دعائیں بارگاہ ایزدی تک پہنچ گئیں۔

تقریباً ہر وقت ملنے اور زیادہ سے زیادہ دیر تک گفتگو کرنے کے مواقع تھے لیکن طبیعت سیر نہ ہوئی، جی چاہتا تھا کہ بت کو بٹھا کے یاد خدا کروں۔

یہ قربت عارضی تھی کیونکہ ایک دن پھر علیحدہ ہونا پڑے گا اور نہ معلوم کب اور کہاں آخر وہ دن آگیا اور چند مہینوں کے بعد ہم پھر علیحدہ ہو گئے اور اس طرح علیحدہ ہوئے کہ روزانہ ملنا قطعی ناممکن ہوگیا اور یہ اس طویل فاصلہ کی وجہ سے جو ہم دونوں کے درمیان تھا اور جو بغیر ایک طویل سفر کے طے نہ کیا جا سکتا تھا وہ والدین کے پاس ملازمت کی وجہ سے وطن کے باہر تھے۔

وہ دن بھی یاد رہے گا جبکہ اسٹیشن پر میں نے اس کو خدا حافظ کہا۔ چھوڑنے کے لئے بہت دور تک ساتھ گیا۔ آخر جاتا کہاں تک واپس ہونا پڑا۔ اس کا اظہار کسی طرح آسان نہیں کئی روز تک بے اختیار آنسو بہاتا۔ دن رات اسی کا خیال مغبوذ [illegible] گھڑیاں تھیں [illegible]

ہو طرف میری نظریں دوڑتیں اور مایوس لوٹتیں نہ معلوم میں کب تک اس کشمکش میں رہتا اگر قدرت کو مجھے تاریکی سے نکالنا منظور نہ ہوتا اتفاق ایسا ہوا کہ دو ہفتہ کے اندر ہی اس کی واپسی کی خبر ملی۔ ایک مرتبہ پھر چہرہ پر رونق آگئی، آنکھیں چمکنے لگیں۔ ساری رات بے چینی میں گذری کہ کب صبح ہوگی۔ صبح ہوئی میں وقت سے بہت پہلے استقبال کے لئے اسٹیشن پہنچ گیا بھرے ارمانوں سے مکان لے آیا۔ وہ تنہا نہ تھی اور رشتہ دار بھی ساتھ تھے۔ ناشتہ وغیرہ سے فارغ ہونے کے بعد سب اپنے گھر چلے گئے۔ مجھے پھر ایک مرتبہ سب کچھ مل گیا تھوڑے دنوں تک اکثر دبشیتہ ملا کرتے۔ لیکن جلد ہی ہم پہلے کی طرح قریب تر ہوگئے۔ اتنے قریب کہ پھر روز آنہ اور ہر وقت ملنے کا موقع مل گیا۔ اپنے معبود کی بارگاہ میں پھر اپنی گردن جھکائی میرا ایمان تھا کہ یہ سب اوس کے فضل کا کرشمہ ہے اب حالات بدل رہے تھے۔ میرے سابقہ احساسات قوی سے قوی تر ہوتے گئے تمام رکاوٹیں جن کا اندیشہ اور جن سے بچنے کی میں کوشش کرتا تھا، اب ان سے مقابلہ کے لئے پوری توانائی سے آمادہ تھا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ میرے حق میں قدرت ہی کی طرف سے یہ تحفہ ملا ہے۔ اس کی حفاظت کے پورے سامان مہیا کر لینا میرا فرض ہے۔

اس خیال سے ہی کہ مجھے آگے بڑھنا ہے۔ ہیبت سی ہوتی اور یہ ہیبت محض اس خیال سے کہ اگر میرا قدم ناکام پڑا۔ میری منزل ادھوری رہ گئی۔ تو کیا ہوگا؟ کیسی رسوائی ہوگی۔ عمر بھر کے لئے ایک داغ رہ جائیگا اس قسم کے خیالات سے میں سہم جاتا۔ لیکن کوئی طاقت تھی جو مجھے آگے ڈھکیل رہی تھی، میں نے آگے بڑھنے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ اب وقت اور موقع کا متلاشی تھا۔

دن یوں ہی گذرتے رہے۔ وہ اور میں ایک ہی ساتھ رہتے۔ اس کی رفاقت سے مجھے انتہائی سکون حاصل تھا۔ میں اپنی چھوٹی دنیا میں کھویا ہوا تھا۔

محبت سے مجبور تھا کیونکہ یہ اپنے ہاتھوں اٹھائی ہوئی دیواریں نہ تھیں جس کو بہ آسانی مسمار کر سکتا۔ یہ وہ پاک جذبہ تھا جو قدرت کی طرف سے میرے دل میں ودیعت ہوا تھا۔

شاید میرے اس جذبہ کو دیوانگی سے تعبیر کریں مگر ذرا ان عقل کے ٹھیکہ داروں سے پوچھیں کہ ماں باپ کی محبت بھائی بہن کا پیار، میاں بیوی کی الفت، بچوں کا درد و غم آخر یہ سب کچھ کیا ہے؟ (باقی)

زِسکا

جناب سید نورُالحسن صاحب بی۔ اے

میری کوریلی کی دلچسپ ناول ZISKA کا ترجمہ ہے، جو باقساط شائع ہوگا۔

پہلا باب

قاہرہ بہار پر تھا۔ مختلف ممالک اور بہانت بہانت کے آدمی اپنے فرصت کے اوقات گزارنے اور تبدیل آب و ہوا کی خاطر قاہرہ میں موج در موج چلے آتے تھے۔ مختلف طبقے اور مختلف سماج کے لوگ اپنی طبقہ داری اور سماجی روایات دریائے نیل کے کنارے خشک اور ریتیلے میدانوں میں اس لئے چھوڑ جانا چاہتے تھے کہ ان کے بعد آنے والے قافلے پس ماندہ نشانوں پر چل کر قاہرہ کو جو کسی زمانے میں "القاہرہ" یعنی "فاتح" کے نام سے موسوم تھا۔ اس بری طرح سے مفتوح کریں اور غلام بنائیں جس کی مثال تاریخ کے گذشتہ خونخوار فاتحین بھی پیش نہ کر سکیں۔ فیشن کا گراں بار جوا القاہرہ کی گردن میں بری طرح ڈالا گیا تھا کہ غریب اور معمر "فاتح" دم توڑنے لگا تھا۔ قاہرہ کے بے بس باشندے اپنی آزادی کیلئے اب بھی جان پر کھیل جانے کے لئے مستعد تھے۔ وہ اپنی وطن کی حفاظت زندگی کے آخری لمحات تک کرنا چاہتے تھے۔ ان کی دلی تمنا تھی کہ ان کے ملک کو نئے فیشن کا آماجگاہ نہ بنایا جائے۔ لیکن "ٹامس کوک اینڈ سنس" کے حسین دلکش اور دل لبھانیوالی مسافر ٹولیوں اور اُن کی دلفریب مسکراہٹوں کے سامنے وہ سوائے ہتھیار ڈال دینے اور ہار مان لینے کے کر ہی کیا سکتے تھے۔ آج کل کا سیاح عجب میل کھایا ہوا اور شاخ لگا ہوا درخت ہے جس کے پھل کو نہ انسان کھا سکتا ہے نہ حیوان۔ ڈارون کا نظریہ ارتقاء ایسے ہی آدمی پر صادق آتا ہے۔ اس کی بے قراری، اس کی بن مانس جیسی تیزی اور چالاکی، اس کی بے شرما ناجبلت تجسس، اس کی بلا وجہ کی کھوج کی عادت، اس کی جزیات پر توجہ۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ بن مانس کی حد کہاں

ختم ہوتی ہے اور آدمی بننا کہاں سے شروع ہوتا
ہے۔ موجودہ انسان کے فانی اجزائے ترکیب
میں الوہیت کا شائبہ بھی پایا نہیں جاتا وہ مجسم
کثافت اور شیطانیت ہے۔

قاہرہ کے بازاروں میں سفید فلالین کی
پتلونوں میں ہاتھ ڈالے، منہ سے سگار کا گندہ
دھواں نکالتے، عرب عورتوں، بچوں، بوڑھے
جوانوں کا مذاق اڑاتے یہ بد مذاق سیاح اکڑتے
پھرتے ہیں۔ تاریخ ان کے لئے کچھ معنی نہیں رکھتی
یہ سفلے سیاح اہرام کو صرف ایک اچھی عمارت
تصور کرتے ہیں اور ابوالہول کو اپنی خالی سوڈا
واٹر کی بوتلوں کا نشانہ۔ اگر انہیں دکھ ہوتا
ہے تو صرف اتنا کہ مصر کے اہرام اور ابوالہول
کا پتھر اتنا سخت ہے کہ وہ اپنے مشہور و معروف
نام ان پر کندہ نہیں کر سکتے۔ اس میں کوئی شبہ
نہیں کہ ان تاریخی یادگاروں پر کچھ بھی لکھنا
جرم ہے لیکن اگر ان کے بس کا روگ ہوتا تو
بھلا یہ سیاح کچھ نہ کچھ لکھے بغیر چوکتے۔ ان کو اس
کا غم رہ جاتا ہے کہ آنے والی نسلوں کی راہ نمائی
کے لئے وہ اپنا نام لکھ کر نہ چھوڑ سکے۔

یہ سیاح موسم سرما میں سردی کی شدت
برداشت نہ کر سکنے کا بہانہ کر کے مصر میں دریائے
نیل کے کنارے رنگ رلیاں منانے ٹولیاں
بنا بنا کر آتے ہیں۔ گو ان کے اسلاف کو اپنے وطن
مالوف کی آب و ہوا موافق تھی اور وہ تندرست
زندگی بسر کر کے بڑی عمروں کو پہنچتے تھے لیکن
دولت کی زیادتی نے اب ان کو اس قدر عیش
پسند بنا دیا ہے کہ گرمیوں اور سردیوں میں
ان کو غیر ممالک میں جانے کی ضرورت پڑتی ہے،
یہ اپنے ساتھ اپنے ناپاک خیالات، پلید رسومات
اور گندے آداب مجلس بھی لیجاتے ہیں اور اس
طرح ان کے قدوم میمنت لزوم کی برکت سے
سماجی و بائی جراثیم ایک ملک سے دوسرے ملک
میں پھیلتے رہتے ہیں۔

بہار کے موسم میں مصر کی کھڑی فصل پر
ان سیاح ٹڈیوں کے دل بادل چھا جاتے ہیں،
بھولے بھالے عربوں کو یہ بھرا دیا جاتا ہے
کہ ان کو خوش آمدید کہنے کی عیوض ان کو
"بخشش" ملے گی۔ انہی ٹڈیوں میں ملا جلا
ایک خطرناک قسم کا مخصوص کیڑا ہوتا ہے۔
جس کو یورتروا کہتے ہیں۔ یہ نہایت مہلک
ہوتا ہے۔ اور اس کے کاٹے کا منتر نہیں ہوتا۔
یہ دیکھنے میں بہت خوبصورت ہوتا ہے۔
اس کے ڈنک میں مٹھاس ہوتی ہے۔ زہر میں
کیف و سرور کی تاثیر ہوتی ہے۔
یہ سیاح "بخشش" جی کھول کر دیتے ہیں،

عرب 'بخشش' حاصل کرنے کی خاطر ان سیاحوں
کی خوشنودی حاصل کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ ان کے
آرام پہنچانے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھتے۔
گو عربوں کو ان مغربی سیاحوں کے لباس عجوبہ نظر
آتے ہیں اور ان کی عادتوں سے تنفر ہوتا ہے
پھر بھی قدم قدم پر وہ 'بخشش' طلب کرتے ہیں۔
ایک حسین و جمیل عرب، اپنی غزالی سیاہ آنکھوں
سے ایک مغربی سیاح پر تاسف کی نظر ڈالتا
ہے۔ یہ منحنی سا انسان اُس کی نظر میں نہیں جچتا۔
وہ ننگے پیر ایک ہوا میں اڑتا ہوا سفید کپڑا
اپنے کمر کے چاروں طرف لپیٹے رہتا ہے اور ایک
خاص غرور اور تمکنت کے ساتھ ان سیاحوں
کی خدمت صرف 'بخشش' کی خاطر کرتا ہے۔

اس قدیم خداؤں کے ملک میں اس عجیب
وغریب ملک میں جو سرتا پا معمہ ہے۔ اس
خوفناک ملک میں جہاں ہیبت ناک راز اب
تک افشا نہ ہوئے۔ بقول انجیل کے ایسا ملک
جس پر پریوں کا سایہ ہے، وہ ملک جہاں صدیوں
کی نامعلوم تاریخیں دفن ہیں، فوق الفطرت
ذومعنی نہایت گہری روایتیں، عجیب غریب
رموز جن کا انکشاف نہ ہو سکا۔ اور جن کو
یہ گانے، ناچنے، کھانے اڑانے والے سیاح
کبھی نہ سمجھ سکے۔ یہ فیشن پرست دیوانے
سیاح جن کا مذہب ہی عیش پرستی ہے، کبھی فکر
فردا نہیں کرتے کیونکہ سوچنے کی قوت ہی ان
میں موجود نہیں۔ ان کا فقط کام یہ ہے کہ ایک
ہوٹل سے دوسرے ہوٹل میں چکر لگائیں اور
اپنے روزناچے لکھ کر دوسروں کے روزناچوں
سے مقابلہ کر کے معلوم کریں کہ کون سے ہوٹل میں
بہترین کھانا ملتا ہے۔ اس زمانہ کے سیاحوں میں
کھانا پہلی ضرورت ہے۔ مناظر قدرت اور صحبتیں
دوسرے درجہ کی اہمیت رکھتی ہیں۔ پُرانے
زمانہ میں معاملہ برعکس تھا۔ جس زمانہ میں ریل
گاڑیاں نہیں چلتی تھیں۔ جس زمانہ میں بائرن
نے اپنی لافانی تصنیف چائلڈ ہیرلڈ
لکھی تھی لوگ اپنی ذاتی آسائشوں کا اتنا خیال
نہیں کرتے تھے۔ بائرن جہاز کے تختہ پر لبادہ
میں لپٹا لپٹایا پڑا رہا اور اُس کو ناگوار نہیں
گزرا۔ اس کا غیر محدود دماغ اور اعلیٰ ترین
روح جسمانی تکالیف کی پروا کئے بغیر پرواز
کرتی تھی۔ وہ آج سے سبق حاصل کرتا اور کل کے
امکانات پر غور کرتا تھا۔ وہ ایک الہامی مفکر
اور بلند پایہ شاعر تھا، اُس کو روٹی کا ایک
ٹکڑا اور تھوڑی سی CHESE سوئٹزر
لینڈ کے نہ برباد ہو سکنے والی وادیوں اور پہاڑوں
میں سفر کرنے کے لئے کافی تھے آج ہم مرغن

اور پر تکلف غذاؤں پر بھی اکتفا نہیں کرتے
ہمیں سوائے چرنے، کھانے پینے، رہنے سہنے
میں مین میخ نکالتے، کاٹنے والے کیڑوں اور
بدبودار مکوڑوں کی موجودگی اور ہوٹل کے
مالک کے بل پر جھگڑنے کے اور کچھ نہیں آتا۔ یہ
ہمارے تہذیب کی معراج ہے۔ لطف یہ ہے
کہ ان حرکتوں پر ہم خدا کا شکر ادا کرتے ہیں کہ
ہم دوسروں کی طرح نہیں ہیں۔ ہم خوش ہیں کہ
ہم اہل عرب، اہل افریقہ اور اہل ہند کی طرح
نہیں ہیں۔ ہم ہاتھی جیسی پتلون میں ٹانگوں
کے کوٹ پر مفتخر ہیں کیونکہ یہی ہماری تہذیب
کی نشانیاں ہیں اور اپنے زعم باطل میں سمجھتے
ہیں کہ ہم ہی خدا کے محبوب اور منتخب بندے
ہیں۔ ہم میدان جنگ میں داد مردانگی دے کر
قوموں پر فتح حاصل نہیں کرتے بلکہ ہماری کھانے
کی میزیں حلیفوں کی آنکھوں کو خیرہ کر دیتی ہیں
ہم فوجیں بھرتی نہیں کرتے بلکہ ہوٹل بناتے
اور چلاتے ہیں اور مصر اور ہمبرگ میں اس لئے
رہ پڑتے ہیں کہ بہترین لباس زیب تن کریں،
بہترین غذائیں تناول فرمائیں اور حقارت
کی ناس لے کر سوائے اپنے تمام چیزوں پر
جھنکتے رہیں اور جن لوگوں میں ہم نے عارضی
قیام اختیار کیا ہے۔ انہی کے وطنی حقوق کو
غصب کر کے ان کو غیر ملکی اور اپنے کو ملکی تصور
کرنے لگیں۔ ہماری ایمان کی آنکھیں پھوٹ جاتی
ہیں۔ ہم جس جگہ پر ہوٹل بناتے ہیں اس مقام کو
اپنی ذاتی مِلک سمجھنے لگتے ہیں۔ اور جب ہمارے
ہم رنگ اور ہم قوم لوگوں کے قیام و طعام کا ان
ہوٹلوں میں زمانہ ہو اور کالے یا گندمی رنگ کے
لوگ وہاں ٹھیرنا چاہیں تو ہمیں ان کی جرات
پر تعجب ہوتا ہے اور بیحد غصہ آتا ہے اور وہ
بھی بیچارے اس ڈر سے کہ کہیں ہوٹل کے مالک
ذلیل کر کے ہوٹل سے نکال نہ دیں اپنے وطنی
ہوٹل میں ٹھیرنے کی بجائے چپکے سے راہ فرار
ڈھونڈ لیتے ہیں۔ یہی آئے دن مصر میں ہوتا ہے
ہمیں اکثر مصریوں کی گستاخیوں پر غصہ آتا ہے
مصریوں کو تو فخر کرنا چاہئیے کہ تہذیب کی یہ
نشانیاں، تمدن کے یہ نمونے، بیڈول کنواریاں،
بڑے بڑے دانتوں والی، بے تکے ہاتھ پیر
والی یورپین مائیں جو کبھی بوڑھی ہونا نہیں جانتیں،
جو بال جھڑنے پر مصنوعی بال لگاتی اور ہر
سال اپنے رخساروں کی جھریوں کو نکالنے اور
صاف کرنے کے لئے پیرس کے بہترین حسن کار کا
دامن روپیوں سے بھرتی ہیں۔ تھوڑی ہی مدت
کے لئے ہمیں آکر اپنے رنگ روپ کی جھلک
دکھا جاتی ہیں۔ یہ ریگستانی آدمی جس کو عرب

کہتے ہیں بہت اچھا ملازم یا خدمتگار ہے لیکن بحیثیت ایک دوست یا بھائی کے تُف ہے اس پر۔ مصر اُس کا وطن ہو تو ہو۔ اُس کو اپنے وطن سے اتنی ہی محبت ہو جتنی ہم کو انگلینڈ سے ہے لیکن پھر بھی ہمارے جذبات کا زیادہ لحاظ ہونا چاہیئے، بہ نسبت اُس کے کیونکہ چہ نسبت خاک را با عالم پاک ؎
کہاں ہم ہاتھی کے پیر والے لوگ کہاں وہ جھلسا جھلسایا ہوا ننگا پیر۔

سر جیٹوننڈ لیل اپنی خیالات کا آدمی تھا۔ یہ بیڈول اور بھدا موٹا آدمی جس کی کوئی کل سیدھی نہیں تھی۔ وہ زیریچ پیلیس ہوٹل کے بڑے ہال میں ایک آرام کرسی پر لیٹا ہوا دو یا تین شناساؤں کی صحبت میں جن سے اس نے قاہرہ کے قیام کے زمانہ میں دوستی پیدا کرلی تھی سگار پی رہا تھا۔ سر جیٹوننڈ کی یہ عادت تھی کہ جو اس کی بات سُنتا تھا اس کے فائدے کی باتیں بتایا کرتا تھا اور اُس کو رائے دینے کا حق بھی تھا کیونکہ لندن کے ایک اخبار کا وہ مدیر اور مالک تھا۔ اس کو سَر کا خطاب حال حال میں ملا تھا اور کسی کو یہ خبر نہیں تھی کہ اُس نے کس توڑ جوڑ سے اس خطاب کو مارا تھا۔ اُس کے ایک بیوی اور دو لڑکیاں تھیں۔ مصر میں موسم بہار گزارنے تشریف فرما ہونے کا منشاء یہ تھا کہ ان لڑکیوں کے لئے کوئی بَر ڈھونڈا جائے۔ اُس کو فکر اس لئے تھی کہ اب لڑکیوں کے گلنار رخساروں سے شباب کی سرخی مدھم پڑنے لگی تھی۔ نازک کلیوں کی تر و تازہ پنکھڑیاں کُمھلانے لگیں تھیں۔ سر موصوف نے مصر میں انگریزوں کی آزاد زندگی کے متعلق بہت کچھ سنا تھا۔ مرد اور عورت میں اختلاط کے بہت مواقع فراہم ہوتے ہیں۔ جوڑے جوڑے اہرام دیکھنے کے لئے ساتھ ساتھ جاتے ہیں۔ چاندنی راتوں میں لق و دق ریگستان میں گدھوں کی سواری ہوتی ہے۔ راتوں میں دریائے نیل کی کشتیوں میں سیر ہوتی ہے۔ مختصر یہ کہ لندن کی بہ نسبت مصر میں شادی ہو جانے کے زیادہ امکانات ہیں۔ اُس کو یہ دیکھ کر اطمینان بھی ہوتا تھا کہ اس کی دونوں لڑکیاں موریل اور پالی اپنے حتی الامکان کسی نہ کسی کو پھانسنے کی انتہائی کوشش کر رہی ہیں۔ اور اسی طرح ان کی ماں کی آنکھ بھی ایک شاہین کی طرح کسی قابل قبول نوجوان کو بچ کر نہیں نکلنے دیتی اور خصوصاً آج شام کو تو وہ بہت زوروں پر تھی کیونکہ ریویرح ہوٹل میں طرح طرح کے لباسوں میں ناچ ہونے والا تھا۔

(باقی)

بہ سرپرستی

محترمہ بیگم نواب مہدی یار جنگ بہادر صدرالمہام تعلیمات

شہاب

ناھید

ناہید

جلد ۸   بہمن ۱۳۵۴ ف م دسمبر ۱۹۴۴ء   نمبر ۳

۱۔عید۔ صغرا سبحان نے لکھا ہے۔ واقعی ہمارے آپ کے پاس عید کا نظریہ اپنی آپ مسرت ہے حالانکہ عید وہ ہوتی ہے جس میں غریب اور نادار کا لحاظ رکھا جائے۔

۲۔کیا ہوتا ہے آنسہ صغرا جنگ بہادر کا استفسار ہے آپ ہی بتائیے کہ ایسے شگون کی ابتدا کیونکر اور کب ہوئی ورنہ کسی فرصت میں ہم ہی سمجھائیں گے۔

۳۔شطرنج کا مہرہ بقیہ حصہ ہے معصومہ جنگ بہادر کا۔ دیکھا آپ نے کہ ایک ننھے مہرہ نے کتنوں کو پریشان کیا مگر یہ مسئلہ حل نہ ہوا کہ آخر مہرہ ڈوبا کیونکر؟

۴۔ نکہت مصطفیٰ نے اپنی سرکس دیکھنے کی سرگزشت لکھی ہے۔ آپ کی زندگی میں بھی ایسے واقعات پیش آئے ہوں گے۔ ۵۔ حقیقت۔ رضویہ محمودہ کی کاوشش ہے۔ ۶۔ زیبا نسرین اپنا پتہ بتائیں کہ پرچہ کس پتہ سے بھجوایا جائے۔ ۷۔ بڑی بی۔ رٹیا کی ہم جماعت ہیں۔ تعلیم کا یہ شوق قابل ستائش ہے۔

"ب"

"عید کی مسرتیں"

صغرا عبدالسبحان

عید کی گزری ہوئی مسرتیں ہمارے دلوں میں ابھی تک باقی ہیں۔ اس موقع کی چہل پہل، سیر و تفریح پیش نظر ہے۔ قدرت نے ہم کو اس قابل بنایا کہ ہم اس سے لطف اندوز ہوں ہم عید کی خوشیاں کس نظریے سے مناتے ہیں؟ اور اس کے متعلق ہمیں کیا معلومات حاصل ہیں؟ یہی نہیں کہ ہر سال رمضان کے بعد عید آتی ہے، روزے نہ بھی رکھیں تو عید منانا تو بہرحال کسی نہ کسی طرح واجب ہی ہے مسلمان جو ٹھہرے ہے نئے کپڑے، چوڑیوں کا جوڑا، نئی وضع کے سینڈل، کپڑوں سے میچ کرتے ہوئے بیگ کی خریداری سارے رمضان میں سے کیجاتی ہے۔ دور افتادہ دوستوں کے لیے بہترین عید کارڈ خریدے جاتے ہیں۔ پھر عید کے دن ان سب سے آراستہ اعلیٰ قسم کے عطر یا سینٹ سے معطر شام تک جب سویوں سے خوب ڈٹ جاتے ہیں تو دوستوں کے ساتھ عید کے خاص پروگراموں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے اس سے زیادہ ہم آپ کو عید کے متعلق کیا بتا سکتے ہیں بقرعید آ رہی ہے۔ بکروں کی قطاریں اور گوشت کے خوان نظروں کے سامنے ہیں۔ اس موقع پر نئے جوڑوں کی تیاریاں اور سینما کے نئے پروگرام پیش نظر ہیں۔ عید کس وجہ سے منائی جاتی ہے۔ فطرہ کسے کہتے ہیں؟ بقرعید میں قربانی دینے کا کیا مقصد ہے؟ آخر یہ سب ہم کو بتایا ہی کس نے؟ ہم نے تو ہوش سنبھالتے وقت سے ابتک یہی دیکھا کہ رمضان شروع ہوتے ہی عید کی تیاریاں شروع ہو جاتی ہیں جو عید کے دن تک ختم ہونے پر نہیں آتیں۔ بقرعید میں بکرے آتے ہیں۔ کباب بنتے ہیں، حصے آتے اور جاتے ہیں سب کھاتے پیتے ہیں۔ اسے ہم بچپن میں بکروں کی عید کہتے تھے اور بہت ممکن ہے کہ اب بھی بعض لوگ یہی سمجھتے ہوں۔ لیکن کیا نئے کپڑے، چوڑیوں کا جوڑا، ہاتھوں کی مہندی یا کیوٹکس سے چمکتے ہوئے ناخن ہیں۔ اور سینما کی دید ہی ہماری عید ہے، کیا ایسی عید ہم روز نہیں منا سکتے یا مناتے؟ پھر ہم کو کیا حق ہے کہ خاص عید کے دن کو ہی اپنی مسرتوں کا دن قرار دیں۔ ہم کو ان روزے داروں کا خیال کیوں نہیں آتا؟ جو ہماری ان بنائی ہوئی

مسرتوں سے محروم ہیں۔ آخر وہ بھی تو انسان ہیں۔
ان کے سینہ میں بھی ہمارے جیسا دل اور دل میں
شوق و ارمان ہے۔ اپنے بچوں کو مکلف لباس
سے آراستہ کرتے وقت انہیں قیمتی قیمتی کھلونے
دلاتے وقت ہمیں اپنے ان غریب عزیزوں کا خیال
کیوں نہیں بے چین کرتا جن کے بچے اس دن بھی
پھٹے کپڑوں اور جی بھر کر سیویاں کھانے سے محروم
ہیں۔ جن کے معصوم دل ہمارے بچوں کی ٹیپ
ٹاپ دیکھ کر تڑپ اوٹھتے ہیں۔ ہم اپنی مسرتوں
کے ہجوم میں یہ بھول جاتے ہیں کوئی ہمارے
جیسا خدا کا بندہ اس دن بھی پھٹے پرانے
کپڑوں میں ملبوس نئے کپڑوں کے لئے ترستا
ہوگا۔ کسی کے بچے ہمارے زرین لباس کو دیکھکر
آنکھیں پھاڑتے ہوں گے یا ان کے منہ سے ایک
ٹھنڈی آہ نکل جاتی ہوگی۔ دنیا کی چند روزہ دولت
اور مادیت نے ہمارا دل ایسا اٹا پڑا ہے کہ اس
میں سوائے اپنی تکمیل مسرت کے دوسرا خیال
لانے کی بھی گنجائش نہیں۔ اقبال پوچھتے ہیں۔

تیرے دریا میں طوفاں کیوں نہیں ہے
خودی تیری مسلماں کیوں نہیں ہے

کیوں نہیں بیشک ہمارے دلوں میں دریا
اور دریا میں طوفان ہے۔ لیکن ہماری خودی
واقعی مسلمان نہیں اور نہ اس میں وہ طوفان ہے
جس کی اقبال کو تلاش ہے۔ ہم کو صرف اپنی ذات
ہی ساری ہمدردیاں ہیں دوسروں کے رنج و
درد کی شرکت کی اس میں ذرہ برابر بھی جگہ نہیں

"نمود و راز"

مصنفہ محترمہ آنسہ محمودہ رضویہ۔ مدیرہ مجلہ
شعاع۔ حجم (۲۰۹) صفحے۔ قیمت عا
مقام اشاعت: دار الاشاعت انجمن ترقی
اردو کراچی۔

"نمود و راز" آنسہ محمودہ رضویہ صاحبہ کراچی کے
افسانوں کا مجموعہ ہے۔ اس سے پہلے بھی موصوفہ
نے کئی کتابیں لکھی ہیں۔ طرز بیان کو دلکش و
حسین بنانے کی کوشش کیگئی ہے لیکن فارسی
ترکیبوں کا بیجا استعمال ضرور کھٹکتا ہے۔
افسانوں میں حقیقت سے زیادہ تصور سے
کام لیا گیا ہے۔ ہم رضویہ صاحبہ سے آئندہ
اس سے بہتر کی امید رکھتے ہیں۔ کراچی جیسے
غیر اردو مقام سے نسوانی ادب کی یہ شعاعیں
موصوف کے افسانوں کو قابل ستائش
بنا دیتے ہیں۔

زینت ساجدہ

کیا ہوتا ہے؟

آنسہ صغرا جنگ بہادر

ساڑھے نو بج چکے تھے اور اسکول کا وقت قریب آ رہا تھا۔ میں کھڑی جلدی جلدی بالوں میں کنگھی کر رہی تھی۔ پیچھے سے آواز آئی "فریدہ ہمیشہ بیٹھ کر کنگھی کیا کرو۔ کھڑے ہو کر کنگھی نہیں کیا کرتے" میں نے پلٹ کر دیکھا پھپی اماں پاندان کھولے بیٹھی تھیں۔ میں نے ان کی باتوں پر کچھ دھیان نہ دیا۔ کیونکہ مجھے بہت جلدی تھی۔ فریدہ میں کہتی ہوں بیٹھ جاؤ" "کیوں پھپی اماں آخر کھڑے ہو کر کنگھی کرنے سے کیا ہوتا ہے؟" "اونھ اب کچھ بھی ہوتا ہے یہ مجھے نہیں معلوم۔ تم لوگ تو بس یونہی بے تکے سوال کر بیٹھتی ہو۔ کہدیا بیٹھ جاؤ خاموشی سے بیٹھ جاتیں اب کیا ہوتا ہے اور کیوں ہوتا ہے اس سے تمھیں کیا؟"

میں کچھ شرمندہ سی ہو گئی اور کتابیں اٹھا کر موٹر میں جا بیٹھی۔ موٹر اسٹارٹ ہی ہو رہی تھی کہ مجھے چھینک آ گئی۔ آپا نے کہا "تم ہمیشہ نکلتے وقت ہی چھینکتی ہو۔ کہدیا ہزار دفعہ کے کہیں سے نکلتے وقت چھینکنا بدشگونی ہے لیکن تم کہاں مانتی ہو" "کیا ہوتا ہے آپا چھینکنے سے؟" میں نے پوچھا" "جو کچھ بھی ہوتا ہے بھئی تمھیں اس سے کیا" عجیب مصیبت ہے جو کام ہے نہ کرو نہ کرو۔ اور وجہ پوچھی جائے کہ کیوں نہ کرو تو یہ کوئی بتاتا ہی نہیں۔ اور آپا کے دل میں تو بیکار شک آتے ہیں۔ خیر خدا خدا کرکے دس یا پانچ منٹ کے بعد موٹر اسٹارٹ ہوئی اور ہم اسکول پہنچے میں اس وقت زعفرانی دوپٹہ اوڑھے ہوئی تھی۔ اسکول کی آیا۔ خادمہ نے کہا "بی بی زعفرانی دوپٹہ اوڑھ کر اسکول کو آئیں؟ کوئی دوسرا رنگ نہیں ملا کیا آپ کو" "کیا ہوتا ہے جی زعفرانی کپڑے پہننے سے؟"

آپ کے تو باتاں نہیں بی بی۔ آپ کو کیکو کچھ بھی ہوتا۔ ہم نہیں بولے سو بات سننا" "جی بجا ارشاد۔ آئندہ حکم کی تعمیل ہوگی" میں غصہ میں بڑبڑاتی کلاس میں جا بیٹھی۔ دن بھر اچھی گذری۔ شام کو گھر واپس آئی۔ گھر پہنچتے ہی بچوں نے گھیر لیا اور لگے ضد کرنے کہ کہانی سنائیے۔

آپ کا بہت دنوں سے وعدہ" میں نے سمجھا بجھا کر ان لوگوں کو الگ کیا۔ اور تھوڑی دیر کے بعد

نماز وغیرہ سے فارغ ہو کر بچوں کو کہانیاں سنانے لگی۔ بہت ہی دلچسپ کہانی ہو رہی تھی کہ امی نے پکارا "فریدہ یہاں آؤ"۔ میں دوڑی دوڑی امی کے پاس پہنچی۔ امی نے پوچھا۔ "کیا کر رہی تھیں تم" "کہانیاں"۔ میں نے کہا۔

"بی بی تم سے پچاس دفعہ کہا کہ دن کے وقت کہانیاں نہیں کہا کرتے۔ لیکن تم کہاں ماننے والی ہو"۔ میں تھوڑی دیر تک مجسمہ سوال بنی رہی۔ پوچھنے ہی والی تھی کہ کیا ہوتا ہے لیکن اس خوف سے کہ کہیں ایک ڈانٹنی نہ پڑ جائے خاموشی سے اپنے کمرے میں چلی آئی۔ تھوڑی دیر کے بعد بچے پھر پہنچے۔ واجد نے کہا "باجی آپ کہانی کہتے کہتے کیوں چلی آئیں"؟ "نہیں بابو کچھ ہوتا ہے۔ دن کے وقت کہانی کہنے سے"۔ بیچارہ واجد میرے اس بے تکے جواب سے خاموش چلا گیا۔ میں نے سوچنا شروع کیا کہ کیا ہوتا ہے۔ کھڑے ہو کر کنگھی کرنے سے، کہیں نکلتے وقت چھینکنے سے۔ زعفرانی کپڑے پہننے سے۔ اور دن کے وقت کہانی کہنے سے۔ کچھ بھی تو نہیں۔ خیر ہوتا ہوگا۔ کچھ بھی۔ مجھے کیا۔

ایک دفعہ میں نہا چکنے کے بعد دھوپ میں کھڑی بال سکھا رہی تھی کہ ماما صاحبہ نے باورچی خانہ سے پکارا۔ میں پہنچی۔ " ادے بیبو اللہ کو دیکھے۔ بالاں چھوڑ لیکو آسمان کے نیچے کھڑے رہیں سو کائیکو کتے اتا سب اگر کی دھونی دیئے تو بالاں نین سکھتے کیا؟

"کیا ہوتا ہے۔ آسمان کے نیچے بال کھول کر کھڑے رہنے سے"؟ میں نے بھی اپنے مخصوص انداز میں پوچھا۔ "کیا ہوتا کی باوا۔ جو دل میں آیا سو کرو۔ منع کرے سو بات سنتے نین پھر پوچھتے کیا ہوتا"۔ میں ابھی ان کی باتوں سے لطف اندوز ہی ہو رہی تھی کہ پیچھے سے دوسری ماما صاحبہ نے کہا "بی بی ذرا ہٹئے میں یہ چاول بچھوڑ رہی ہوں"! کیوں؟ میں نے پوچھا۔ "اٹیو سوپ کی ہوا نا لگنا بولتے بول کے ذرا ہٹو بولی۔" "کیا ہوتا ہے سوپ کی ہوا لگنے سے؟ کچھ بھی نیں بی بی نیں لگنا بولے تو کائیکو بیٹھنا"۔

میں غصہ میں پیر پٹکتی اپنے کمرے میں چلی آئی۔ اب بھی میں سوچتی ہوں کہ اگر کھڑے ہو کر کنگھی کروں تو کیا ہوگا؟ نکلتے وقت چھینک دوں تو کیا ہوگا۔ زعفرانی ڈوپٹہ پہنوں تو۔ گیلے بالوں آسمان کے نیچے کھڑی رہوں تو؟ دن کے وقت کہانی کہوں تو؟ غرض کتنی باتیں ہیں جو سنتے ہیں نہ کرنی چاہئیں لیکن اگر ان کی وجہ پوچھی جائے تو کسی کو بھی نہیں معلوم اور اگر معلوم بھی ہے تو کوئی بتاتا نہیں۔ میرے گھر میں تو کوئی بتاتا نہیں آپ ہی بتا دیجئے کہ کیا ہوتا ہے؟

بڑی بی

مس ریٹا کرسٹ جی

جس طرح ہر گلی کوچہ میں چادخانوں اور اصلاح خانوں میں روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے اسی طرح تعلیم خانوں اور مطالعہ خانوں کی پیداوار ملک کیلئے فال نیک سہی لیکن بظاہر یہ اونچی دکانیں پھیکا پکوان ثابت نہ ہوں کیونکہ طالب العلم علم کو علم کیلئے تو حاصل نہیں کرتا بلکہ اپنے دوزخ کی آگ بجھانے کیلئے یہ تمام جدوجہد کی جا رہی ہے پھر ملازمت کیلئے سخت تصادم کا خطرہ ہے۔

کچھ دنوں سے میں ایک زنانہ تعلیم خانہ میں میٹرک کی تیاری کیلئے جا رہی ہوں۔ پہلی مرتبہ وہاں ایک "بڑی بی" کو دیکھ کر مسرت ہوئی کہ چلو تجربہ کار استانی سے سابقہ پڑیگا۔ معلومات میں اضافہ ہوگا، دوسرے دن یہ معلوم ہوا کہ میری طرح بڑی بی بھی میٹرک کی کامیابی کیلئے پاپڑ بیل رہی ہیں اور دو سال سے اسی دشت کی سیاحی میں قطع منازل کرنیکے بعد بھی منزل مقصود ابھی دور ہی معلوم ہوتی ہے۔ اللہ رکھے ان کے ایک برخوردار کالج میں اور ایک نور چشمی اسکول میں مصروف تعلیم ہیں۔ ان کے ذوق کو دیکھ کر وہ غلط روایت پر ایمان لانا پڑا کہ "سعدی" نے چالیس سال کے بعد تعلیم شروع کی تھی تو ایک بڑی بی اس سن و سال میں کیا علامہ دہر نہ بن سکیں گی؟ یہ جب آتی ہیں تو کلاس میں جان آ جاتی ہے اوگالدان، پاندان، بوقبند، طوق بند، میٹو کا چنگیر دیکھ کر یہی گمان ہوتا ہے کہ غالباً تبدیل مکان کر رہی ہیں اخلاق و عادات کی نہایت اچھی ہیں لڑکیوں سے اچھا برتاؤ کرتی ہیں میٹو، پان سے خوب تواضع کی جاتی ہے لیکن ان کا معاوضہ نہایت خاموش طریقہ پر امتحان کے وقت ہماری کاپیوں سے جوابات بلا تکلف نقل کر لیتی ہیں ایک روز بڑے ٹھسے سے جماعت میں آئیں ایک نے آوازہ کسا غالباً آج بڑے میاں کی سالگرہ ہے، مگر جب آپ سے کوئی استانی سوال کرے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ خدانخواستہ یہ بس چل بسیں، حواس باختہ ہونٹ خشک سکتے کی صورت تکنے لگتی ہیں گویا بڑی مصیبت آپڑی ہے۔ ایکمرتبہ پوچھا گیا کہ "ارمان" کے کیا معنی ہیں بے اختیار میری زبان سے آہستہ "خواہش" نکل گیا اور ان بیچاری کو "خاموش" سنائی دیا اور بلا تکلف ارمان کے معنی خاموش بتادئے پھر تو لڑکیوں کو مذاق سوجھا خوب قہقہے ہوئے باتھ روم میں بند کرنا یا انہیں ٹوٹی کرسی پر بٹھا دینا تو روزمرہ کا مشغلہ ہے باوجود اس ہنسی مذاق کے وہ روزانہ فرض سمجھ کر کلاس میں آتی ہیں یہ اور بات ہے کہ دوران تعلیم میں نیند کے غلبہ سے مجبور ہو جائیں یا کلاس سے باہر جا کر سو رہیں لیکن ان کا یہ تعلیمی شوق ہمارے لئے سبق آموز ضرور ہے۔ لڑکیاں دعا کرتی ہیں کہ یہ یوں ہی اوقات گذار دیں ورنہ آنیوالی لڑکیوں کے لئے دلچسپی کا کوئی مشغلہ نہ رہے گا۔

"شطرنج کا مہرہ"

آنسہ معصومہ جنگ بہادر

(بہ سلسلہ سابقہ)

اب میں نے سوچا واقعی لکڑی کا مہرہ پانی میں کیسے ڈوبیگا تو مجھ کو خود خفت ہونے لگی ان لوگوں کو تو ایک بات مل گئی۔ یوں ہی کیا کم مجھ کو بیوقوف بنایا کرتے ہیں۔ اب تو اور بنائینگے۔ میں نے خدا سے دعا مانگی کہ یا اللہ مہرہ پانی کی تہہ میں سے نکلے اتنے میں رئیس بھائی کی آواز آئی کہ بھئی میں تو حوض میں اترتا ہوں شاید معصومہ کی بات صحیح ہو، میں نے جو حوض کا ذکر سنا تو باہر نکل آئی۔ سوچی کہ قائل ہی کر دوں ظفر بھائی وغیرہ کو، اگر نکل آئے مہرہ پانی کی تہہ میں سے تو پھر دیکھنا ــــــــ

رئیس بھائی سے میں نے کہا کہ ہاں آپ حوض میں اُتریئے وہ ضرور حوض ہی میں ہے مگر جب تک بھائی حوض میں اتریں کیا کیا قصہ ہوئے یہ بھی سُن لیجئے۔ کبھی باجی اشتیاق کے حلق میں انگلیاں ڈال ڈال کر دیکھتیں کہ کہیں یہ تو نہیں نگل گیا۔ ان بیچاری کا مذاق الگ اڑایا گیا۔ مہریوں میں بانس ڈال کر ڈھونڈا گیا۔ بچوں کو چاکلیٹ کا لالچ دے کر ان سے پوچھا گیا۔ غرض آپ سے کیا کہوں ایک مہرہ کیا کھویا تھا گویا قیامت آگئی ہے۔ سب لوگ کونہ کونہ پھر کر دیکھ رہے ہیں۔ آخرکار رئیس بھائی حوض میں اترے۔ مہرہ دھونڈنے کا تو بہانہ تھا ورنہ یہ لوگ تو حوض میں اترنے کے لئے ہر وقت تیار رہتے تھے۔ ذرا کوئی چیز گری اور کود پڑے حوض میں۔ کوئی ایک بھی نہیں ظفر بھائی سے لے کر واجد بابو تک۔ اصل میں تو یہ کھیل لگاڑو ظفر بھائی ہی تھے۔ خیر چھوڑیئے اس قصہ کو سُنئے مہرہ کا۔ بھائی نے ایک ڈبکی لگائی لیکن اتنی دیر میں ہر ایک اپنی باتیں بنانے سے باز نہ آئے ظفر بھائی نے کہا ایک بہن بہت عقلمند ہیں۔ اور یہ دوسرے بھائی صاحب ان سے زیادہ عقلمند۔ پھر میرا کان پکڑ کر کہا، اری دیوانی کہیں لکڑی ڈوبی ہے جب بھائی نے دیر لگائی تو میرا دل بھی دھڑکنے لگا کہ اگر خدا نہ کرے مہرہ نہ نکلا تو یہ ظفر بھائی تو میری جان کھا جائیں گے خود ہی نہیں ستائیں گے بلکہ سارے خاندان میں اس قصہ کو نشر کرتے

پھر رہیں گے اور میری ہی موجودگی میں بار بار اس ذکر کو دہرا کر مجھ کو بیوقوف بنایا کریں گے۔ میں دل ہی دل میں خدا سے دعا مانگی کہ یا اللہ تو ہی میری لاج رکھ لے۔ اتنے میں بھائی پانی میں سے سر نکالا کہنے لگے کہ نہیں ہے اف خدایا میری کیا کیفیت تھی اس کا اندازہ آپ نہیں لگا سکتیں۔ ظفر بھائی مجھ کو ستانے کے لئے اپنا دہن مبارک کھول ہی رہے تھے کہ بھائی نے کہا کہ لیجئے مہرہ اور ہاتھ بڑھا کر ظفر بھائی کو دیدیا۔ میں کتنی خوش تھی آپ سے کیا کہوں۔ اچک کر ظفر بھائی کے پاس پہنچی۔ اب بتایئے آپ بیوقوف یا میں؟ مگر وہ کیا ماننے والے تھے کہنے لگے اس میں عقل کی کونسی بات ہے۔ لیکن میری تو بن آئی تھی جب تک وہ یہاں رہے خوب ستاتی رہی اور اب جب بھی ملتی ہوں اس کا ذکر کرکے ظفر بھائی کو خوب بناتی ہوں۔ بھئی کچھ بھی ہو یاد رہے گا یہ مہرہ ہمیشہ۔ یہ سب کچھ تو ہوا لیکن آج تک میری خود سمجھ میں نہ آیا کہ واقعی لکڑی کا مہرہ پانی میں ڈوبا کیسے؟

---

۴۴ جو شخص خوشی میں تیرے وہ اوصاف بیان کرے وہ تجھ میں نہیں وہ ناراضی میں وہ عیوب بیان کرے گا جو تجھ میں نہیں۔

اقوال حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ

دین و دنیا کی بھلائی کی پانچ باتیں ہیں، دل کا غنی ہونا، ایذا رسانی سے بچنا، حلال کی کمائی، پرہیزگاری، ہر حال میں اللہ پر بھروسہ رکھنا۔

بہت سفارش کرنا لحاظ کو کھوتا ہے۔ عالموں کی زینت پرہیزگاری ہے اور ان کا زیور حسن اخلاق اور ان کی خوبصورتی نیکدلی۔ جس کو علم کی محبت نہیں اس میں کوئی بھلائی نہیں ایسے آدمی سے دوستی کیا شناسائی بھی نہیں چاہیئے۔ جو شخص تیری ایسی مہربانی کا شکرگزار ہو جو تو نے نہیں کی ہے تو تو ڈر کہ وہ کہیں تیری ایسی مہربانی کا انکار نہ کرے جو تو نے اس پر کی ہے۔ دوست کی پہچان یہ ہے کہ دوست کے دوست کا دوست ہو۔ سب کو تو ہرگز خوش نہیں رکھ سکیگا۔ پس تو خدا کے ساتھ اپنا معاملہ صاف رکھ اور لوگوں کی کچھ پروا نہ کر۔ جس کو غصہ دلایا جائے اور اسے غصہ نہ آئے وہ گدھا ہے اور جو راضی کرنے سے راضی نہ ہو وہ شیطان ہے۔ حسن تدبیر وسیلے سے زیادہ نافع ہے۔ جس کے گھر میں آٹا نہیں اس سے مشورہ کیا لینا۔ جس کی غلطی پر ہنسی کیجائے اس کے دل میں ضرور اصلاح پیدا ہوتی ہے۔ جو تجھ سے چغلی کھاتا ہے وہ تیری بھی چغلی کھاسکیگا۔ جو اوروں کی باتیں تجھ کو سناتا ہے وہ تیری بھی اوروں کو سنائیگا

۴۴

میں نے پہلی بار سرکس کیسے دیکھا!

نکہت مصطفیٰ (حیدر آباد)

دن کیسے تیزی سے بھاگتے جاتے ہیں۔ ابھی کل پرسوں کی بات ہے کہ میں بھائیوں کے ساتھ ہر کھیل تماشے میں جایا کرتی۔ آج پردہ اٹھاکر جھانکتے بھی شرم آتی ہے۔ نامحسوس طور پر ہم بہت ساری باتیں خود ہی سیکھتے جاتے ہیں۔ لیکن یہ گزرے ہوئے دن ہمیشہ اپنی حماقتوں کے ساتھ ہمیں یاد رہتے ہیں۔ وہ حماقتیں ہم کو ہمیشہ پیاری ہوتی ہیں۔ بچپن کی ایسی کئی باتوں کو میں یاد کرتی ہوں۔ اور یہ یاد مجھے ایک دفعہ اور بچہ بنا دیتی ہے۔

میری عمر کوئی آٹھ نو سال کی ہوگی۔ گرمیوں کے دن تھے۔ اور چاندنی راتیں۔ پتلی باؤلی کے قریب جو میدان ہے وہاں سرکس آئی ہوئی تھی۔ میں نے سبھوں سے سنا تھا کہ سرکس میں بڑا لطف آتا ہے۔ عجیب وغریب کرتب۔ انوکھے اداکار ہوتے ہیں۔ جب رہبر دکن میں اشتہار نکلا تو میرا دل بیساختہ چاہنے لگا کہ میں یہ سرکس دیکھنے جاؤں اور ضرور ہی جاؤں۔

ایک مشکل تھی کہ اماں سے اجازت کیسے حاصل کروں وہ دو تین دن سے سارے گھر پر خفا تھیں۔ اور جب اماں خفا ہوتی ہیں تو سارے گھر کی دلچسپیاں غائب ہو جاتی ہیں۔ ہر کمرہ سنسان ہر دالان خاموش ہو جاتا ہے۔ نہ بھائی جان کے دوست آتے ہیں۔ نہ بڑی آپا فلمی گیت گنگناتی ہیں۔ اور تو اور ابا جان بھی میٹھے کی روز روز فرمائش نہیں کرتے بہت کچھ سوچا میں نے لیکن سمجھ میں نہ آیا۔ اماں کچھ ایسے خفا تھیں کہ کوئی چال نہ چلی جا سکی۔ مگر ہمیشہ میری بھی ایک عادت بڑی بری ہے۔ جب کوئی بات دل میں آجاتی ہے تو میں ضرور پورا کرتی ہوں۔ پورا کئے بنا مجھے کسی طرح چین نہیں آتا۔ اماں کو منانا بیکار تھا۔ سوچا دادا حضرت سے ذکر کروں۔ اگر وہ اجازت دیں تو پھر اماں بھی چپ ہو جائیں گی۔ ترکیب خوب تھی۔ ہم سب بھائی بہنوں نے مشورہ کیا۔ آپا نے دادا حضرت سے کہا۔ اور اجازت فوراً ہی مل گئی۔ دادا حضرت نے یہ بھی کہا کہ سرکس بچوں کو

ضرور دیکھنا چاہئے۔ کبھی کبھار تو اس کے دیکھنے کا
اتفاق ہوتا ہے۔ بس پھر کیا تھا۔ ہم سب بچوں نے
چلنے کی تیاری کی۔ ساتھ چلنے کے لئے چچا راضی
ہوگئے۔ ہمارے پڑوسی بھی آج ہی سرکس دیکھنے جا رہے
تھے۔ معظم جاہی مارکٹ سے پتلی باؤلی کچھ دور نہیں۔
راستہ ہم کو بخوبی معلوم تھا۔ کیونکہ اسکول
روزآنہ اسی راستہ سے جاتے تھے۔ ہم سب خوشی
خوشی پیدل باتیں کرتے ایک دوسرے کو راستہ
دکھاتے چلتے گئے۔ سرکس کے ڈیرے قناتیں
دور سے نظر آرہی تھیں۔ اس زمانہ میں بہت چرچا
تھا کہ بچوں کو پکڑ کر لیجانے والے عام ہوگئے ہیں
سرکس۔ سینما گھروں اور تماشوں سے بچوں کو غائب
کر دیتے ہیں ہمیں بھی سب نے ڈرا دیا تھا۔ اب
جو سرکس کی بھیڑ بھاڑ دیکھی تو فوراً خیال آیا۔
پھر دل ذرا کڑا کیا کہ بھئی چچا تو ساتھ ہیں۔ ڈر
کا ہے کا تمام نشستیں آباد تھیں۔ تھوڑی سی جگہ
میں چچا اور بھائی بمشکل سما سکے۔ اور ویسے بھی
مردوں میں گھس کر بیٹھتے شرم آتی۔ اس لئے میں
چچا سے کہہ زنانہ میں جا بیٹھی۔ چلمن سے سرکس کے
کرتب بخوبی نظر آتے تھے۔ چچا نے کہا کہ جوں ہی
کھیل ختم ہو میں تمھیں آکر لیجاؤں گا۔
میں نے اس سے قبل سرکس کبھی دیکھی نہ تھی
اب جو کمالات دیکھے جی خوش ہوگیا۔ ہاتھی شیر،
گھوڑے، بکریاں سب ایک ہی حلقہ میں گھومتے،
ایک دوسرے کے ساتھ کمال دکھاتے مگر بالکل
چھیڑتے نہ تھے۔ بعض اوقات تو آدمی اپنا سر شیر کے
منہ میں لیجاتا۔ میرا دل دھڑکنے لگتا۔ سانس رک
جاتی۔ میں سوچتی اگر وہ چبا ڈالے تو۔ شیر آخر شیر ہے
کیسے بھی سدھا ہوا کیوں نہ ہو۔ لیکن نہیں۔ میرے
دیکھتے دیکھتے آدمی صحیح سلامت اپنا سر نکال لیتا۔
سب تالیاں بجانے لگتے۔ کھیل ختم ہونے کے لئے
کچھ ہی دیر باقی ہوگی کہ میں نے اپنے گھر والوں کو
ڈھونڈنا شروع کیا۔ چلمن کی تیلیوں ہی میں سے
میں نے ادھر ادھر نگاہ دوڑائی۔ لیکن مجھے کوئی
بھی نظر نہ آیا۔ نہ چچا نہ بھائی۔ اب میں تماشے کو
نہیں تماشائیوں کو دیکھ رہی تھی۔ دل خوف سے
ڈوبا جا رہا تھا۔ ہاتھ پاؤں سرد ہونے لگے، اور
پھر سے مجھے خیال آیا کہ اگر مجھے یہاں سے کوئی پکڑ کر
لیجائے تو! جب کوشش کے باوجود مجھے کوئی نہ
ملا، تو میری پریشانی اور بڑھ گئی۔ آنسو میری پلکوں
پر آگئے۔ تماشا ختم ہوگیا ـــــ شور غوغا بلند ہوا
سب اٹھ اٹھ کر ادھر ادھر جانے لگے۔ اور
تھوڑی دیر میں ساری عورتیں باہر چلی گئیں۔
اب تو مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں چلمن سے باہر نکل آئی۔
اور ہمت کرکے ڈھونڈنا شروع کیا۔ گھر والے تو
نہ ملے البتہ ہمارے پڑوسی نظر آگئے۔ ڈوبتے کو

تنکے کا سہارا۔ میں دوڑ کے ان کے پاس پہنچی۔ اُن کے
بچے وغیرہ سب نوکر کے ساتھ جا چکے تھے۔ میں نے
گھبراہٹ میں اپنا سب حال کہا۔ ہنس کے انھوں
نے مجھے دلاسا دیا۔ اور میں ان کے ساتھ ڈیروں
کے باہر نکل آئی۔ باہر انھوں نے اپنی سیکل حفاظت
کرنیوالوں سے لی۔ خود بیٹھے۔ سامنے مجھے بٹھالیا۔
ٹن ٹن گھنٹی بجائی۔ اور ہم سڑک پر تیزی سے دوڑنے
لگے۔ مجھے بالکل اطمینان ہوگیا۔ کہ اب مجھے کوئی چور
ڈاکو پکڑ نہیں سکتا۔ میں مزے سے گھر پہنچ جاؤنگی۔
مجھے بالکل یاد نہ آیا کہ میرے گھر والے خصوصاً چچا
کتنے پریشان ہوں گے۔ اس وقت تو مجھے اپنا ہی
ہی خیال تھا۔

میں تھوڑی دیر میں گھر پہنچ گئی۔ سوچا کہ
سب بچے اور چچا پہلے سے موجود ہوں گے لیکن
وہاں سناٹا تھا۔ دادا حضرت عشا کی نماز پڑھ
رہے تھے۔ اماں صحن میں تخت پر لیٹی ہوئی تھیں۔
اگرچہ میں کھانا کھاکے گئی تھی۔ مگر اب پھر مجھے بھوک
سی محسوس ہوئی۔ بڑی آپا کھانا کھا رہی تھیں۔
میں بھی شامل ہوگئی۔ انھوں نے پوچھا تم اکیلی
آگئیں۔ میں نے جواب دیا پڑوسی کے ساتھ۔
اور مزے سے جاکر میں سوگئی۔ تھکی ہوئی تو تھی۔
نیند نے فوراً غلبہ کیا۔
جانے کب تک سوتی رہی آنکھ کھولی تو

باتوں کی آواز نے مجھے جگا دیا۔ آنکھیں کھولیں تو
دیکھا گھر میں خاصا رت جگا ہو رہا ہے۔ اماں کی
خفگی کا کچھ پتہ نہ تھا۔ سارے گھر میں روشنی
ہو رہی تھی۔ صحن میں جمگھٹا لگا تھا۔ سب ہنس رہے
تھے۔ میں نے آنکھیں ملیں کہ شاید سوتے میں
خواب دیکھ رہی ہوں۔ لیکن نہیں خواب نہ تھا۔
چچا سرگذشت سنا رہے تھے۔ میں اٹھ بیٹھی۔ رات کے
دو بجے تھے۔ چچا ابھی ابھی سرکس سے واپس
آرہے تھے۔ حسب وعدہ انھوں نے زنانہ میں
میری تلاش کی۔ سارے ڈیروں اور قناتوں کو دیکھا۔
ہر کونے کھدرے میں مجھے ڈھونڈا۔ میری عمر کی جو کوئی
لڑکی بھی دکھائی دیتی اُسے پکارا۔ لیکن وہاں
میں نہ تھی۔ چچا گھبرا گئے۔ اچھی خاصی اتنی بڑی
بچی کھوگئی۔ ضرور ڈاکو پکڑ لے گئے۔ تمام اطراف
کی گلیاں دیکھیں۔ سڑک ڈھونڈھ آئے۔ تھانے
میں اطلاع کرائی۔ میرا حلیہ پولیس نے نوٹ
کرلیا۔ آہستہ آہستہ فکرمند، تھکے ہارے چچا گھر
پہنچے۔ اس امید پر کہ مجھے راستہ معلوم تھا شاید
اکیلی گھر چلی آئی ہوں۔ لیکن میرے ملنے کی انہیں
امید کم تھی۔ اپنے آپ خفا تھے کہ خواہ مخواہ زنانہ
میں اکیلی بچی کو بٹھا دیا۔ شرمندہ تھے کہ اماں کو
کیا منہ دکھائیں گے۔ گھر آنے اور سارا قصہ ماں
سنتے تھے کہ میں سوتی ہوئی تھی۔

اماں کو بڑی ہنسی آئی۔ بڑی آپا نے بتایا کہ
میں کون وقت سے آکر سوگئی ہوں۔ پڑوسی کی
سائیکل پر سوار آئی۔ کھانا بھی ڈٹ کے کھایا۔
اور نہ ہی مزے سے لے رہی ہوں۔ چچا مجھے
دیکھکر بڑے خوش ہوئے۔ مجھے پیار کیا۔ اور کہنے
لگے "واہ بیٹی خوب پریشان کیا" واقعی میں تو
چپکے سے گھر آگئی۔ اور ان کو راستے ناپنے پڑے۔
بڑی خوشی ہوئی سب کو۔ اماں کی خفگی غائب
ہوگئی۔ سبھوں کو اپنی زندگی کے ایسے ہی یادگار
دن یاد آتے ہوں گے۔ اِدھر اُدھر کا ذکر ہوتا رہا
اور بڑی رات گئے بعد ہم سوئے۔ صبح مٹھائی پر
فاتحہ دیگئی۔ مفت کی مٹھائی کھانے کو ملی۔ ایک
عرصہ تک سب یاد کرکے ہنستے رہے۔ اور اب بھی
جب میں سرکس کا نام سُنتی ہوں تو یہ ساری
باتیں یاد آتی ہیں۔

"حقیقت"

آنسہ محمودہ رضویہ (کراچی)

برف آلود پہاڑ اک شان وقار کے ساتھ
کھڑے ہیں۔ زرد زرد کرنیں درختوں کی چوٹیوں پر
سنہری رنگ پھیرتی ہیں اور سطح آب پر چاندنی کا عکس
دریا کی لہروں سے کھیلتا ہے۔ سفید ہنسی مل کر جلترنگ
چھیڑے رہتے ہیں۔ شاہین جستجوئے شکار میں پرواز
کرتے ہیں۔ اور نسیم کے جھونکوں سے اشجار کی نرم شاخیں
جھومتی ہیں۔ کائنات مسرور نظر آتی ہے۔ نچنت۔ اور
کسی قسم کے فکر سے آزاد۔ پھر کہکشاں کی انجمن ہے۔
سیاروں کی محفلیں اور ستاروں کے جلسے۔ کرمک شب
کی ضوفشانی ہے روپہلی موجوں کی درخشانی اور ہلکا
ہلکا رنگ خواب۔

ہوا کی مدھ بھری سریلی رانی۔ سامان محشر سے
کم نہیں جو پھولوں کے گن گاتی ہے۔ گل وبلبل کے افسانے
سناتی ہے۔ قلوب کو مسرور کرتی ہے اور روحوں کو شاداب
پھر پہاڑوں کی آغوش میں بہتے ہوئے نالے ہیں
شادان اور مسرور آبشار اور ان کو کنار میں لینے
والے دلفریب کہسار۔

اور یہ ماہ شب تار کا جوئبار نور۔ چمکیلے کناروں
والے سمندر۔ پُرکیف ہوائیں اور خوشگوار فضائیں۔
پر آہ! یہ رعنائیاں کیا! کائنات کی افسوں
کاریاں کہاں۔ اور کجا اک ہستی دلفگار۔ کیا دہر
کی دل فریبیوں کی اتنی بساط ہے کہ وہ دکھوں
کی آندھیوں کو دور بھگا دیں۔ مصائب کے طوفانوں
کا خاتمہ کردیں۔ اور رنج وغم کی بجلیوں کو خاکستر۔
اگر نہیں تو یہ حقیقت ہے۔ کھلی حقیقت۔ کہ افسردہ
دلوں کے لئے ماحول کی طربناکی بھی ایسی ہی بے
معنی ہے جیسی کہ فضا کی خزاں آفرینی۔

پریوں کا محل

زیبا نسرین

مہابلیشور میں دن کیسے مزے سے کٹتے۔
ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں۔ بیتاب لہلہاتا ہوا
سرسبز شاداب سبزہ۔ دن سیر کرتے اور رات
آپا کی میٹھی لوریاں سنتے کٹتے۔

حسب معمول ہم لوگ اپنے اپنے بستروں پر
لیٹے ہوئے تھے چودھویں کا چاند اپنی روپہلی
کرنوں کا غازہ زمین پر مل رہا تھا۔ ہوا تھکے
ہوئے مسافروں کو لوریاں دے رہی تھی۔ بھائی
جان ستار بجا رہے تھے۔ آپا گنگنا رہی تھیں۔

رُت ہے سہانی مست ہوائیں

نہ جانے کیا بات ہوئی بھائی نے یکایک پوچھا
"سچ پریوں کا محل دیکھا ہے تم نے" ہم سب نے
انکار میں سر ہلا دیا آپا نے بھائی جان کو چڑاتے ہوئے
کہا" اور جیسے آپ نے تو دیکھا ہی ہے" بھائی
جان نے ستار بازو رکھتے ہوئے کہا" دیکھا تو نہیں
لیکن قصہ سنا ہے وہاں کی ہر رات سو سال کے
برابر ہوتی ہے" ہم نے پوچھا وہ کیسے" بھائی
بولے قصہ سنو خود ہی معلوم ہو جائیگا۔"

بہت دنوں کا ذکر ہے کہ پہاڑ کے دامن میں
ایک چھوٹا سا خوبصورت گاؤں لگا تھا۔ اس گاؤں
میں ایک چرواہا رہتا تھا۔ اس کے دو بیٹے تھے
ایک کا نام اکبر اور دوسرے کا ہمایوں۔ ایک دن
ان کی بکری غائب ہوگئی۔ دونوں بھائی اس کو
ڈھونڈنے نکلے۔ ڈھونڈتے ڈھونڈتے رات ہوگئی
لیکن بکری نہ ملی۔ ایسی ہی سہانی رات تھی۔ دونوں
بھائی تھک کر نہر کے کنارے بیٹھ گئے یکایک
انہیں گھوڑوں کے ٹاپوں کی آواز سنائی دی۔
کیا دیکھتے ہیں چھوٹے چھوٹے سفید گھوڑے
ہیں ان پر سبز کپڑے پہنے پریاں آپس میں ہنستی
بولتی چلی جا رہی ہیں۔ دونوں بھائی ان کے
ساتھ ہوگئے۔ گھوڑے ایک غار کے پاس جا کر
رُک گئے ایک پتھر خود بخود ہٹ گیا اور سب
اندر داخل ہوگئیں، اکبر ان کے ساتھ ہی داخل
ہوگیا۔ اور ہمایوں باہر ہی رہ گیا۔

پریوں نے جو اکبر کو دیکھا تو سب اس کے
قریب آگئیں اور اس سے کہا کہ واپس چلے جاؤ
ورنہ پچھتاؤ گے اکبر نے جواب دیا میں صرف
ایک رات تمہارے ساتھ رہوں گا۔ اور آج

تمہارا ناچ دیکھوں گا"۔ پریوں نے بہت سمجھایا
لیکن وہ نہ مانا اور رات بھر ان کے ساتھ ناچا
گایا۔ آخر کار صبح کے آثار نمودار ہونے لگے۔
اکبر کو غشی سی آنے لگی اور اس کی آنکھیں بند
ہوگئیں۔ جب اس کی آنکھیں کھلیں تو وہ زمین
پر پڑا تھا اور وہاں نہ پریاں تھیں نہ محل۔
وہ اٹھا اس نے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا تو اس
کی تعجب کی انتہا نہ رہی اس کے چہرے پر ایک
گز لمبی داڑھی تھی اور کمر جھک گئی تھی۔ وہ اپنے
گھر کی طرف چلا لیکن وہاں نہ وہ گھر تھا نہ لوگ۔
ہر راہ گیر سے وہ اپنے باپ اور بھائی کا حال
پوچھتا لیکن کوئی نہ بتاتا کہ وہ کیا ہوئے۔
اتفاقاً اسے ایک حسین نوجوان ملا، اکبر اسے
حیران دیکھتا رہا۔ کتنا مشابہ تھا وہ ہمایوں
سے۔ بار بار یہی اکبر کو خیال آتا کہ یہ ہمایوں میرا
بھائی تو نہیں۔" اس نے پوچھا، مگر نوجوان
نے جواب دیا کہ یہ تو میرے دادا کا نام ہے۔
کیا آپ کا نام اکبر ہے؟"

"ہاں میرا ہی نام اکبر ہے" میرے دادا
کہا کرتے تھے کہ ان کے ایک بھائی تھے جنھیں
پریاں اٹھا لے گئی تھیں" اکبر نے پوچھا "تمہارے
دادا کہاں ہیں" نوجوان مغموم ہوگیا اس نے
کہا، انہیں مرے ہوئے زمانہ گذر گیا۔ غریب
اکبر کو اب پتہ چلا کہ ایک رات سو سال کی تھی۔
وہ مغموم پہاڑوں کی طرف چل دیا اور پھر کسی نے
اسے آج تک نہیں دیکھا۔" بھائی جان
نے کہانی ختم کرکے ٹھنڈی سانس لی اور آپا سے
کہا لوری سناؤ۔ آپا چپ چاپ نہ جانے
کیا سوچ رہی تھیں۔ ہم سب نے کہا" بھائی
جان ستار سنائیے ہم سو جائیں گے۔" انہوں
نے ستار اٹھایا اور ان کی انگلیاں اس کے تاروں
سے کھیلنے لگیں۔ ہماری آنکھیں بند ہو رہی تھیں
اور ستار کے سریلے نغمے مدھم ہو رہے تھے
اور پھر ———

ہماری آنکھ جب کھلی تو سورج کی کرنیں
تالاب کے پانی کو گدگدیاں کر رہی تھیں چڑیوں
کے سریلے نغمے سنائی دے رہے تھے اور کہیں
دور کوئل کوک رہی تھی ———

بحر رفتار میں جب کرتا ہوں تدبیر نئی
ڈال دیتا ہے فلک پاؤں میں زنجیر نئی
پالسی تیرے لئے۔ میرے لئے صبر و رضا
میری اکسیر پرانی تری اکسیر نئی
کھوئے دیتے ہو جو تم مذہب و ملت اے یار
کیا سمجھتے ہو کہ مل جائیگی تقدیر نئی

حضرت اکبر

رجسٹر نمبر آصفیہ ۱۲۲
۴۸
3238
REGD.M.N.O.

نئی کتابیں

۱۔ فتراک۔ ۲۔ چیخ

افسانے اور مضامین

مصنفۂ جہاں بانو ایم۔ اے

قیمت اور مقام اشاعت کا انتظار کیجئے

محمودیہ پریس چار مینار میں چھپ کر دفتر شہاب دبیرپورہ حیدر آباد سے شائع ہوا۔